

فَعَلَيْكُمْ بُسْتَنَتِي وَسُنَّةُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ

ماہنامہ  
جہانِ مسلم

# السنة

شمارہ نمبر  
55 تا 60

جمادی الثانیہ 1433 تا ذی قعدہ 1434ھ  
الموافق مئی 2013 تا اکتوبر 2013ء

مدیر

غلام مصطفیٰ طہیر



- مولود کعبہ
- باغِ فدک
- ہم اہلحدیث کیوں؟
- قارئین کے سوالات
- تقلید کی شرعی حیثیت ①
- نکاح متعہ تا قیامت حرام ہے
- مجاہد بن سعید اور محدثین
- اولیاء اللہ کے نام کی نذر و نیاز
- قدم بوسی کی شرعی حیثیت!
- نبی اکرم ﷺ کا طریقہ تیمم
- صفات باری تعالیٰ کی معرفت
- سیدہ ام کلثوم بنت علی کا نکاح



رابطہ مخصوص و تحقیق، جہانم، پاکستان



AhleSunnatpk.com

شمارہ نمبر 55 تا 60

جمادی ثانیہ 1433 تا ذی قعدہ 1434ھ، الموافق مئی 2013 تا اکتوبر 2013ء

- 1- ہم اہلحدیث کیوں؟ حافظ ابوبیخی نورپوری 02
- 2- اولیاء اللہ کے نام کی نذر و نیاز غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری 45
- 3- صفات باری تعالیٰ کی معرفت حافظ ابوبیخی نورپوری 65
- 4- نبی اکرم ﷺ کا طریقہ تیمم ابن الحسن محمدی 90
- 5- تقلید کی شرعی حیثیت ② ابو عبد اللہ صارم 108
- 6- باغِ فدک ابو سعید سلفی 131
- 7- مولودِ کعبہ حافظ ابوبیخی نورپوری 177
- 8- مجاہد بن سعید اور محدثین غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری 179
- 9- قارئین کے سوالات غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری 188
- 10- سیدہ ام کلثوم بنت علی کا نکاح ابن الحسن محمدی 234
- 11- نکاحِ متعہ تا قیامت حرام ہے غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری 244
- 12- قدم بوسی کی شرعی حیثیت! ابو عبد اللہ صارم 277

## ہم اہل حدیث کیوں؟

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

اہل حدیث ہی اہل حق ہیں۔ لقب اہل حدیث گمراہی کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔ اسی لیے جو بھی گمراہ ہو جاتا ہے، وہ اہل حدیث سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ تب ہی تو ہر ظالم اور گمراہ فرقے کی کوشش ہوتی ہے کہ دنیا میں اہل حدیث کہنے، کہلوانے والا کوئی نہ ہو۔ ان کا یہ خواب نہ کبھی شرمندہ تعبیر ہوا، نہ ہوگا۔ **إِنْ شَاءَ اللَّهُ!**

دراصل یہ بُری خواہش کرنے والے وہ لوگ ہیں جو سلف صالحین، ائمہ دین اور محدثین کے منہج و عقیدے کے مخالف اور دشمن ہیں۔ وہ ان کے عقیدہ و عمل کو مٹانے کے درپے ہیں، نیز یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ سلف صالحین کا دین ناقابل اتباع ہے۔

حالانکہ دنیا میں محدثین کرام ہی وہ لوگ تھے، جو اہل حق تھے۔ یہی گروہ قرآن و سنت کو کماحقہ سمجھتا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ اسی لیے یہ طائفہ منصورہ اہل حدیث کہلایا اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے بھی اپنے آپ کو اہل حدیث ہی کہتے ہیں۔

## اہل حدیث ہی اہل حق کیوں؟

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ﴾ (الأعراف 7: 181)

”جو لوگ ہم نے پیدا کیے، ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے، جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اسی کے مطابق عدل و انصاف کرتا ہے۔“

اس آیتِ کریمہ کا مصداق وہ اہل حق ہیں، جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی یہ متواتر

مشہور حدیث ہے:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ» .

”میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہے گا اور غالب رہے گا، یہاں تک کہ (قیامت

کی صورت میں) اللہ کا حکم آجائے گا۔“

(قطف الأزهار المتناثرة في الأحاديث المتواترة للسيوطي : 81، لقط اللآلي المتناثرة في

الأحاديث المتواترة للزبيدي : 20، نظم المتناثر من الحديث المتواتر : 145)

اس حدیث کی تشریح میں ائمہ اہل سنت، محدثین کرام بالاتفاق فرماتے ہیں کہ اس

طائفہ منصورہ سے مراد اہل حدیث ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں :

① امام اہل سنت، احمد بن حنبل رحمہ اللہ (164-241ھ) فرماتے ہیں :

إِنْ لَّمْ تَكُنْ هَذِهِ الطَّائِفَةُ الْمَنْصُورَةُ أَصْحَابُ الْحَدِيثِ، فَلَا أَدْرِي مَنْ هُمْ .

”اگر یہ طائفہ منصورہ اہل حدیث نہیں ہیں تو میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں۔“

(معرفة علوم الحديث للحاكم، ص : 2، وسنده صحيح)

② امام عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ (118-181ھ) فرماتے ہیں :

هُمْ عِنْدِي أَصْحَابُ الْحَدِيثِ .

”میرے نزدیک وہ (طائفہ منصورہ) اہل حدیث ہی ہیں۔“

(شرف أصحاب الحديث للخطيب البغدادي، ص : 42، وسنده صحيح)

③ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے سنا۔ انہوں

نے فرمایا: میں نے امام علی بن المدینی رحمہ اللہ (161-234ھ) کو یہ فرماتے ہوئے سنا :

هُمْ أَصْحَابُ الْحَدِيثِ . ”وہ (طائفہ منصورہ) اہل حدیث ہی ہیں۔“

(سنن الترمذي : 4/504، 505، ح : 2229، مطبوعة إحياء التراث العربي، بيروت)

④ امام یزید بن ہارون رحمہ اللہ (117-206ھ) فرماتے ہیں :

إِنْ لَّمْ يَكُونُوا أَهْلَ الْحَدِيثِ وَالْأَثَرِ، فَلَا أَدْرِي مَنْ هُمْ .

”اگر وہ (طائفہ منصورہ) اہل حدیث نہیں ہیں تو میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں؟“

(مسألة الاحتجاج بالشافعي للخطيب، ص: 33، وسنده صحيح)

⑤ امام محمد بن اسماعیل البخاری رحمہ اللہ (194-256ھ) فرماتے ہیں:

يَعْنِي أَهْلَ الْحَدِيثِ . ”اس سے مراد اہل حدیث ہیں۔“

(مسألة الاحتجاج بالشافعي، ص: 33، وسنده صحيح)

⑥ امام حاکم رحمہ اللہ (321-405ھ) اس بارے میں فرماتے ہیں:

وَفِي مِثْلِ هَذَا قِيلَ : مَنْ أَمَرَ السُّنَّةَ عَلَى نَفْسِهِ قَوْلًا وَفِعْلًا نَطَقَ بِالْحَقِّ، فَلَقَدْ أَحْسَنَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ فِي تَفْسِيرِ هَذَا الْخَبَرِ أَنَّ الطَّائِفَةَ الْمَنْصُورَةَ الَّتِي يُرْفَعُ الْخِذْلَانُ عَنْهُمْ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ؛ هُمْ أَصْحَابُ الْحَدِيثِ، وَمَنْ أَحَقُّ بِهَذَا التَّأْوِيلِ مِنْ قَوْمٍ سَلَكُوا مَحَجَّةَ الصَّالِحِينَ، وَاتَّبَعُوا آثَارَ السَّلَفِ مِنَ الْمَاضِينَ، وَدَخَضُوا أَهْلَ الْبِدْعِ وَالْمُخَالِفِينَ سُنَنَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَى إِلِهِ أَجْمَعِينَ .

”ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنے نفس پر قولاً وفعلاً سنت کو لاگو

کر لیتا ہے، وہ حق کے مطابق ہی بولتا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس حدیث کی بہت

اچھی تفسیر کی ہے کہ طائفہ منصورہ، جن سے قیامت تک ذلت و رسوائی دور کر دی گئی ہے، وہ

اہل حدیث ہی ہیں۔ اس تفسیر کا ان لوگوں سے بڑھ کر مصداق ہو بھی کون سکتا ہے، جو نیک

لوگوں کے منہج پر گامزن ہوئے، سلف صالحین کے آثار کی پیروی کی، نیز اہل بدعت اور رسول

کریم ﷺ کی سنت کے مخالفین کو لا جواب کیا؟“ (معرفة علوم الحديث للحاكم، ص: 2)

نیز فرماتے ہیں: وَعَلَىٰ هَذَا عَهْدُنَا فِي أَسْفَارِنَا وَأَوْطَانِنَا كُلِّ مَنْ يُنْسَبُ إِلَىٰ نَوْعٍ مِّنَ الْإِلْحَادِ وَالْبِدْعِ؛ لَا يَنْظُرُ إِلَى الطَّائِفَةِ الْمَنْصُورَةِ إِلَّا بِعَيْنِ الْحَقَّارَةِ، وَيُسَمِّيَهَا الْحَشَوِيَّةَ --- .

”ہم نے اپنے سفر و حضر میں اسی طرح دیکھا ہے کہ جس شخص میں کوئی گمراہی اور بدعت ہوتی ہے، وہ طائفہ منصورہ کو حقارت ہی کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کو حشویہ (گمراہ فرقہ) کا نام دیتا ہے۔“ (معرفة علوم الحديث للحاكم، ص: 4)

④ امام قوام السنہ، اسماعیل بن محمد اصفہانی (457-535ھ) فرماتے ہیں:

ذَكَرَ أَهْلُ الْحَدِيثِ، وَإِنَّهُمْ الْفِرْقَةُ الظَّاهِرَةُ عَلَى الْحَقِّ إِلَى أَنْ تَقُومَ السَّاعَةُ .  
”اہل حدیث کا بیان، وہی قیامت تک حق پر غالب رہنے والا گروہ ہے۔“

(الحجة في بيان المحجة: 262/1)

⑤ امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ (392-463ھ) فرماتے ہیں:

فَقَدْ جَعَلَ رَبُّ الْعَالَمِينَ الطَّائِفَةَ الْمَنْصُورَةَ حُرَّاسَ الدِّينِ، وَصَرَفَ عَنْهُمْ كَيْدَ الْمُعَانِدِينَ، لِيَتَمَسَّكِهِم بِالشَّرْعِ الْمَتِينِ، وَافْتِثَائِهِمْ آثَارَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ، فَشَانُهُمْ حِفْظُ الْآثَارِ وَقَطْعُ الْمَفَاوِزِ وَالْقَفَارِ، وَرُكُوبُ الْبَرَارِيِّ وَالْبَحَارِ، فِي افْتِبَاسِ مَا شَرَعَ الرَّسُولُ الْمُصْطَفَى، لَا يُعَرِّجُونَ عَنْهُ إِلَى رَأْيٍ وَلَا هَوًى، قَبِلُوا شَرِيعَتَهُ قَوْلًا وَفِعْلًا، وَحَرَسُوا سُنَّتَهُ حِفْظًا وَنَقْلًا، حَتَّى تَبْتُتُوا بِذَلِكَ أَصْلَهَا، وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا، وَكَمْ مِّنْ مُّلْحِدٍ يَّرُومُ أَنْ يَخْلِطَ بِالشَّرِيعَةِ مَا لَيْسَ مِنْهَا، وَاللَّهُ تَعَالَى يَذُبُّ بِأَصْحَابِ الْحَدِيثِ عَنْهَا، فَهُمْ الْحُقَاطُ لِأَرْكَانِهَا، وَالْقَوَامُونَ بِأَمْرِهَا وَشَانِهَا، إِذَا

صَدَفَ عَنِ الدِّفَاعِ عَنْهَا، فَهُمْ دُونَهَا يُنَاضِلُونَ ﴿أَوَلَيْكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (المجادلة 58: 22).

”اللہ رب العالمین نے طائفہ منصورہ کو دین کا محافظ بنایا اور ان کو مخالفین کی سازشوں سے محفوظ کیا، کیونکہ انہوں نے شریعتِ مطہرہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے اور صحابہ و تابعین کے آثار کی پیروی کی ہے۔ وہ ہر وقت آثار کو یاد کرتے، (حدیث کے لیے) صحراؤں و بیابانوں کا سفر کرتے اور پیغمبر مصطفیٰ ﷺ کی دی ہوئی شریعت کو سمجھنے کے لیے بحر و بر میں گھستے نظر آتے ہیں۔ وہ حدیث کو چھوڑ کر کسی رائے یا خواہش کی پیروی نہیں کرتے۔ انہوں نے آپ ﷺ کی شریعت کو قولاً و فعلاً قبول کیا ہے اور آپ ﷺ کی سنت کی حفظ و نقل کے اعتبار سے حفاظت کر کے اس کی جڑ مضبوط کر دی ہے۔ یہی لوگ اس کام کے لائق اور اہل تھے۔ کتنے ہی ملحدین شریعت میں وہ چیزیں ملا دینا چاہتے ہیں، جو اس میں شامل نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اہل حدیث کے ذریعے شریعت کا دفاع کرتا ہے۔ اہل حدیث ہی شریعت کے ارکان کے محافظ اور اس کی سادھ کو مضبوط کرنے والے ہیں۔ جب شریعت کے دفاع کی راہ میں رکاوٹیں حائل کی جائیں تو وہ اس کی خاطر لڑائی بھی کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہیں، خبردار! اللہ تعالیٰ کے گروہ (کے لوگ) ہی کامیاب ہونے والے ہیں۔“

(شرف أصحاب الحديث، ص: 39)

### اہل حدیث کا عقیدہ و منہج :

اہل حدیث کا وہی عقیدہ و منہج ہے، جو محدثین کرام کا تھا۔ ہم سرمو بھی اس سے منحرف نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک محدثین کرام سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔ اہل حدیث، قرآن و حدیث، اجماع امت اور اجتہاد شرعی کو حق مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک

قرآن و سنت کا وہی فہم معتبر ہے، جو محدثین کا اتفاقی فہم ہے۔ دنیا میں محدثین سے ثابت ایک بھی اجماع ایسا نہیں، جس کے اہل حدیث منکر ہوں۔ ہم دینی مسائل میں اسلاف امت اور محدثین کرام کے اجتہادات کو مقدم رکھتے ہیں، جیسا کہ اہل حدیث کے اسلاف:

❁ امام عبد الرحمن بن عمرو، اوزاعی رحمہ اللہ (م: 157ھ) فرماتے ہیں:

عَلَيْكَ بِآثَارِ مَنْ سَلَفَ وَإِنْ رَفَضَكَ النَّاسُ، وَإِيَّاكَ وَرَأْيَ الرَّجَالِ وَإِنْ زَخَرَفُوهُ بِالْقَوْلِ، فَإِنَّ الْأَمْرَ يَنْجَلِي وَأَنْتَ عَلَى طَرِيقِ مُسْتَقِيمٍ .

”تو سلف (محدثین) کے آثار کو لازم پکڑ، اگرچہ لوگ تجھے چھوڑ دیں۔ تو (بدعتی) لوگوں کی آرا سے بچ، اگرچہ وہ ان کو مزین کر کے پیش کریں، کیونکہ بلاشبہ ایسا کرنے سے تیرا معاملہ صاف ہو جائے گا اور تو صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے گا۔“

(شرف أصحاب الحديث للخطيب: 6، الشريعة للأجري: 127، وسنده صحيح)

❁ امام ابو زرہ رازی (200-264ھ) اور امام ابو حاتم رازی (240-327ھ) رحمہ اللہ

فرماتے ہیں: ”نیز ہم اہل سنت والجماعت کی اتباع کرتے ہیں، شذوذ، اختلاف اور تفرقہ بازی سے اجتناب کرتے ہیں۔۔۔“ (کتاب أصل السنة واعتقاد الدين)

❁ علامہ ابو المظفر سمعانی رحمہ اللہ (426-489ھ) فرماتے ہیں:

وَشِعَارُ أَهْلِ السُّنَّةِ اتِّبَاعُهُمُ السَّلَفَ الصَّالِحَ، وَتَرْكُهُمْ كُلَّ مَا هُوَ مُبْتَدَعٌ مُحَدَّثٌ .

”اہل سنت (اہل حدیث) کا شعار سلف صالحین کی پیروی کرنا

اور ہر بدعت کو چھوڑ دینا ہے۔“ (الحجة في بيان المحجة للافهاني: 395/1)

سوال یہ ہے کہ اگر محدثین کرام کا منہج و عقیدہ درست تھا اور وہ اہل حق تھے تو ان کے ہم عقیدہ وہ منہج اہل حق کیوں نہیں؟





## اعتراضات کا منصفانہ تجزیہ

اہل حدیث لقب پر مختلف قسم کے لوگ کئی قسم کے اعتراضات کرتے ہیں، آئیے اختصار کے ساتھ ان سب کا جائزہ لیتے ہیں:

### ① ہمارا نام صرف مسلمان!

بعض لوگوں کو لفظ اسلام اور مسلم کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ یہ لوگ کسی کافر و مشرک اور بدعتی سے اتنی نفرت نہیں کرتے، جتنی اہل حدیث سے روا رکھتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو کافر بنانے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا نام صرف مسلمان رکھا ہے۔ جو کوئی اپنے آپ کو اہل سنت یا اہل حدیث کہتا ہے، وہ کافر و مشرک ہو جاتا ہے۔ اس بات سے کسی مسلمان کو انکار نہیں کہ اللہ نے ہمارا نام مسلمان رکھا ہے اور ہم مسلمان ہی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی یہ نہیں فرمایا کہ تمہارا نام صرف مسلمان ہے۔ اس سلسلے میں جو آیت کریمہ پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے:

﴿هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا﴾ (الحج 22: 78)

”اس (اللہ) نے تمہارا نام مسلمان رکھا، اس سے پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی۔“  
اس آیت میں کوئی کلمہ حصر استعمال نہیں کیا گیا، جس سے یہ ثابت ہو کہ ہمارا نام صرف مسلمان ہے یا اللہ نے ہمارا نام صرف مسلمان رکھا ہے، اس کے علاوہ کوئی نام رکھنا جائز ہی نہیں رہا اور جو اپنا کوئی اور نام رکھ لے گا، وہ مسلمان ہی نہیں رہے گا۔

خود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کے اور بھی نام رکھے ہیں، جیسا کہ:

سیدنا حارث اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«فَادْعُوا بِدَعْوَى اللَّهِ الَّذِي سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ، الْمُؤْمِنِينَ، عِبَادَ اللَّهِ».

”تم اللہ کی پکار کے ساتھ پکارو، جس نے تمہارا نام مسلمان، مؤمن اور عباد اللہ رکھا ہے۔“

(سنن الترمذی: 2863، وسندہ صحیح)

اس حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہمارے تین نام رکھے ہیں؛ مسلمان، مؤمن اور عباد اللہ۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جو مؤمن کے سوا اپنا کوئی نام رکھ لے گا، وہ مؤمن نہیں رہے گا اور جو عبد اللہ کے علاوہ اپنا کوئی نام رکھ لے، وہ اللہ کا بندہ نہیں رہے گا اور جو ان تینوں میں سے کسی نام کو چھوڑے گا، وہ دائرۃ اسلام و ایمان سے خارج ہو جائے گا؟

ہمارا ایسے لوگوں سے سوال ہے کہ اللہ نے جب مؤمن اور عباد اللہ نام بھی رکھا ہے تو آپ لوگ مؤمن اور عباد اللہ کے نام کیوں نہیں رکھتے؟

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دو نام ”مہاجرین“ اور ”انصار“ بھی ذکر کیے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ (التوبة: 9: 117)

”یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر اور مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی۔“

نبی اکرم ﷺ نے بھی جس طرح مسلمانوں کو [يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ] (اے مسلمانوں کی جماعت!) کہہ کر پکارا (صحیح البخاری: 4141، صحیح مسلم: 2770)، اسی طرح ان کو [يَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِينَ] (اے مہاجرین کی جماعت!) (صحیح البخاری: 6830) اور [يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ] (اے انصار کی جماعت!) (صحیح البخاری: 4330، صحیح مسلم: 1059) کہہ کر بھی یاد فرمایا۔

نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو کئی اور ناموں سے بھی پکارا اور یاد فرمایا، لیکن ہم نے خصوصاً مہاجرین اور انصار کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اسلام کے بعض ٹھیکیداروں کو جب یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اللہ نے تمہارا نام صرف مسلمان رکھا ہے تو تمہارا نام مسعود، حنیف، شیم وغیرہ

کیوں ہے؟ تو وہ یہ جواب دے کر بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ پابندی صرف مذہبی نام پر ہے، یعنی مسلم کے سوا کوئی مذہبی نام نہیں رکھا جاسکتا، مثلاً اہل سنت اور اہل حدیث وغیرہ مذہبی نام ہیں، یہ نام ناجائز ہیں، ان کی وجہ سے مسلمان مشرک اور فرقہ پرست بن جاتا ہے۔ حالانکہ اہل سنت اور اہل حدیث دونوں اسی طرح کے مذہبی نام ہیں، جس طرح کے مذہبی نام مہاجرین اور انصار ہیں۔ مہاجرین کو ہجرت جیسے مذہبی فریضے کی بجا آوری پر مہاجرین کا نام دیا گیا اور ان بے یار و مددگار مہاجرین کی نصرت جیسے دینی کارنامے کی بنا پر مدینہ کے مسلمانوں کو انصار کا نام دیا گیا۔ جب کسی مذہبی کارنامے کی بنا پر کوئی نام جائز ہے تو قرآن و سنت پر عمل جیسے مذہبی کارنامے کی بنا پر اہل سنت یا اہل حدیث کہلوانا کیونکر شرک و کفر بن گیا؟ اگر اب بھی کسی کی سمجھ میں بات نہیں آئی تو ہم ایک اور طرح سے سمجھائے دیتے ہیں۔ اسلام اور مسلمان کوئی نئی اصطلاح نہیں، بلکہ پہلی امتوں میں بھی دین اسلام ہی تھا، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران 3: 19)

”بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہی ہے۔“

اسی لیے سیدنا ابراہیم اور سیدنا یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت فرمائی تھی:

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمْ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾

(البقرة 2: 132)

”اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین (اسلام) پسند کیا ہے، لہذا تم نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔“

سیدنا سلیمان علیہ السلام نے بلقیس اور اس کی رعایا کو خط لکھا تھا:

﴿أَلَا تَعْلَمُونَ عَلَيَّ وَأَتُونِي مُسْلِمِينَ﴾ (النمل 27: 31)

”میرے خلاف سرکشی نہ کرو اور مسلمان ہو کر میرے پاس آ جاؤ۔“

یعنی پہلے انبیاء کا دین بھی اسلام ہی تھا اور پہلی امتوں کو بھی مسلمان ہی ہونے کا حکم تھا، لیکن اس کے باوجود اپنے انبیاء کے پیروکار یہودی کہلاتے تھے یا نصرانی، اگر وہ اہل توحید تھے، تو جنت میں جائیں گے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (البقرة: 2: 62)

”بلاشبہ جو لوگ (محمد ﷺ پر) ایمان لائے اور جو یہودی، نصرانی اور صابی (آبا و اجداد کا دین چھوڑ کر نیا دین قبول کرنے والے) بنے، ان میں سے جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے تھے اور نیک عمل کرتے تھے، ان کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

یعنی یہود و نصاریٰ کہلانے والے مومنوں کو بھی جنت کی بشارت سنائی گئی ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی بعثت سے پہلے دورِ جاہلیت میں بھی اہل توحید تھے، جنہوں نے بت پرستی چھوڑ کر توحید کو اپنا لیا تھا۔ ان کا دین نصرانیت تھا۔ مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسے لوگ جنتی ہیں۔ ورقہ بن نوفل سے کون واقف نہیں؟ یہ انہی لوگوں میں سے تھے۔ ذرا ان کا تعارف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

وَكَانَ امْرَأً تَنْصَرَفَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ، فَيَكْتُبُ مِنَ الْإِنْجِيلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَكْتُبَ.

”ورقہ بن نوفل دورِ جاہلیت میں بت پرستی چھوڑ کر نصرانی ہوئے تھے، وہ عبرانی زبان

لکھنا جانتے تھے، چنانچہ جس قدر انہیں توفیق ملتی عبرانی زبان میں انجیل لکھتے رہتے۔“

(صحیح البخاری: 3، صحیح مسلم: 160)

یعنی موحد ہونے کے ساتھ ساتھ ورقہ بن نوفل کا مذہب نصرانیت تھا۔

نصرانیت کی وجہ تسمیہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ امام قتادہ تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

تُسَمُّوْا بِقَرِيَّةٍ يَّقَالُ لَهَا نَاصِرَةٌ، كَانَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَنْزِلُهَا.

”ان کا یہ نام ایک بستی [ناصرہ] کی بنا پر پڑا جس میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام تشریف لایا

کرتے تھے۔“ (تفسیر الطبری: 2/145، وسندہ صحیح)

یعنی پہلی امتوں کو بھی مسلمان ہونے کا حکم تھا اور ان سے بھی صرف دین اسلام ہی کا مطالبہ تھا۔ پہلے انبیاء نے اسلام ہی کی دعوت دی اور انبیائے کرام کے پیروکار مسلمان ہی تھے، لیکن مسلمان ہونے کے ساتھ کوئی اہل توحید یہودی یا نصرانی بھی کہلایا، تو اللہ کی جنت کا وارث قرار پایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان ہوتے ہوئے کوئی ایسا دینی، مذہبی، تنظیمی و تحریکی اور مسلکی نام کفر و شرک نہیں ہوتا، جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔

اصل بات تو عقیدہ و منہج کی ہے۔ اگر عقیدہ و منہج سلامت نہیں، تو لاکھ دفعہ مسلمان کہلائے اور کروڑ دفعہ اسلام کا دعویٰ کرے، نجات ممکن نہیں اور اگر عقیدہ و منہج درست ہے تو مسلمان ہونے کے ساتھ مہاجر کہلائے یا انصاری، اہل سنت کہلائے یا اہل حدیث، نجات سے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

نصرانیت ایک مذہبی نام تھا، جو ایک بستی کی بنا پر پڑا تھا۔ جب مسلمان ہوتے ہوئے ایک بستی کی طرف منسوب مذہبی نام ورقہ بن نوفل کی نجات میں رکاوٹ نہیں بن سکا، تو قرآن و سنت کی طرف منسوب نام ہم اہل توحید کے لیے کفر و شرک کیسے بن گیا؟

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی کفریہ و شرکیہ اور باطل عقیدہ و منہج کی طرف نسبت



کرنے کے لیے رکھے جانے والے جماعتی نام اپنے منسوب الیہ عقیدہ و منہج کی بنا پر ناجائز ہیں، اس لیے نہیں کہ مسلمان ہوتے ہوئے کوئی دوسرا جماعتی نام نہیں رکھا جاسکتا۔

## ② اہل حدیث تو محدثین تھے!

اس سلسلے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اہل حدیث صرف محدثین تھے۔ ان کے بعد کوئی اہل حدیث نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ ان کے خیال کے مطابق محدثین کرام کو ماننے والا دنیا میں کوئی رہا ہے نہ ان کے عقیدہ و عمل کو کسی نے سمجھا اور اپنایا ہے اور محدثین کرام سے محبت کرنے والا کوئی دنیا میں تھا، نہ ہے، نیز ان کے منہج کی دعوت دینے والا کوئی تھا، نہ ہے۔ اگر خدا نخواستہ واقعی ایسا ہو جائے، تو اہل باطل کی دلی مراد پوری ہو جائے، گمراہ فرقوں کو پینپنے کا موقع مل جائے اور دین محمد ﷺ کے دشمنوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے۔

حالانکہ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہندوستان کے شہر دیوبند میں ”دارالعلوم دیوبند“ قائم کرنے والے ہی دیوبندی تھے، ان کے بعد کوئی دیوبندی نہیں ہو سکتا اور ہندوستان کے شہر ”بریلی“ کے باشندے، جناب احمد رضا خان ہی بریلیوی تھے، ان کے بعد کوئی بریلیوی نہیں ہو سکتا۔ اہل حدیث کے بدخواہوں کی طرف سے کبھی یہ سوال نہیں کیا گیا کہ پاکستان اور دیگر ممالک کے باشندے ہندوستان کے شہر دیوبند اور بریلی کی طرف کیسے منسوب ہو گئے؟

جن لوگوں نے دیوبند میں 1866ء کو قائم ہونے والے ”دارالعلوم“ کا دیا ہوا طریقہ کار اختیار کیا، وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں اور کسی بھی وقت دیوبندی کہلا سکتے ہیں اور جنہوں نے بریلی کے باشندے جناب احمد رضا خان (1865-1921ء) کا دیا ہوا دین اپنایا، وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں اور کسی بھی وقت بریلیوی کہلا سکتے ہیں، تو جن خوش نصیبوں نے اسلام کے دورِ اوّل میں صحابہ کرام سے لے کر تدوین حدیث تک کے، حدیث پڑھنے پڑھانے والے، محدثین کرام کا منہج اختیار کیا، وہ اہل حدیث کیوں نہیں کہلا سکتے؟

دراصل اہل حدیث کی دو قسمیں ہیں؛ ایک قسم ان محدثین کرام پر مشتمل ہے، جنہوں نے حدیث کو روایت کیا، جمع کیا اور اس کے معنی و مفہوم کو بجا طور پر سمجھا۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جنہوں نے محدثین کرام کے فہم دین کو لیا، شریعت کے متعلق محدثین کرام کی تعبیرات کو کافی جانا اور ہر دور میں انہی کے عقیدہ و منہج اور عمل کو اپنایا۔

شیخ الاسلام، تقی الدین، احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

وَنَحْنُ لَا نَعْنِي بِأَهْلِ الْحَدِيثِ الْمُقْتَصِرِينَ عَلَى سَمَاعِهِ، أَوْ كِتَابَتِهِ، أَوْ رَوَايَتِهِ، بَلْ نَعْنِي بِهِمْ كُلَّ مَنْ كَانَ أَحَقَّ بِحِفْظِهِ، وَمَعْرِفَتِهِ، وَفَهْمِهِ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا، وَاتِّبَاعِهِ بَاطِنًا وَظَاهِرًا، وَكَذَلِكَ أَهْلُ الْقُرْآنِ، وَأَدْنَى خَصْلَةٍ فِي هَؤُلَاءِ مَحَبَّةُ الْقُرْآنِ وَالْحَدِيثِ، وَالْبَحْثُ عَنْهُمَا وَعَنْ مَعَانِيهِمَا، وَالْعَمَلُ بِمَا عَلِمُوهُ مِنْ مُوجِبِهِمَا.

”اہل حدیث سے ہماری مراد صرف وہ لوگ نہیں، جو حدیث سننے، لکھنے یا روایت کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، بلکہ ہمارے نزدیک ہر وہ شخص اہل حدیث ہے، جو حدیث کو یاد کرتا ہو، اس کی معرفت رکھتا ہو، ظاہری و باطنی طور پر حدیث کو سمجھتا اور اس پر عمل کرتا ہو۔ اسی طرح قرآن کریم کو یاد کرنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے بھی اہل حدیث ہیں۔ اہل حدیث کی کم سے کم خوبی یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث سے محبت رکھتے ہیں، ان کی نصوص اور معانی کی جستجو میں رہتے ہیں اور ان کی جو تعلیمات معلوم ہو جائیں، ان پر عمل کرتے ہیں۔“

(مجموع الفتاویٰ: 95/4)

یعنی جس طرح قرآن و سنت کو یاد کرنے، سمجھنے اور آگے بیان کرنے والے محدثین کرام اہل حدیث تھے، اسی طرح ان سے قرآن و سنت کو سن کر عمل کرنے والے بھی اہل حدیث ہیں۔ قابل غور بات تو یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی فقہی خدمات کو یاد کرنے، نقل کرنے اور امام

صاحب کے اقوال میں سے صحیح و غلط کی تمیز کرنے والے ائمہ احناف بھی حنفی تھے اور ان کے بعد میں آنے والے فقہ حنفی کے ایسے ان پڑھ پیروکار بھی حنفی کہلائے، جن کو فقہ کی تعریف تک نہیں آتی۔ اگر یہ طرز عمل درست تھا تو یہ کیسے غلط ہو گیا کہ قرآن و سنت کو یاد کرنے، سمجھنے، نقل کرنے اور صحیح و ضعیف احادیث میں تمیز کرنے والے محدثین بھی اہل حدیث ہوں اور بعد میں قیامت تک آنے والے وہ لوگ بھی اپنے آپ کو اہل حدیث کہلائیں جو محدثین سے قرآن و سنت کا علم لے کر اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتے ہوں؟

### ۳) اہل سنت ہونا چاہیے، اہل حدیث نہیں!

بعض لوگ تو ایسے عقل کے دشمن ہیں کہ لقب اہل سنت پر انہیں کوئی اعتراض نہیں، بلکہ وہ اپنے تئیں اہل سنت کہلاتے بھی ہیں، لیکن لقب اہل حدیث سے انہیں خاص قسم کی دشمنی ہے، حالانکہ ان دونوں القاب میں کوئی خاص فرق نہیں، اگر سنت اور حدیث میں فرق کرنے کی کوشش کی جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ حدیث، سنت سے زیادہ جامع لفظ ہے، کیونکہ حدیث کا اطلاق قرآن (الکہف: 18، 6؛ الزمر: 39، 23؛ القلم: 68، 44) پر بھی ہوا ہے اور اسوۂ رسول پر بھی، جبکہ سنت کے لفظ کا قرآن کریم پر کبھی اطلاق نہیں ہوا، اس کا اطلاق صرف اسوۂ رسول پر ہوتا ہے۔ یوں اہل حدیث کا معنی ہوگا: ایسے لوگ جو قرآن اور اسوۂ رسول کو اپنا دستور زندگی سمجھتے ہیں اور اہل سنت کا معنی ہوگا: ایسے لوگ جو اسوۂ رسول کو اپنا ضابطہ حیات قرار دیتے ہیں۔

یہ فرق صرف ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے بیان کیا گیا ہے، جو اہل سنت کے نام کو تسلیم کرتے ہیں اور اہل حدیث کے نام سے چڑتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اہل سنت اور اہل حدیث دونوں ایک ہی گروہ کے دو نام ہیں۔ جب اہل اسلام نے اسلام کے نام لیوا دشمنان اسلام روافض سے جدا گانہ تشخیص اختیار کرنا چاہا تو اپنے آپ کو اتفاقی طور پر اہل



سنت کہا اور جب اہل سنت نے اپنے آپ کو اہل سنت کہنے والے اہل بدعت سے جداگانہ تشخص بنانا چاہا تو اتفاقی طور پر اپنے آپ کو اہل حدیث کہا۔ حقیقت میں اہل سنت و اہل حدیث ایک ہی گروہ اور ایک ہی جماعت ہے، جیسا کہ:

امام اندلس، حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ (368-463ھ) فرماتے ہیں:

وَأَمَّا قَوْلُهُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ لِلْجَارِيَةِ : «أَيْنَ اللَّهُ؟» فَعَلَى ذَلِكَ جَمَاعَةُ أَهْلِ السُّنَّةِ، وَهُمْ أَهْلُ الْحَدِيثِ .

”اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا لونڈی سے سوال کرنا کہ اللہ کہاں ہے؟ (اور اس کا جواب کہ وہ آسمانوں کے اوپر ہے)، اسی کے مطابق اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے اور اہل سنت والجماعت اہل حدیث ہی ہیں۔“ (الاستذکار: 337/7)

نیز فرماتے ہیں: وَيَحْتَجُّ بِهِ أَهْلُ الْحَدِيثِ وَالْفِقْهِ، وَهُمْ أَهْلُ السُّنَّةِ .  
”اس حدیث سے اہل حدیث وفقہ دلیل لیتے ہیں اور یہی لوگ اہل سنت ہیں۔“

(الاستذکار: 258/8)

شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ (471-561ھ) فرماتے ہیں:

إِنَّ أَهْلَ السُّنَّةِ لَا اسْمَ لَهُمْ إِلَّا اسْمٌ وَاحِدٌ، وَهُوَ أَصْحَابُ الْحَدِيثِ .  
”بلاشبہ اہل سنت کا ایک ہی نام ہے اور وہ اہل حدیث ہے۔“

(الغنية لطالبي طريق الحق: 71/1، طبعة دار المعرفة، بيروت)

معلوم ہوا کہ اہل سنت اور اہل حدیث ایک ہی جماعت کے دو نام ہیں۔ محدثین کرام ایک ہی وقت میں اہل سنت اور اہل حدیث کہتے، کہلاتے تھے، آج بھی اہل سنت اپنے آپ کو اہل حدیث کہلاتیں تو اس میں آخر مضائقہ کیا ہے؟

اس بات کو مثال سے یوں سمجھیں کہ پاکستان میں رہنے والے سارے لوگ ہی پاکستانی

ہیں، لیکن جب لاہور میں رہنے والا کوئی پاکستانی، پشاور میں رہنے والے پاکستانی سے ملتا ہے تو ایک کی شناخت لاہوری اور دوسرے کی پشاور کی ہوتی ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک پاکستانی اپنے آپ کو لاہوری تو کہہ سکتا ہے، پشاور کی نہیں کہہ سکتا؟ جب یہ درست نہیں تو یہ کہنا کیسے مناسب ہے کہ مسلمان روافض کے مقابلے میں اہل سنت کہلا سکتے ہیں، لیکن اہل بدعت کے مقابلے میں اہل حدیث نہیں کہلا سکتے؟

ہاں، اگر کوئی شخص یا گروہ اہل سنت و اہل حدیث کے منہج و عمل کا مخالف ہے، تو اسے بجا طور پر پوچھا جاسکتا ہے کہ آپ اہل سنت و اہل حدیث کے منہج کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اہل سنت یا اہل حدیث کیوں کہہ رہے ہیں؟

### ❁ اصلی اہل سنت کون؟

اصطلاح اہل سنت کا اطلاق دو طرح سے ہوتا ہے؛ ایک عام اور دوسرے خاص۔ عام اطلاق شیعہ کے مقابلے میں ہوتا ہے، یعنی شیعہ کے علاوہ ہر وہ فرقہ جو اسلام کی طرف منسوب ہو، اہل سنت کہلاتا ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فَلَفْظُ أَهْلِ السُّنَّةِ يُرَادُ بِهِ مَنْ أَتَبَتْ خِلَافَةَ الْخُلَفَاءِ الثَّلَاثَةِ، فَيَدْخُلُ فِي ذَلِكَ جَمِيعُ الطَّوَائِفِ إِلَّا الرَّافِضَةَ.

”لفظ اہل سنت سے مراد وہ لوگ ہیں، جو خلفائے ثلاثہ (سیدنا ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم) کی خلافت کو حق سمجھتے ہیں۔ اس میں سوائے روافض کے تمام اسلامی گروہ شامل ہیں۔“

(منهاج السنة النبویة في نقض كلام الشيعة القدرية: 2/221)

جبکہ اہل سنت کا خاص اطلاق تمام اہل بدعت و ضلالت، مثلاً شیعہ، خوارج، جہمیہ، معتزلہ، مرجیہ، اشاعرہ وغیرہ کے مقابلے میں ہوتا ہے اور اس خاص اطلاق کے مطابق اہل سنت سے مراد صرف وہ فرقہ ناجیہ اور طائفہ منصورہ ہے، جو ہر قسم کی گمراہی سے پاک ہے اور جسے محدثین

کرام کے بقول اہل حدیث کہا جاتا ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہی فرماتے ہیں:

وَقَدْ يُرَادُ بِهِ أَهْلُ الْحَدِيثِ وَالسُّنَّةِ الْمَحْضَةِ، فَلَا يَدْخُلُ فِيهِ إِلَّا مَنْ يُثْبِتُ الصِّفَاتِ لِلَّهِ تَعَالَى، وَيَقُولُ: إِنَّ الْقُرْآنَ غَيْرُ مَخْلُوقٍ، وَإِنَّ اللَّهَ يُرَى فِي الْآخِرَةِ، وَيُثْبِتُ الْقَدْرَ، وَغَيْرَ ذَلِكَ مِنَ الْأُصُولِ الْمَعْرُوفَةِ عِنْدَ أَهْلِ الْحَدِيثِ وَالسُّنَّةِ.

”کبھی لفظ اہل سنت سے مراد اہل حدیث ہوتے ہیں، جو اصلی اہل سنت ہیں۔ ایسی صورت میں اہل سنت میں صرف وہ لوگ شامل ہوں گے، جو تمام صفات باری تعالیٰ کا اثبات کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن کریم مخلوق نہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (مومنوں کو) اپنا دیدار کرائے گا، نیز وہ تقدیر اور اہل حدیث و اہل سنت کے ہاں معروف دیگر اصول دین پر ایمان لاتے ہوں۔“ (منہاج السنۃ النبویۃ: 221/2)

اس بنا پر اہل سنت کا لقب اپنانا اہل حدیث کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔ احناف مقلدین عقائد کے باب میں صرف سات صفات باری تعالیٰ (سمع، بصر، علم، کلام، قدرت، ارادہ، حیات) کا اثبات کرتے ہیں، باقی سب میں اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف تاویل کرتے ہیں، جبکہ اہل حدیث ہر دور میں اللہ رب العزت کی تمام صفات کو بغیر تمثیل و تکلیف اور تحریف و تاویل کے تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اہل حدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر وہ صفت جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیے ثابت کر دی ہے یا اپنے پیارے پیغمبر ﷺ کی زبانی ہمیں بتا دی ہے، وہ جیسے اللہ تعالیٰ کے لائق و مناسب ہے اور جیسے اس کے شایان شان ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جو لوگ عقیدہ توحید، یعنی اسماء و صفات میں سلف صالحین کے مخالف ہوں، کیا وہ حقیقی سنی ہو سکتے ہیں اور کیا ان کے لیے اہل سنت کہلانا

روا ہے؟ الحمد للہ! ہم اہل حدیث، سلف صالحین کے منہج و عقیدہ سے سرِ مو بھی منحرف نہیں۔ جو لوگ سلف کے عقیدے کے مخالف ہوں، ہم ان کے مخالف ہیں۔ اہل حدیث دراصل سلف صالحین و محدثین کرام کی یادگار ہیں اور سلف جن کو اہل بدعت اور اہل کلام کہہ کر پکارتے تھے، ان میں سے اکثر گروہ آج اہل سنت ہونے کے دعویدار ہیں۔ جو لوگ ہر دور میں محدثین کرام کے دشمن اور مخالف رہے ہیں، ان کو اہل سنت کہلوانے کا کیا حق ہے؟

اہل سنت والجماعت سے مراد وہ جماعت ہے جو سلف صالحین کے منہج و عقیدہ کی پابند ہو اور ان کے اجماع کو شرعی حجت مانتی ہو۔ اہل بدعت و تقلید کبھی ائمہ سلف کے عقیدہ و منہج پر کار بند نہیں ہو سکتے، نہ ہی وہ ان کے اجماع کو شرعی حجت تسلیم کر سکتے ہیں۔ ایسے اہل بدعت و ضلالت کو ہرگز ہرگز اہل سنت والجماعت کا لیبل استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

ایسے لوگوں کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

فَكثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ يُخْبِرُ عَنْ هَذِهِ الْفِرْقِ بِحُكْمِ الظَّنِّ وَالْهَوَىٰ، فَيَجْعَلُ طَائِفَتَهُ وَالْمُنْتَسِبَةَ إِلَيْهِ مَتَّبِعِيهِ الْمُؤَالِيَةَ لَهُ هُمْ أَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ، وَيَجْعَلُ مَنْ خَالَفَهَا أَهْلَ الْبِدْعِ، وَهَذَا ضَلَالٌ مُّبِينٌ، فَإِنَّ أَهْلَ الْحَقِّ وَالسُّنَّةِ لَا يَكُونُ مَتَّبِعُهُمْ إِلَّا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِي لَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، إِنَّهُ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ، فَهُوَ الَّذِي يَجِبُ تَصَدِيقُهُ فِي كُلِّ مَا أَخْبَرَ، وَطَاعَتُهُ فِي كُلِّ مَا أَمَرَ، وَلَيْسَتْ هَذِهِ الْمَنْزِلَةُ لِغَيْرِهِ مِنَ الْأَئِمَّةِ، بَلْ كُلُّ أَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ يُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِهِ وَيَتْرَكُ، إِلَّا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَمَنْ جَعَلَ شَخْصًا مِّنَ الْأَشْخَاصِ غَيْرَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؛

مَنْ أَحَبَّهُ وَوَافَقَهُ كَانَ مِنْ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ، وَمَنْ خَالَفَهُ كَانَ مِنْ أَهْلِ  
 الْبِدْعَةِ وَالْفُرْقَةِ - كَمَا يُوجَدُ ذَلِكَ فِي الطَّوَائِفِ مِنْ أَتْبَاعِ أَيْمَةِ فِي الْكَلَامِ  
 فِي الدِّينِ وَغَيْرِ ذَلِكَ - كَانَ مِنْ أَهْلِ الْبِدْعِ وَالضَّلَالِ وَالتَّفَرُّقِ، وَبِهَذَا  
 يَتَبَيَّنُ أَنَّ أَحَقَّ النَّاسِ بِأَنْ تَكُونَ هِيَ الْفِرْقَةُ النَّاجِيَةُ أَهْلُ الْحَدِيثِ وَالسُّنَّةِ؛  
 الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ مَتَّبِعٌ يُتَعَصَّبُونَ لَهُ إِلَّا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،  
 وَهُمْ أَعْلَمُ النَّاسِ بِأَقْوَالِهِ وَأَحْوَالِهِ، وَأَعْظَمُهُمْ تَمَيزًا بَيْنَ صَحِيحِهَا  
 وَسَقِيمِهَا، وَأَيْمَتُهُمْ فُقَهَاءُ فِيهَا وَأَهْلُ مَعْرِفَةٍ بِمَعَانِيهَا، وَاتِّبَاعًا لَهَا تَصَدِيقًا  
 وَعَمَلًا وَحُبًّا، وَمُؤَالَاةً لِمَنْ وَالَّهَا وَمُعَادَاةً لِمَنْ عَادَاهَا، الَّذِينَ يَرُدُّونَ  
 الْمَقَالَاتِ الْمُجْمَلَةَ إِلَى مَا جَاءَ بِهِ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ، فَلَا يَنْصِبُونَ  
 مَقَالَةً وَيَجْعَلُونَهَا مِنْ أَصُولِ دِينِهِمْ وَجُمَلِ كَلَامِهِمْ إِنْ لَمْ تَكُنْ ثَابِتَةً فِيمَا  
 جَاءَ بِهِ الرَّسُولُ بَلْ يَجْعَلُونَ مَا بُعِثَ بِهِ الرَّسُولُ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ، هُوَ  
 الْأَصْلُ الَّذِي يَعْتَقِدُونَهُ وَيَعْتَمِدُونَهُ، وَمَا تَنَازَعَ فِيهِ النَّاسُ مِنْ مَسَائِلِ  
 الصِّفَاتِ وَالْقَدَرِ وَالْوَعِيدِ وَالْأَسْمَاءِ وَالْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ  
 وَغَيْرِ ذَلِكَ يَرُدُّونَهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ، وَيُفَسِّرُونَ الْأَلْفَاظَ الْمُجْمَلَةَ الَّتِي  
 تَنَازَعَ فِيهَا أَهْلُ التَّفَرُّقِ وَالْإِخْتِلَافِ، فَمَا كَانَ مِنْ مَعَانِيهَا مُوَافِقًا لِلْكِتَابِ  
 وَالسُّنَّةِ أَتْبَعُوهُ، وَمَا كَانَ مِنْهَا مُخَالِفًا لِلْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ أَبْطَلُوهُ، وَلَا يَتَّبِعُونَ  
 الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ، فَإِنَّ اتِّبَاعَ الظَّنِّ جَهْلٌ، وَاتِّبَاعُ هَوَى النَّفْسِ بَعِيرٌ  
 هُدًى مِنَ اللَّهِ ظُلْمٌ، وَجَمَاعُ الشَّرِّ الْجَهْلُ وَالظُّلْمُ.

”ان گمراہ فرقوں کے بارے میں بہت سے لوگ اپنے ظن و تخمین اور ہوائے نفس سے حکم لگاتے ہیں، چنانچہ اپنے گروہ اور اس کے پیروکاروں کو اہل سنت والجماعت قرار دیتے ہیں، جبکہ مخالفین کو گمراہ، اہل بدعت و اہل تفرقہ کہتے ہیں۔ یہ بہت واضح گمراہی ہے۔ اہل حق، یعنی اہل سنت صرف رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہیں، جو اپنی خواہش سے بات نہیں کرتے تھے، آپ کا قول وحی الہی پر مبنی ہوتا تھا۔ آپ ﷺ ہی وہ ہستی ہیں، جن کی ہر خبر کی تصدیق اور جن کے ہر حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ آپ ﷺ کے علاوہ کسی بھی امام کی یہ شان نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ ہر شخص کی بات (قرآن و سنت کے موافق ہونے کی صورت میں) لی بھی جاسکتی ہے اور (قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنا پر) چھوڑی بھی جاسکتی ہے۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی شخص کو (پیروی کے لیے) معین کر لیتے ہیں، پھر جو اس سے محبت کرے اور اس کی موافقت کرے، اسے اہل سنت والجماعت کہتے ہیں، جبکہ اس کے مخالفین کو اہل بدعت قرار دیتے ہیں، ایسے لوگ خود بدعتی اور گمراہ ہیں۔ علم کلام وغیرہ میں بعض ائمہ کے پیروکار گروہ ایسی کارروائیوں میں ملوث ہیں۔ اس بحث سے معلوم ہوا کہ فرقہ ناجیہ ہونے کے سب سے زیادہ مستحق اہل حدیث و اہل سنت ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں، جن کے اکلوتے پیشوا و مقتدا رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے اقوال و احوال کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، انہی لوگوں کو صحیح اور ضعیف احادیث کی سب سے بڑھ کر معرفت ہے۔ اہل حدیث کے ائمہ کرام ہی حدیث میں فتاہت رکھتے ہیں اور اس کے معانی کی حقیقی پہچان کے حامل ہیں۔ تصدیق، عمل اور محبت میں یہی لوگ حقیقی طور پر حدیث کی پیروی کرتے ہیں۔ جو لوگ حدیث رسول کے محبت ہیں، اہل حدیث ان سے محبت کرتے ہیں اور جو لوگ حدیث رسول سے عداوت رکھتے ہیں، اہل حدیث ان کے دشمن ہیں۔ اہل حدیث مجمل باتوں (جن میں ایک سے زائد احتمالات ہوں،

ان کو کتاب و سنت کی نصوص پر پیش کرتے ہیں۔ کوئی بات اگر تعلیماتِ نبوی سے ثابت نہ ہو تو یہ لوگ اسے اپنے دین کا اصول اور اپنا تکیہ کلام نہیں بناتے، بلکہ اپنے اعتقاد و اعتماد کا مرکز و محور صرف کتاب و سنت کو بناتے ہیں۔ صفاتِ باری تعالیٰ، تقدیر، وعید، اسماءِ باری تعالیٰ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کے ایسے معاملات جن میں اختلاف ہو گیا ہے، وہ انہیں اللہ و رسول (قرآن و سنت) کی طرف لوٹاتے ہیں۔ اسی طرح وہ مجمل الفاظ جن کے استعمال میں اہل بدعت اختلاف ہو گیا ہو، ان کی توضیح و تشریح کرتے ہیں؛ ان میں سے جن الفاظ کے معانی کتاب و سنت کے موافق ہوں، ان کا اثبات کرتے ہیں اور جن الفاظ کے معانی کتاب و سنت سے متضاد ہوں، ان کو باطل قرار دیتے ہیں۔ وہ (کسی دینی معاملے) میں ظن و تخمین اور ہوائے نفس کے پیروکار نہیں بنتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظن و تخمین کی پیروی جہالت ہے، جبکہ ہوائے نفس کی پیروی ظلم ہے اور یہی جہالت و ظلم ہر برائی کی جڑ ہے۔ (مجموع الفتاویٰ: 3/346-348)

❀❀❀ کیا لفظِ اہل حدیث دعوت میں رکاوٹ ہے؟

بعض لوگ اہل حدیث نام کو درست اور حق تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کی یہ خام خیالی ہے کہ لوگ ”اہل حدیث“ نام سے دُور بھاگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دعوت دینے کے لیے یہ کہنا چاہیے کہ ہم قرآن و سنت کے پیروکار ہیں، لفظِ اہل حدیث استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں ایسے لوگ دراصل محدثینِ کرام اور سلفِ صالحین سے معارضہ کرتے ہیں۔ محدثینِ کرام جو سب سے بڑھ کر علم و حکمت اور ورع و تقویٰ کے حامل تھے، وہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے دُور میں حق کا بول بالا اور باطل کا منہ کالا ہوا اور دین اسلام کو غلبہ نصیب ہوا۔ محدثینِ کرام کے نزدیک اہل حق کا لقب اہل



حدیث تھا۔ اس وقت بھی لوگ اس نام سے چڑتے تھے۔ اہل حدیث کو بُری نظر سے دیکھنا ہر دور کے اہل بدعت کا شیوا رہا ہے۔ پھر بھی محدثین کرام اپنے آپ کو اجماعی و اتفاقی طور پر اہل حدیث ہی کہتے اور کہلاتے تھے۔

رہی بات لوگوں کے دُور بھاگنے کی، تو جو لوگ اپنے آپ کو مصلحت کی خاطر صرف مسلمان کہتے ہیں، بہت سے لوگ ان سے بھی نفرت کرتے ہیں، ان کو بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کی دعوت میں بھی رکاوٹیں کھڑی ہوتی ہیں۔ ہم نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ ایسے لوگوں کو کافر، بے دین اور زہریلا سانپ تک کہا جاتا ہے، نیز ان کی مجلسوں میں شریک ہونے سے لوگوں کو روکا جاتا ہے۔

\*\*\* اہل حدیث نام کی ضرورت و اہمیت :

اہل حدیث نام سے اہل حق اور اہل باطل ممتاز ہوتے ہیں۔ یہ نام اس بات کا غماز اور عکاس ہے کہ یہ شخص قرآن و حدیث کو صحابہ کرام اور محدثین عظام کے منہج و فہم کے مطابق سمجھنے والا ہے، انہی کے عقیدہ و عمل کو اپنانے والا ہے، جبکہ اہل الرائے و اہل التقليد سے بری ہے اور سلف صالحین کا ساتھی ہے، نہ کہ مقلدین و متکلمین کا۔ اس نام کے بغیر حق کی تلاش و پہچان ناممکن ہے، کیونکہ ہر گمراہ فرقہ بھی قرآن و سنت کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن اپنے آپ کو اہل حدیث صرف اہل حق ہی کہتے ہیں۔ اس نام کے بغیر حق پر قائم رہنا بھی محال ہے، کیونکہ جو اپنے آپ کو اہل حدیث نہیں کہتا، وہ سلف صالحین اور محدثین کرام کے منہج و فہم دین کا پابند نہیں رہتا۔

اہل حدیث نام اہل حق کے لیے ثبات و یقین کا باعث ہے، کیونکہ محدثین عظام اور سلف صالحین کے اہل حق ہونے میں کوئی شبہ نہیں، وہ نام اور منہج و عمل ہر اعتبار سے اہل



حدیث تھے۔ اگر وہ اہل حق ہیں اور یقیناً اہل حق ہیں، تو ان کے پیروکاروں کے اہل حق ہونے میں شبہ کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سلف صالحین تو حق پر ہوں لیکن ان کے ماننے والے اور ان کے منہج و فہم پر عمل کرنے والے حق پر نہ ہوں؟ اگر سلف صالحین کے پیروکار حق پر نہیں تو اس کا سیدھا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں کوئی بھی حق پر نہیں، کیونکہ سلف کے مخالفین قطعاً حق پر نہیں ہو سکتے۔

اہل حدیث نام ہی وحدت امت کا واحد معتبر ذریعہ ہے، اس کے بغیر امت حق پر مجتمع نہیں ہو سکتی، کیونکہ بقول محدثین فرقہ ناجیہ اور طائفہ منصورہ کا نام اہل حدیث ہی تو ہے۔ لقب اہل حدیث میں دین اسلام کی منقبت ہے اور یہی غلبہ حق کی علامت ہے، کیونکہ اس نام کے ذریعے ائمہ ہدیٰ سے رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اس سے ایوان ظلم و کفر میں بھونچال آتا ہے اور اسی کی وجہ سے اہل حق کو غلبہ نصیب ہوتا ہے، جبکہ اہل باطل کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

جو شخص سلف صالحین کے اجماع کو حق مانتا ہے، وہ اپنا نام اہل حدیث رکھ کر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ محدثین کرام کے اجماع کو حجت سمجھتا ہے۔ اسی لیے ہر دور میں اہل حق اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے تھے اور لوگ انہیں اہل حدیث نام ہی سے پہچانتے تھے۔ اسلامی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ باطل پرستوں نے اپنے آپ کو اہل حدیث کہا ہو۔

معلوم ہوا کہ جو لوگ اہل حدیث نام کا انکار کرتے ہوئے اسے علم و حکمت کے منافی اور تکلف محض قرار دیتے ہیں، وہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ علم و حکمت میں محدثین کرام سے فائق ہیں۔ ان کی ایسی باتیں سراسر محدثین کرام کی گستاخی پر مبنی ہیں۔

اہل حدیث کے دلوں میں بشاشت و اطمینان اور چہروں پر رونق ہوتی ہے۔ ان میں اختلاف شاذ و نادر ہوتا ہے۔ اگر ان میں تھوڑا بہت اختلاف ہو بھی تو وہ عقیدے و منہج کا

نہیں، بلکہ فروغی ہوتا ہے، جو کہ صحابہ کرام کے دور میں بھی موجود تھا۔ جو لوگ اہل حدیث کہلانا ضروری نہیں سمجھتے، وہ ہمیشہ بے یقینی کی کیفیت سے دوچار رہتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً کسی جاہل اور ظالم شخص کو اپنا بڑا سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس کے مرنے کے بعد تتر بتر ہو جاتے ہیں اور شدید اختلافات میں مبتلا ہو کر گمراہ کن نظریات اپنا لیتے ہیں۔ یوں ایسے لوگ حق سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں۔ اہل حدیث نام ہی سلف کے عقیدے اور منہج پر قائم رکھتا ہے۔ اس طرح اہل حدیث ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سلف صالحین کا فہم و منہج راہِ حق پر چلانے کا ضامن ہے۔

بعض لوگ یہ شبہ پیدا کرتے ہیں کہ اہل حدیث نام نہیں رکھنا چاہیے، کیونکہ اس سے فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے، جبکہ دوسری طرف وہ خود اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت، جو اہل حدیث ہی کا دوسرا نام ہے، کہتے ہیں۔ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ طائفہ منصورہ اور فرقہ ناجیہ سلف صالحین اور ائمہ دین کا اجماعی لقب اہل حدیث تھا۔ ان کا یہ اعتراض براہِ راست سلف صالحین پر ہے۔ سلف پر اعتراض کرنے والا کبھی بامراد نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اہل حدیث یا اہل سنت والجماعت کا لقب اختیار کرنے سے فرقہ بندی کو ہوا کیسے ملتی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نعوذ باللہ محدثین عظام اور ائمہ سلف بے خبری میں فرقہ بندی میں مبتلا تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ محدثین فرقہ ضرور تھے، لیکن فرقہ ناجیہ تھے، فرقہ (حق اور دین اسلام سے علیحدگی اختیار کرنے والے) نہیں تھے۔ اہل بدعت نے سلف صالحین کے مقابلے میں عقائد و اصول وضع کیے اور اپنی اس فرقہ پرستی پر لیبل اہل سنت والجماعت کا لگا لیا، اس وجہ سے کیا سلف صالحین کے پیروکاروں کا اپنے آپ کو اہل سنت کہلانا ناجائز ہو جائے گا؟

ہمارے نزدیک محض گمراہ لوگوں کی باتوں میں آکر سلف صالحین، جو ہمارے مقتدا ہیں،

کا نام ترک کر دینا کوئی جرأت مندانہ اقدام نہیں۔ جو شخص اپنا تشخص برقرار نہ رکھ سکے، وہ بزدل اور نالائق ہوتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کو تو مسلمان بھی نہیں کہلانا چاہیے، کیونکہ مسلمان نام پر بھی بعض کفار معترض ہوتے ہیں، جو اتحاد بین المذاہب کا درس دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ خود کو مسلمان اور ہمیں کافر کہتے ہیں۔

اہل حدیث نام قرآن و حدیث کے خلاف نہیں، ورنہ سلف کبھی اپنا نام اہل حدیث نہ رکھتے، کیونکہ وہ بعد والوں سے بڑھ کر قرآن و حدیث کا علم رکھتے تھے۔ ان کے بعد ہر دور میں ان کے پیروکار اپنا یہی نام پکارتے تھے، جیسا کہ:

امام، قوام السنہ، اسماعیل بن محمد اصفہانی (457-535ھ) فرماتے ہیں:

وَالْفِرْقَةُ النَّاجِيَةُ أَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ وَأَصْحَابُ الْحَدِيثِ، وَهُوَ السَّوَادُ الْأَعْظَمُ.

لوگ سوادِ اعظم ہیں۔“ (الحجۃ فی بیان المحجۃ: 409/2)

شیخ الاسلام، تقی الدین، احمد بن عبد الحلیم بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

إِنَّ أَحَقَّ النَّاسِ بِأَنْ تَكُونَ الْفِرْقَةُ النَّاجِيَةُ أَهْلُ الْحَدِيثِ وَالسُّنَّةِ.

”فرقہ ناجیہ ہونے کے سب سے زیادہ حق دار اہل حدیث و اہل سنت ہیں۔“

(مجموع الفتاوی: 347/3)

ہر گمراہ فرقے کی یہ کوشش رہتی ہے کہ محدثین کرام اور سلف صالحین سے لوگوں کا محبت و عقیدت کا رشتہ و ناٹھ ٹوٹ جائے۔ وہ اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اہل حدیث نام نہ رکھا جائے۔ یوں سادہ لوح لوگوں کو بآسانی شکار کر کے اپنی خواہشات کا پیروکار بنا لیتے ہیں۔ جو لوگ اہل حدیث نام کو ناپسند کرتے ہیں اور اسے فرقہ

واریت کے معنی میں لیتے ہیں، فطری طور پر ان کے دلوں میں اہل حدیث کے بارے میں نفرت اور بغض پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ سراسر ہلاکت و بربادی ہے۔

\*\*\*\*\* اہل حدیث سے عداوت اور ان پر بہتان طرازی!

بعض لوگ اہل حدیث کو بدنام کرنے کی کوشش میں جھوٹے عقائد و اعمال ان کی طرف منسوب کرتے ہیں، غلط اور فتنج باتیں ان کے نام لگاتے ہیں یا اہل حدیث جن چیزوں سے بری ہیں، وہ ان پر تھوپ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ڈر جانا چاہیے:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدْ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا﴾ (الأحزاب 33: 58)

”وہ لوگ جو مؤمن مردوں اور عورتوں کو کسی جرم کے بغیر تکلیف دیتے ہیں، وہ بہتان اور صریح گناہ (کا بوجھ اپنے کندھوں پر) اٹھاتے ہیں۔“

مؤمنوں کی طرف یوں غلط باتیں منسوب کرنا کافروں اور رافضیوں کا شیوا ہے، جیسا کہ سنی امام، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (700-774ھ) اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

وَهَذَا هُوَ الْبُهْتُ الْكَبِيرُ أَنْ يُحْكِيَ أَوْ يُنْقَلَ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ مَا لَمْ يَفْعَلُوهُ عَلَى سَبِيلِ الْعَيْبِ وَالتَّنْقِصِ لَهُمْ، وَمِنْ أَكْثَرِ مَنْ يَدْخُلُ فِي هَذَا الْوَعِيدِ الْكُفَرَةُ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ، ثُمَّ الرَّافِضَةُ الَّذِينَ يَتَنَقَّصُونَ الصَّحَابَةَ، وَيَعْيِبُونَهُمْ بِمَا قَدْ بَرَّاهُمُ اللَّهُ مِنْهُ، وَيَصِفُونَهُمْ بِنَقِيضِ مَا أَخْبَرَ اللَّهُ عَنْهُمْ، فَإِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ أَخْبَرَ أَنَّهُ قَدْ رَضِيَ عَنِ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَمَدَحَهُمْ، وَهُؤُلَاءِ الْجَهْلَةُ الْأَغْيَاءُ يَسُبُّونَهُمْ وَيَتَنَقَّصُونَهُمْ، وَيَذْكُرُونَ

عَنْهُمْ مَا لَمْ يَكُنْ وَلَا فَعَلُوهُ أَبَدًا، فَهُمْ فِي الْحَقِيقَةِ مَنكُوسُو الْقُلُوبِ، يَذْمُونَ الْمَمْدُوحِينَ وَيَمْدَحُونَ الْمَذْمُومِينَ .

”یہ بہت بڑا بہتان ہے کہ مومنوں کی عیب جوئی اور تنقیص کے لیے ان کے بارے میں ایسی بات بیان یا نقل کی جائے جس کا انہوں نے ارتکاب نہ کیا ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتے۔ کافروں کے بعد اس کام میں رافضیوں کا نمبر ہے، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تنقیص کرتے ہیں اور ان پر ایسی عیب جوئی کرتے ہیں، جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بری فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ ان کے بارے میں اس کے برعکس بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ وہ مہاجرین و انصار سے راضی ہو گیا ہے اور اللہ نے ان کی تعریف بھی فرمائی ہے، لیکن یہ جاہل اور بے وقوف لوگ ان کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کی گستاخیاں کرتے ہیں اور ان کے بارے میں ایسی باتیں بیان کرتے ہیں، جو کبھی معرض وجود میں آئی ہی نہیں اور جن کا ارتکاب انہوں نے کبھی کیا ہی نہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کی عقل و شعور الٹ ہو گئی ہے، اسی لیے یہ مدوح لوگوں کی مذمت اور مذموم لوگوں کی مدح میں مصروف ہیں۔“

(تفسیر ابن کثیر: 1/480-481، بتحقیق سلامة)

قیامت کے دن خسارہ پانے والے لوگ جہنم سے نکلنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو پکاریں گے، تو اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائے گا:

﴿قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونْ\* إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ\* فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا حَتَّى أَنْسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ\*﴾

إِنِّي جَزَيْتَهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿۱۱۱﴾ (المؤمنون 23 : 108-111)

”اسی میں ذلیل و خوار ہوتے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو۔ بلاشبہ میرے بندوں کا ایک گروہ کہتا تھا کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، ہمیں معاف فرما دے، ہمارے حال پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔ تم نے انہیں مذاق بنا لیا تھا، یہاں تک کہ انہوں (ان سے بغض) نے تمہیں میرا ذکر بھلا دیا اور تم ان سے ہنسی کیا کرتے تھے۔ ان کو میں نے ان کے صبر کی بنا پر آج یہ بدلہ دیا کہ وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔“

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں بھی حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ثُمَّ قَالَ تَعَالَى مُذَكِّرًا لَهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فِي الدُّنْيَا، وَمَا كَانُوا يَسْتَهْزِئُونَ بِعِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ وَأَوْلِيَائِهِ، فَقَالَ: ﴿إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ﴿۱۰۸﴾ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سَخِرِيًّا ﴿۱۰۹﴾ أَيَّ فَسَخَرْتُمْ مِنْهُمْ فِي دُعَائِهِمْ إِيَّايَ وَتَضَرَّعْتُمْ إِلَيَّ، ﴿۱۱۰﴾ حَتَّىٰ أَسْوَكَمُ ذِكْرِي﴾، أَيَّ حَمَلَكُمُ بَغْضَهُمْ عَلَيَّ أَنْ نَسِيتُمْ مُعَامَلَتِي، ﴿۱۱۱﴾ وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضَحَكُونَ﴾، أَيَّ مِنْ صَنِيعِهِمْ وَعِبَادَتِهِمْ، كَمَا قَالَ تَعَالَى: ﴿إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ﴿۱۰۸﴾ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ﴾ (المطففين 83 : 29، 30)، أَيَّ يَلْمِزُونَهُمْ اسْتِهْزَاءً، ثُمَّ أَخْبَرَ عَمَّا جَازَىٰ بِهِ أَوْلِيَائَهُ وَعِبَادَهُ الصَّالِحِينَ، فَقَالَ: ﴿إِنِّي جَزَيْتَهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا﴾، أَيَّ عَلَىٰ أَذَاكُم لَهُمْ وَاسْتِهْزَائِكُمْ مِنْهُمْ، ﴿أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾، أَيَّ جَعَلْتُهُمْ هُمُ الْفَائِزِينَ بِالسَّعَادَةِ وَالسَّلَامَةِ

وَالْجَنَّةِ، النَّاجِينَ مِنَ النَّارِ .

”پھر اللہ تعالیٰ نے ان (مجرموں) کو ان کے دنیاوی گناہ اور اپنے مؤمن بندوں اور اولیاء سے مذاق یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ میرے بندوں کا ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے، ہمیں معاف فرما دے، ہمارے حال پر رحم فرما، تو ہی سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے، تم نے ان لوگوں کو مذاق بنا لیا تھا۔ یعنی ان کے مجھے پکارنے اور میری طرف گریہ وزاری کرنے کو تم نے مذاق کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ان سے بغض رکھنے کی وجہ سے تمہیں میرا معاملہ بالکل بھول گیا اور تم بس ان کی عبادت کا تمسخر اڑانے میں مگن رہنے لگے۔ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ \* وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ﴾ (المطففين 83 : 29، 30) (مجرم لوگ ایمان والوں پر ہنستے تھے اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو مذاق میں ان کی عیب جوئی کرتے تھے)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو دی جانے والی جزا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہاری تکلیفوں اور مذاق پر صبر کی بنا پر میں نے آج ان کو یہ بدلہ دیا کہ وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ میں نے ان کو سعادت، سلامتی اور جنت سے ہمکنار کرتے ہوئے جہنم سے پچا لیا۔“

(تفسیر ابن کثیر : 499/5، بتحقیق سلامة)

معلوم ہوا کہ اہل حدیث کی عیب جوئی کرنا، ان کے بُرے القابات بنانا، ان کے عقائد و اعمال کا تمسخر اڑا کر ان کو اذیت و دُکھ پہنچانا اور ان کی تضحیک و تحقیر مجرمانہ کارروائی ہے۔ ایسے لوگوں کو اہل حق مؤمنین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یاد رکھنا چاہیے :

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الروم 30 : 47)

”مؤمنوں کی مدد کرنا ہمارے اوپر لازم ہے۔“

امام، ابوبکر، عبد اللہ بن سلیمان، ابن ابوداؤد رحمہ اللہ (230-316ھ) فرماتے ہیں:

وَلَا تَكُ مِنْ قَوْمٍ تَلَهُوْا بِدِينِهِمْ

فَتَطْعَنَ فِي أَهْلِ الْحَدِيثِ وَتَقْدَحُ

”(اے مسلمان!) تو اہل حدیث پر طعن و تشنیع کر کے ان لوگوں میں شامل نہ ہو جانا

جنہوں نے اپنے دین کے ساتھ کھیل تماشا کیا۔“ (الشریعة للأجری: 5/2562، بتحقیق الدمیجی)

امام، ابوجعفر، احمد بن سنان، واسطی رحمہ اللہ (م: 259ھ) فرماتے ہیں:

لَيْسَ فِي الدُّنْيَا مُبْتَدِعٌ إِلَّا وَهُوَ يُبْغِضُ أَهْلَ الْحَدِيثِ، فَإِذَا ابْتَدَعَ الرَّجُلُ نَزَعَ حَلَاوَةَ الْحَدِيثِ مِنْ قَلْبِهِ.

”دنیا میں کوئی بدعتی ایسا نہیں، جو اہل حدیث سے بغض نہ رکھتا ہو۔ جب کوئی بندہ بدعتی

بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے حدیث کی حلاوت کھینچ لیتا ہے۔“

(شرف أصحاب الحديث للخطيب، ص: 73، معرفة علوم الحديث للحاكم، ص: 40، وسنده صحيح)

حکم بن ابوفتیلہ نامی شخص کے پاس اہل حدیث کا ذکر ہوا تو وہ کہنے لگا:

أَصْحَابُ الْحَدِيثِ قَوْمٌ سَوَاءٌ .

”اہل حدیث بُرے لوگ ہیں۔“

ابن ابوفتیلہ کی یہ جسارت امام اہل سنت، احمد بن حنبل رحمہ اللہ (164-241ھ) سے ذکر

کی گئی تو بھلا کیا ہوا؟ ثقہ امام محمد بن اسماعیل ترمذی رحمہ اللہ کا بیان سنیں:

فَقَامَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ، وَهُوَ يَنْفُضُ ثَوْبَهُ، فَقَالَ: زَنْدِيقٌ، زَنْدِيقٌ، زَنْدِيقٌ .

”آپ رحمہ اللہ اپنے کپڑے کو جھاڑتے ہوئے کھڑے ہوئے اور فرمایا: یہ بے دین شخص

ہے، یہ بے دین شخص ہے، یہ بے دین شخص ہے۔“

(معرفة علوم الحديث للحاكم، ص: 4، وسنده صحيح)



حافظ، ابو عبد اللہ، حاکم، نیشاپوری، المعروف بہ ابن البیہق رحمہ اللہ (321-405ھ) فرماتے ہیں:

وَعَلَىٰ هَذَا عَهْدُنَا فِي أَسْفَارِنَا وَأَوْطَانِنَا كُلِّ مَنْ يُنْسَبُ إِلَىٰ نَوْعٍ مِّنَ الْإِلْحَادِ وَالْبِدْعِ، لَا يَنْظُرُ إِلَىٰ الطَّائِفَةِ الْمَنْصُورَةِ إِلَّا بِعَيْنِ الْحَقَارَةِ، وَيُسَمِّيْهَا الْحَشَوِيَّةَ.

”ہم نے اپنے سفر و حضر میں ہر گمراہ و بدعتی شخص کو اسی طرح طائفہ منصورہ کو نظر حقارت سے دیکھتے ہوئے پایا ہے۔ یہ لوگ طائفہ منصورہ کا نام حشویہ (ایک گمراہ فرقے کا نام) رکھتے ہیں۔“ (معرفة علوم الحديث، ص: 4)

نیز موصوف خود اہل حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

وَأَهْلُ السُّنَّةِ قَاطِبَةً إِخْوَانُهُمْ، وَأَهْلُ الْإِلْحَادِ وَالْبِدْعِ بِأَسْرِهَا أَعْدَائُهُمْ.

”اہل سنت سارے کے سارے ان کے بھائی ہیں، جبکہ گمراہ و بدعتی تمام کے تمام ان کے دشمن ہیں۔“ (معرفة علوم الحديث، ص: 3)

امام، ابو محمد، عبد اللہ بن مسلم، ابن قتیبہ دینوری رحمہ اللہ (213-276ھ) فرماتے ہیں:

وَلَيْسَ يَدْفَعُ أَصْحَابَ الْحَدِيثِ عَنْ ذَلِكَ إِلَّا ظَالِمٌ، لَأَنَّهُمْ لَا يَرُدُّونَ شَيْئًا مِّنْ أَمْرِ الدِّينِ، إِلَى اسْتِحْسَانٍ، وَلَا إِلَى قِيَاسٍ وَنَظَرٍ، وَلَا إِلَى كُتُبِ الْفَلَاسِفَةِ الْمُتَقَدِّمِينَ، وَلَا إِلَى أَصْحَابِ الْكَلَامِ الْمُتَأَخِّرِينَ.

”اہل حدیث کے اہل حق ہونے کا انکار کوئی ظالم شخص ہی کر سکتا ہے، کیونکہ اہل حدیث کسی بھی دینی معاملے کو (نصوص شرعیہ کی موجودگی میں) استحسان، قیاس یا رائے کی طرف نہیں لے کر جاتے، نہ وہ دینی معاملات میں متقدمین فلاسفہ اور متاخرین اہل کلام کی کتب سے رجوع کرتے ہیں۔“

(تأويل مختلف الحديث في الرد على أعداء أهل الحديث، ص: 83)

علامہ، ابو محمد، حسن بن عبد الرحمن رامہری رحمہ اللہ (م: 360ھ) فرماتے ہیں:

اعْتَرَضَتْ طَائِفَةٌ مِّمَّنْ يَشْنَأُ الْحَدِيثَ وَيُبْغِضُ أَهْلَهُ، فَقَالُوا بِنْتَقِصُ أَصْحَابِ  
الْحَدِيثِ وَالْإِزْرَاءِ بِهِمْ، وَأَسْرَفُوا فِي ذَمِّهِمْ وَالتَّقْوِلِ عَلَيْهِمْ، وَقَدْ شَرَّفَ اللَّهُ  
الْحَدِيثَ وَفَضَّلَ أَهْلَهُ، وَأَعْلَى مَنْزِلَتَهُ، وَحَكَّمَهُ عَلَى كُلِّ نَحْلَةٍ، وَقَدَّمَهُ عَلَى كُلِّ  
عِلْمٍ، وَرَفَعَ مِنْ ذِكْرِ مَنْ حَمَلَهُ وَعَنِى بِهِ، فَهُمْ يَبْغِضُ الدِّينَ وَمَنَارَ الْحُجَّةِ.

”ایک گروہ اٹھا ہے جو حدیث اور اہل حدیث سے بغض رکھتا ہے، انہوں نے اہل حدیث کی تنقیص اور گستاخی شروع کی ہوئی ہے، یہ لوگ ان کی مذمت کرنے اور ان پر بہتان لگانے میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حدیث کو شرف بخشا اور اہل حدیث کو فضیلت عطا فرمائی، اس نے حدیث کا مرتبہ بلند کیا، اسے ہر ملت پر حاکم بنایا، اسے ہر علم پر فوقیت بخشی اور جو لوگ حدیث کو سیکھتے اور اس سے لگاؤ رکھتے ہیں، ان کو بھی ارفع مقام عطا فرمایا۔ یہی لوگ دین کی بنیاد اور دلیل و حجت کے مینار ہیں۔“

(المحدث الفاضل بين الراوي والواعي، ص: 4)

## اہل حدیث ہی اہل حق ہیں

عقل صریح، نقل صحیح اور مقبول و منصور دین صرف اہل حدیث کے پاس ہے۔ ویسے تو ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پرست کہتا ہے، لیکن معیار حق پر پورا صرف اہل حدیث اترتے ہیں۔ کوئی بجا طور پر پوچھ سکتا ہے کہ اہل حدیث ہی اہل حق ہیں، اس کی دلیل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ، ابو مظفر، منصور بن محمد، سمعانی رحمہ اللہ (426-489ھ) فرماتے ہیں:

إِنَّ كُلَّ فَرِيقٍ مِّنَ الْمُبْتَدِعَةِ إِنَّمَا يَدَّعِي أَنَّ الَّذِي يَعْتَقِدُهُ هُوَ مَا كَانَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لِأَنَّهُمْ كُلُّهُمْ مَدَّعُونَ شَرِيعَةَ

الإِسْلَام، مُلتَزِمُونَ فِي الظَّاهِرِ شَعَائِرَهَا، يَرُونَ أَنَّ مَا جَاءَ بِهِ مُحَمَّدٌ (هُوَ الْحَقُّ)، غَيْرَ أَنَّ الطَّرِيقَ تَفَرَّقَتْ بِهِمْ بَعْدَ ذَلِكَ، وَأَحْدَثُوا فِي الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ وَرَسُولُهُ، فَزَعَمَ كُلُّ فَرِيقٍ أَنَّهُ هُوَ الْمُتَمَسِّكُ بِشَرِيعَةِ الْإِسْلَامِ، وَأَنَّ الْحَقَّ الَّذِي قَامَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ هُوَ الَّذِي يَعْتَقِدُهُ وَيَنْتَحِلُهُ، غَيْرَ أَنَّ اللَّهَ أَبَى أَنْ يَكُونَ الْحَقَّ وَالْعَقِيدَةَ الصَّحِيحَةَ إِلَّا مَعَ أَهْلِ الْحَدِيثِ وَالْأَثَارِ، لِأَنَّهُمْ أَخَذُوا دِينَهُمْ وَعَقَائِدَهُمْ خَلْفًا عَنْ سَلَفٍ، وَقَرْنَا عَنْ قَرْنٍ، إِلَى أَنْ انْتَهَوْا إِلَى التَّابِعِينَ، وَأَخَذَهُ التَّابِعُونَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَخَذَهُ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَا طَرِيقَ إِلَى مَعْرِفَةِ مَا دَعَا إِلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ مِنَ الدِّينِ الْمُسْتَقِيمِ، وَالصِّرَاطِ الْقَوِيمِ، إِلَّا هَذَا الطَّرِيقَ الَّذِي سَلَكَهَ أَصْحَابُ الْحَدِيثِ، وَأَمَّا سَائِرُ الْفِرَقِ فَطَلَبُوا الدِّينَ لَا بِطَرِيقِهِ لِأَنَّهُمْ رَجَعُوا إِلَى مَعْقُولِهِمْ، وَخَوَاطِرِهِمْ، وَآرَائِهِمْ، فَطَلَبُوا الدِّينَ مِنْ قَبْلِهِ، فَإِذَا سَمِعُوا شَيْئًا مِنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ عَرَضُوهُ عَلَى مِغْيَارِ عُقُولِهِمْ، فَإِنْ اسْتَقَامَ قَبْلُوهُ، وَإِنْ لَمْ يَسْتَقِمْ فِي مِيزَانِ عُقُولِهِمْ رَدُّوهُ، فَإِنْ اضْطُرُّوا إِلَى قُبُولِهِ حَرَّفُوهُ بِالتَّأْوِيلَاتِ الْبَعِيدَةِ، وَالْمَعَانِي الْمُسْتَكْرَهَةِ، فَحَادُّوا عَنِ الْحَقِّ وَزَاغُوا عَنْهُ، وَنَبَذُوا الدِّينَ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ، وَجَعَلُوا السُّنَّةَ تَحْتَ أَقْدَامِهِمْ، تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يَصِفُونَ، وَأَمَّا أَهْلُ الْحَقِّ فَجَعَلُوا

الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ إِمَامَهُمْ، وَطَلَبُوا الدِّينَ مِنْ قِبَلِهِمَا، وَمَا وَقَعَ لَهُمْ مِّنْ مَّعْقُولِهِمْ وَخَوَاطِرِهِمْ، عَرَضُوهُ عَلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، فَإِنْ وَجَدُوهُ مُوَافِقًا لَّهُمَا قَبِلُوهُ، وَشَكَرُوا اللَّهَ حَيْثُ أَرَاهُمْ ذَلِكَ وَوَفَّقَهُمْ إِلَيْهِ، وَإِنْ وَجَدُوهُ مُخَالِفًا لَّهُمَا تَرَكَوْا مَا وَقَعَ لَهُمْ، وَأَقْبَلُوا عَلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، وَرَجَعُوا بِالتُّهْمَةِ عَلَى أَنْفُسِهِمْ، فَإِنَّ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ لَا يَهْدِيَانِ إِلَّا إِلَى الْحَقِّ، وَرَأَى الْإِنْسَانُ قَدْ يَرَى الْحَقَّ، وَقَدْ يَرَى الْبَاطِلَ .

”ہر گمراہ فرقہ یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا عقیدہ وہ ہے، جس پر رسول اللہ ﷺ کا رُند تھے، کیونکہ تمام فرقے شریعتِ اسلام ہی کے دعویدار ہیں اور ظاہری طور پر اسلام ہی کے شعائر پر عمل کرتے ہیں، نیز ان کا یہ عقیدہ ہے کہ محمد ﷺ کی تعلیمات ہی برحق ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی راہیں (صراطِ مستقیم سے) جدا ہو گئیں اور انہوں نے دین میں وہ وہ چیزیں ایجاد کر لیں جن کی اللہ و رسول نے اجازت نہیں دی۔ ہر فریق نے یہ دعویٰ کیا کہ وہی شریعتِ اسلام پر کاربند ہے اور وہ حق جسے رسول اللہ ﷺ لے کر آئے، اسی کے پاس ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے حق اور صحیح عقیدے کی دولت سے صرف اہل حدیث کو مالا مال کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل حدیث اپنا دین اور اپنے عقائد طبقہ در طبقہ سلف صالحین سے لیتے رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کا سلسلہ تابعین عظام تک پہنچ گیا۔ تابعین نے دین و عقائد رسول اکرم ﷺ کے صحابہ کرام سے لیے اور صحابہ کرام نے رسول اکرم ﷺ سے یہ سب کچھ سیکھا۔ آپ ﷺ نے جس مضبوط دین اور صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دی تھی، اس کی معرفت صرف اسی طریقے سے ممکن ہے، جسے اہل حدیث نے اپنایا ہے۔ باقی تمام فرقوں نے دین کو اس اصل طریقے سے نہیں، بلکہ اپنی عقل و شعور اور رائے سے اخذ کیا ہے۔ چنانچہ

جب وہ کتاب و سنت کی کسی نص کو سنتے ہیں تو اسے اپنی عقلی کسوٹی پر پیش کرتے ہیں، اگر وہ اس معیار پر درست معلوم ہو تو اسے قبول کر لیتے ہیں، ورنہ رد کر دیتے ہیں۔ اگر وہ کسی وجہ سے اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں تو بعد از کار تاویلات اور غلط معانی کے ذریعے اس میں تحریف پر اتر آتے ہیں۔ یوں یہ باقی فرقے حق سے دُور چلے گئے ہیں، انہوں نے دین کو پس پشت ڈال دیا ہے اور سنتِ رسول کو بے وقعت کر دیا ہے۔ ان کے برعکس اہل حق نے کتاب و سنت کو اپنا پیشوا اور دین کا ماخذ بنایا ہے۔ ان کی عقل اور رائے جو اختراع کرتی ہے، وہ اسے کتاب و سنت پر پیش کرتے ہیں، اگر اسے کتاب و سنت کے موافق پائیں تو اسے قبول کر کے اللہ کا شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے انہیں درست رائے قائم کرنے کی توفیق بخشی اور اگر وہ اپنی رائے کو کتاب و سنت کے مخالف پائیں تو اسے چھوڑ کر کتاب و سنت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو قصور وار ٹھہراتے ہیں، کیونکہ کتاب و سنت تو حق ہی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، جبکہ عقلِ انسانی کبھی حق کو پاتی ہے اور کبھی باطل کو۔“

(الحجّة في بيان المحجّة لأبي القاسم الأصبهاني: 2/237-238)

نیز فرماتے ہیں: وَمِمَّا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ أَهْلَ الْحَدِيثِ هُمْ عَلَى الْحَقِّ، أَنَّكَ لَوْ طَالَعْتَ جَمِيعَ كُتُبِهِمُ الْمُصَنَّفَةَ مِنْ أَوَّلِهِمْ إِلَى آخِرِهِمْ، قَدِيمِهِمْ وَحَدِيثِهِمْ مَعَ اخْتِلَافِ بُلْدَانِهِمْ وَزَمَانِهِمْ، وَتَبَاعُدِ مَا بَيْنَهُمْ فِي الدِّيَارِ، وَسُكُونِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ قُطْرًا مِّنَ الْأَقْطَارِ، وَجَدْتَهُمْ فِي بَيَانِ الْإِعْتِقَادِ عَلَى وَتِيرَةٍ وَاحِدَةٍ وَنَمَطٍ وَاحِدٍ، يَجْرُونَ فِيهِ عَلَى طَرِيقَةٍ لَا يَحِيدُونَ عَنْهَا، وَلَا يَمِيلُونَ فِيهَا، قَوْلُهُمْ فِي ذَلِكَ وَاحِدٌ وَنَقْلُهُمْ وَاحِدٌ، لَا تَرَى بَيْنَهُمْ اخْتِلَافًا وَلَا تَفَرُّقًا فِي شَيْءٍ مَّا وَإِنْ قَلَّ، بَلْ لَوْ جَمَعْتَ جَمِيعَ مَا

جَرَى عَلَى أَلْسِنَتِهِمْ، وَنَقَلُوهُ عَنْ سَلَفِهِمْ، وَجَدْتَهُ كَأَنَّهُ جَاءَ مِنْ قَلْبٍ وَاحِدٍ، وَجَرَى عَلَى لِسَانٍ وَاحِدٍ، وَهَلْ عَلَى الْحَقِّ دَلِيلٌ أَبِينُ مِنْ هَذَا؟

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾ (النساء 4 : 82)، وَقَالَ تَعَالَى: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ (آل عمران 3 : 103)، وَأَمَّا إِذَا نَظَرْتَ إِلَى أَهْلِ الْأَهْوَاءِ وَالْبِدَعِ، رَأَيْتَهُمْ مُتَفَرِّقِينَ مُخْتَلِفِينَ أَوْ شِيعًا وَأَحْزَابًا، لَا تَكَادُ تَجِدُ اثْنَيْنِ مِنْهُمْ عَلَى طَرِيقَةٍ وَاحِدَةٍ فِي الْإِعْتِقَادِ، يُبَدِّعُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا، بَلْ يَرْتَقُونَ إِلَى التَّكْفِيرِ، يُكْفِرُ الْإِبْنُ أَبَاهُ، وَالرَّجُلُ أَخَاهُ، وَالْجَارُ جَارَهُ، تَرَاهُمْ أَبَدًا فِي تَنَازُعٍ وَتَبَاغُضٍ وَاخْتِلَافٍ، تَنْقُضِي أَعْمَارَهُمْ وَلَمَّا تَتَّفِقْ كَلِمَاتِهِمْ، ﴿تَحْسِبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ﴾ (الحشر 59 : 14)، أَوْ مَا سَمِعْتَ أَنَّ الْمُعْتَرِلَةَ مَعَ اجْتِمَاعِهِمْ فِي هَذَا اللَّقَبِ يُكْفِرُ الْبَغْدَادِيُّونَ مِنْهُمْ الْبَصَرِيِّينَ، وَالْبَصَرِيُّونَ مِنْهُمْ الْبَغْدَادِيِّينَ، وَيُكْفِرُ أَصْحَابُ أَبِي عَلِيٍّ الْجَبَائِيَّ ابْنَهُ أَبَا هَاشِمٍ، وَأَصْحَابُ أَبِي هَاشِمٍ يُكْفِرُونَ أَبَاهُ أَبَا عَلِيٍّ، وَكَذَلِكَ سَائِرُ رُؤُوسِهِمْ وَأَرْبَابُ الْمَقَالَاتِ مِنْهُمْ، إِذَا تَذَكَّرْتَ أَقْوَالَهُمْ رَأَيْتَهُمْ مُتَفَرِّقِينَ يُكْفِرُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا، وَيَتَبَرَّأُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ، كَذَلِكَ الْخَوَارِجُ وَالرَّوَافِضُ فِيمَا بَيْنَهُمْ وَسَائِرُ الْمُبْتَدِعَةِ بِمَثَابَتِهِمْ، وَهَلْ عَلَى الْبَاطِلِ دَلِيلٌ أَظْهَرُ مِنْ هَذَا؟

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى : ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ﴾ (الأنعام 6 : 159)، وَكَانَ السَّبَبُ فِي اتِّفَاقِ أَهْلِ الْحَدِيثِ أَنَّهُمْ أَخَذُوا الدِّينَ مِنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَطَرِيقِ النَّقْلِ، فَأَوْرَثَهُمُ الْإِتِّفَاقَ وَالِاتِّبَالَ، وَأَهْلُ الْبِدْعَةِ أَخَذُوا الدِّينَ مِنَ الْمَعْقُولَاتِ وَالْأَرَءِ، فَأَوْرَثَهُمُ الْإِفْتِرَاقَ وَالِاخْتِلَافَ، فَإِنَّ النَّقْلَ وَالرِّوَايَةَ مِنَ الثِّقَاتِ وَالْمُتَّقِينَ قَلَمًا يَخْتَلِفُ، وَإِنْ اخْتَلَفَ فِي لَفْظٍ أَوْ كَلِمَةٍ، فَذَلِكَ اخْتِلَافٌ لَا يَضُرُّ الدِّينَ، وَلَا يَقْدَحُ فِيهِ، وَأَمَّا دَلَائِلُ الْعَقْلِ فَقَلَمًا تَتَّفَقُ، بَلْ عَقْلٌ كُلٌّ وَاحِدٌ؛ يَرَى صَاحِبُهُ غَيْرَ مَا يَرَى الْآخَرُ، وَهَذَا بَيِّنٌ.

”اہل حدیث کے اہل حق ہونے کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ اگر آپ ان کی اول و آخر اور قدیم و جدید تمام کتابوں کا مطالعہ کر لیں، تو باوجود ان کے علاقوں اور زمانوں کے مختلف ہونے اور ان کے باہمی فاصلوں اور دنیا کے مختلف کونوں میں رہائش پذیر ہونے کے، آپ ان کو ایک ہی طرز اور طریقے پر عقائد کا بیان کرتے پائیں گے، ان کا منہج ایک ہی ہوگا، جس سے وہ کبھی نہیں ہٹیں گے۔ عقائد میں ان کا قول اور دلیل ایک ہی ہوگی، ان کے مابین کوئی معمولی سا اختلاف و انتشار بھی آپ تلاش نہیں کر سکتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات کہ اگر آپ ان کی زبانوں سے نکلے ہوئی اور ان کی اپنے سلف سے نقل کردہ تمام باتیں جمع کر لیں، تو آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ وہ ایک ہی دل سے نکل کر ایک ہی زبان پر جاری ہوئی ہیں۔ کیا کسی کے حق ہونے پر اس سے بڑھ کر بھی کوئی دلیل ہوگی؟

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : ﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ

غَيْرِ اللَّهِ لَوْ جَدُّوْا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿النساء 4 : 82﴾ (کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے، اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)۔ نیز فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ (آل عمران 3 : 103) (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو)۔ اس کے برعکس جب آپ اہل بدعت کو دیکھیں گے تو ان کو تفرقہ و اختلاف میں مبتلا اور گروہوں میں بٹے ہوئے پائیں گے۔ عقائد کے معاملے میں ان میں سے کسی دو کو بھی آپ کسی ایک منہج پر متفق نہیں پائیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے ایک دوسرے کو بدعتی کہتا ہے، بلکہ وہ ایک دوسرے کی تکفیر تک پہنچ جاتے ہیں۔ بیٹا اپنے باپ کو، بھائی اپنے بھائی کو اور پڑوسی اپنے پڑوسی کو کافر قرار دیتا نظر آتا ہے۔ وہ ہمیشہ جھگڑے اور بغض و عناد میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کی عمریں گزر جاتی ہیں، لیکن کسی ایک بات پر جمع نہیں ہو پاتے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ﴾ (الحشر 59 : 14) (آپ انہیں متفق سمجھتے ہیں، لیکن ان کے دل جدا جدا ہیں، اس لیے کہ یہ بے شعور قوم ہیں)۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ تمام معتزلہ لقبِ اُعتزال میں متحد تھے، اس کے باوجود بغداد کے معتزلہ بصرہ کے معتزلہ کو کافر کہتے ہیں اور بصرہ والے بغداد والوں کو، ابو علی جبائی کے اصحاب اس کے بیٹے ابو ہاشم کو کافر کہتے ہیں اور ابو ہاشم کے اصحاب اس کے باپ ابو علی کو کافر قرار دیتے ہیں۔ یہی حال ان کے باقی اکابر اور اہل قلم کا ہے۔ جب آپ گمراہ لوگوں کے اقوال پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ متفرق ہیں، ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں اور ایک دوسرے سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ خوارج، روافض اور تمام اہل بدعت کی صورتِ حال ایسی ہی ہے۔ کیا ان کے باطل ہونے پر اس سے بھی بڑی کوئی



دلیل ہوگی؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَّسْتُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ﴾ (الأنعام 6 : 159) (بلاشبہ جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہوں میں بٹ گئے، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کا معاملہ تو اللہ ہی کے سپرد ہے)۔ اہل حدیث کے متفق ہونے کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنا دین کتاب و سنت سے نقل درنقل کے ذریعے اخذ کیا ہے۔ قرآن و سنت نے ان میں اتفاق و اتحاد پیدا کر دیا، جبکہ اہل بدعت نے اپنا دین عقل اور رائے سے اخذ کیا اور عقل و رائے نے ان میں تفرقہ و اختلاف پیدا کیا۔ کیونکہ ثقہ و با اعتماد راویوں کی نقل و روایت میں کم ہی اختلاف ہوتا ہے اور جو اختلاف ہوتا ہے، وہ بھی لفظی ہوتا ہے، جو کہ دین میں مضر اور قابل قدغن نہیں ہوتا۔ اس کے بالمقابل عقلی دلائل کم ہی متفق ہوتے ہیں، بلکہ ہر شخص کی عقل وہ سوچتی ہے جو دوسرے نہیں سوچتے۔ یہ بالکل واضح بات ہے۔“

(الحجة في بيان المحجة لأبي القاسم الأصبهاني: 2/ 239-241)

مشہور تابعی، امام قتادہ بن دعامہ رحمہ اللہ (61-118ھ) نے کیا خوب فرمایا ہے:

وَلَعَمْرِي! لَوْ كَانَ أَمْرُ الْخَوَارِجِ هُدًى لَّاجْتَمَعَ، وَلَكِنَّهُ كَانَ ضَلَالَةً فَتَفَرَّقَ.

”قسم ہے، اگر خوارج ہدایت پر ہوتے تو وہ متفق ہوتے، لیکن وہ گمراہی پر تھے، اس لیے تفرقے میں پڑ گئے۔“ (تفسیر عبد الرزاق: 375، تفسیر الطبري: 3/ 178، وسنده صحيح)

امام، ابو محمد، عبد اللہ بن مسلم، ابن قتیبہ دینوری رحمہ اللہ (213-276ھ) فرماتے ہیں:

وَلَوْ أَرَدْنَا - رَحِمَكَ اللَّهُ - أَنْ نَنْتَقِلَ عَنْ أَصْحَابِ الْحَدِيثِ وَنَرْغَبَ عَنْهُمْ، إِلَى أَصْحَابِ الْكَلَامِ وَنَرْغَبَ فِيهِمْ، لَخَرَجْنَا مِنْ اجْتِمَاعٍ إِلَى تَشَتُّتٍ، وَعَنْ نِظَامٍ إِلَى تَفَرُّقٍ، وَعَنْ أُنْسٍ إِلَى وَحْشَةٍ، وَعَنِ اتِّفَاقٍ إِلَى اخْتِلَافٍ.

”اگر (بافرض) ہم اہل حدیث کو چھوڑ کر اہل کلام (اہل رائے) میں شامل ہو جائیں تو یقیناً ہم اجتماعیت کو چھوڑ کر انتشار میں، نظم کو چھوڑ کر تفرقے میں، محبت کو چھوڑ کر نفرت میں اور اتفاق کو چھوڑ کر اختلاف میں داخل ہو جائیں گے۔“ (تأویل مختلف الحديث، ص: 16)

شیخ الاسلام، تقی الدین، احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ رحمہ اللہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

وَبِالْجُمْلَةِ فَالْثَّبَاتُ وَالِاسْتِقْرَارُ فِي أَهْلِ الْحَدِيثِ وَالسُّنَّةِ أَضْعَافُ أَضْعَافٍ أَضْعَافٍ مَا هُوَ عِنْدَ أَهْلِ الْكَلَامِ وَالْفَلَسَفَةِ.

”الغرض اہل حدیث ثبات و استقامت میں اہل کلام و فلسفہ سے کئی گنا زیادہ پختہ ہوتے ہیں۔“ (مجموع الفتاوی: 51-50/4)

نیز فرماتے ہیں:

وَلَيْسَ لِأَحَدٍ أَنْ يَنْصَبَ لِلْأُمَّةِ شَخْصًا يَدْعُو إِلَى طَرِيقَتِهِ وَيُوَالِي وَيُعَادِي عَلَيْهِ غَيْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَا يَنْصَبَ لَهُمْ كَلَامًا يُوَالِي عَلَيْهِ وَيُعَادِي غَيْرَ كَلَامِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَا اجْتَمَعَتْ عَلَيْهِ الْأُمَّةُ، بَلْ هَذَا مِنْ فِعْلِ أَهْلِ الْبِدْعِ الَّذِينَ يَنْصُبُونَ لَهُمْ شَخْصًا أَوْ كَلَامًا يُقَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْأُمَّةِ يُوَالُونَ بِهِ عَلَى ذَلِكَ الْكَلَامِ أَوْ تِلْكَ النَّسَبَةِ وَيُعَادُونَ.

”کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ امت کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی ایک شخص کو متعین کرے اور اسی کے راستے کی دعوت دے، نیز اسی کو محبت و نفرت کا معیار بنائے۔ نہ کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اللہ و رسول کے قول اور اجماع امت کے علاوہ کسی اور کلام کو متعین کر کے اسے محبت و عداوت کا معیار بنائے۔ ایسا کرنا تو ان بدعتی لوگوں کا شیوا ہے جو کسی (امتی کی) کلام اور نسبت کی بنا پر محبت و عداوت کا اظہار کرتے ہیں۔“

(مجموع الفتاوی: 164/20، درء تعارض العقل والنقل: 272/1)

نیز فرماتے ہیں: شِعَارُ الطَّائِفَةِ النَّاجِيَةِ هُوَ السُّنَّةُ وَالْجَمَاعَةُ، دُونَ الْبِدْعَةِ وَالْفِرْقَةِ. ”نجات پانے والی جماعت کا شعار سنت اور اجتماعیت ہے،

نہ کہ بدعت اور تفرقہ۔“ (بیان تلبیس الجہمیۃ: 310/2)

مزید فرماتے ہیں: الْبِدْعَةُ مَقْرُونَةٌ بِالْفِرْقَةِ، كَمَا أَنَّ السُّنَّةَ مَقْرُونَةٌ بِالْجَمَاعَةِ، فَيَقَالُ: أَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ، كَمَا يَقَالُ: أَهْلُ الْبِدْعَةِ وَالْفِرْقَةِ.

”بدعت اور تفرقہ لازم و ملزوم ہے، جیسا کہ سنت اور اجتماعیت لازم و ملزوم ہے۔ ویسے بھی اہل علم اہل سنت کے ساتھ [والجماعة] کا لفظ بولتے ہیں اور اہل بدعت کے ساتھ [والفرقة] (تفرقہ بازی) کا اطلاق کرتے ہیں۔“ (الاستقامة: 42/1)

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن و حدیث نے فرقہ سے منع نہیں کیا، فرقہ سے منع کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ (آل عمران 3: 103)

”اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں مت پڑو۔“

اسی طرح رسول کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَتَفْتَرِقَنَّ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً، وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ، وَثِنْتَانِ وَسَبْعُونَ فِي النَّارِ»، قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ هُمْ؟ قَالَ: «الْجَمَاعَةُ».

”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ محمد ﷺ جان ہے! ضرور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے ایک فرقہ جنتی اور باقی بہتر (72) جہنمی ہوں گے۔“ [آپ سے سوال

کیا گیا کہ اللہ کے رسول! وہ جنتی فرقہ کن لوگوں پر مشتمل ہوگا؟ [فرمایا: وہ جماعت ہوں گے۔“

(سنن ابن ماجہ : 3992، وسندہ صحیح)

اس حدیث سے امت محمدیہ ﷺ کا تہتر فرقوں میں بٹنا اور ایک فرقے کا جنتی ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ فرقہ، گروہ یا جماعت مطلقاً ممنوع نہیں، ورنہ ایک فرقہ جنتی کیسے؟ بہتر فرقے کس جرم کی پاداش میں جہنمی بنیں گے؟ ناجی فرقے کا کیا منہج ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں:

امام، ابو حاتم، محمد بن حبان، ابن حبان، تیمی رحمہ اللہ (م: 354ھ) فرماتے ہیں:

إِنَّ مَنْ وَاظَبَ عَلَى السُّنَنِ، قَالَ بِهَا، وَلَمْ يُعْرِجْ عَلَى غَيْرِهَا مِنَ الْأَرَاءِ مِنَ الْفِرْقَةِ النَّاجِيَةِ فِي الْقِيَامَةِ، جَعَلَنَا اللَّهُ مِنْهُمْ بِمَنَّةٍ.

”جو شخص سنت کی پابندی کرتا ہے، سنت ہی کے مطابق اپنا مذہب بناتا ہے اور سنت کو چھوڑ کر آراء پر عمل نہیں کرتا، وہ قیامت کے دن فرقہ ناجیہ میں سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں بھی اس میں شامل فرمائے۔“ (صحیح ابن حبان 180/1)

علامہ، ابراہیم بن موسیٰ، شاطبی رحمہ اللہ (م: 790ھ) فرماتے ہیں:

إِنَّ الْجَمَاعَةَ مَا كَانَ عَلَيْهِ النَّبِيُّ وَأَصْحَابُهُ وَالتَّابِعُونَ لَهُمْ بِإِحْسَانٍ.

”نجات پانے والی جماعت ان لوگوں پر مشتمل ہوگی، جو نبی اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور

تابعین عظام کے بتائے ہوئے طریقے پر قائم رہے۔“ (الاعتصام 28/1)

شیخ الاسلام، تقی الدین، احمد بن عبد الحلیم بن تیمیہ رحمہ اللہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

فَإِذَا كَانَ وَصَفُ الْفِرْقَةِ النَّاجِيَةِ اتَّبَاعَ الصَّحَابَةِ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَذَلِكَ شِعَارُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ، كَانَتِ الْفِرْقَةُ النَّاجِيَةُ هُمْ أَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ، فَالسُّنَّةُ مَا كَانَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

هُوَ وَأَصْحَابُهُ عَلَيْهِ فِي عَهْدِهِ .

”جب (حدیث میں) فرقہ ناجیہ کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ صحابہ کرام کے رسول اکرم ﷺ کے عہد میں اپنائے گئے طریقے کی پیروی کریں گے اور یہ طریقہ اہل سنت والجماعت ہی کا ہے، تو فرقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت ہی ہوئے۔ سنت اس طریقے کو کہتے ہیں، جس پر آپ ﷺ خود اور آپ ﷺ کے عہد میں صحابہ کرام کاربند تھے۔“ (منہاج السنّة: 457/3)

علامہ، عبید اللہ بن محمد عبد السلام، مبارکپوری رحمہ اللہ (1327-1414ھ) فرماتے ہیں:

«وَهِيَ الْجَمَاعَةُ»، أَيِ الْمُوَافِقُونَ لِجَمَاعَةِ الصَّحَابَةِ الْآخِذُونَ بِعَقَائِدِهِمْ، الْمُتَمَسِّكُونَ بِطَرِيقَتِهِمْ، وَهُمْ أَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ، أَيِ أَصْحَابِ الْحَدِيثِ الَّذِينَ اجْتَمَعُوا عَلَى اتِّبَاعِ آثَارِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جَمِيعِ الْأَحْوَالِ، وَاتَّفَقُوا عَلَى الْآخِذِ بِتَعَامُلِ الصَّحَابَةِ وَاجْتِمَاعِهِمْ، وَلَمْ يَبْتَدِعُوا بِالتَّحْرِيفِ وَالتَّغْيِيرِ، وَلَمْ يُبَدِّلُوا بِالْأَرَاءِ الْفَاسِدَةِ .

”حدیث نبوی کے مطابق کامیاب ہونے والی جماعت میں وہ لوگ شامل ہوں گے، جو صحابہ کرام کی جماعت کے پیروکار ہوں گے، یعنی انہی کے عقائد اپنائیں گے اور انہی کے منہج کو لازم پکڑیں گے۔ یہ لوگ اہل سنت والجماعت، یعنی اہل حدیث ہی ہیں، جو کہ ہر حال میں آپ ﷺ کی احادیث پر عمل کرنے پر متفق ہیں، نیز صحابہ کرام کے تعامل اور اجماع کو اپنانے پر بھی مجتمع ہیں۔ انہوں نے تحریف و تبدل کے ذریعے نہ کوئی بدعت اختیار کی ہے اور نہ فاسد آراء کے ذریعے دین میں کوئی تبدیلی کی ہے۔“

(مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: 278/1)



## اولیاء اللہ کے نام کی نذر و نیاز شرعی میزان میں

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

نذر و نیاز عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی جائز ہے۔ مخلوق کے نام پر نذر کرنا حرام اور شرک ہے۔ اگر کوئی انسان کسی بزرگ یا ولی کے نام پر منت یا نذر کرتا ہے، صالحین اور اولیاء اللہ کی قبروں پر چڑھاوے چڑھاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسے صاحبِ قبر کا تقرب حاصل ہو جائے گا، وہ اس کی مشکل کشائی اور حاجت روائی کرے گا یا اس کی فریاد رسی یا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی سفارش کرے گا، یا وہ اس کی قبر سے فیض پائے گا۔ بلا شک و شبہ یہ شرک فی العبادت ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَى شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾

(الأنعام 6 : 136)

”انہوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور چوپائیوں میں سے اللہ کے لیے ایک حصہ مقرر کیا، پھر بزعمِ خویش کہنے لگے: یہ اللہ کے لیے ہے، اور یہ ہمارے دیوتاؤں کے لیے ہے، پھر ان کے دیوتاؤں کا حصہ تو اللہ کے پاس نہیں پہنچتا، لیکن اللہ کا حصہ ان کے دیوتاؤں کے پاس پہنچ جاتا ہے، یہ لوگ کس قدر برا فیصلہ کرتے ہیں۔“

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللَّهِ﴾ (البقرة 2 : 173)

”اور وہ چیز (بھی حرام ہے) جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔“



مزاروں اور آستانوں پر نذر کے نام پر مشرکانہ و ہندوانہ رسومات اور نفسانی و حیوانی خواہشات کی تکمیل جس انداز میں ہوتی ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس کے باوجود بعض لوگوں نے عوام کا قیمتی مال ہڑپ کرنے کے لیے قبروں پر نذر و نیاز کا جواز پیش کیا ہے۔ ایسی ہی کوشش کرتے ہوئے امام بریلویت جناب احمد یار خان نعیمی (1324-1391ھ) لکھتے ہیں:

”اولیاء اللہ کے نام کی جو نذر مانی جاتی ہے، یہ نذر شرعی نہیں، نذر لغوی ہے، جس کے معنی ہیں نذرانہ، جیسے کہ میں اپنے استاذ سے کہوں کہ یہ آپ کی نذر ہے، یہ بالکل جائز ہے۔ اور فقہاء اس کو حرام کہتے ہیں، جو کہ اولیاء کے نام کی نذر شرعی مانی جائے۔ اس لیے فرماتے ہیں تَقَرُّبًا إِلَيْهِمْ۔ نذر شرعی عبادت ہے، وہ غیر اللہ کے لیے ماننا یقیناً کفر ہے۔“

(”جاء الحق“: 307/1)

حالانکہ یہ کہنا کہ ”اولیاء اللہ کے نام کی جو نذر مانی جاتی ہے، وہ نذر شرعی نہیں، لغوی ہے“ محض ناخواندہ حواریوں کو مطمئن کر کے اسباب شکم پروری کو دوام بخشنے کی نامراد کاوش ہے۔ نذر کی لغوی اور اصطلاحی تقسیم ایسی فتیج بدعت ہے، جو اہل سنت والجماعت کی کتب میں کہیں مذکور نہیں۔ کیا رسول اللہ ﷺ سے بھی کوئی بزرگ ہستی مخلوق میں موجود ہے؟ اور کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اکرم ﷺ سے اتنی بھی محبت نہیں رکھتے تھے، جتنی بعد کے لوگوں کو اپنے بعد والے بزرگوں سے ہے؟ کیا کبھی کسی قبر پرست نے غور کیا کہ اگر غیر اللہ اور فوت شدگان کے نام پر نذر و نیاز جائز ہوتی، تو صحابہ کرام اس کار خیر سے کبھی محروم نہ رہتے۔ کیا کوئی شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کسی سے بھی ایسا کوئی عمل پیش کر سکتا ہے؟

عام لوگوں کا تحفہ اور ہدیہ کے لیے نذرانے کا لفظ استعمال کرنا اس کی دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ قبروں اور مردوں کے پجاری ان کے لیے جو نذر پیش کرتے ہیں، وہ اس عقیدے سے پیش کرتے ہیں کہ وہ دافع البلاء ہیں۔ ان کے پیش نظر لغوی نہیں، شرعی اور

عرفی نذر ہوتی ہے۔ تب ہی تو اس کے بارے میں ”نذر اللہ اور نیاز حسین“ کے الفاظ سننے کو ملتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ اگر مجھے مقدمہ میں فتح یابی ہوئی یا مرض سے شفا ہوئی یا دشمن زیر ہو گیا یا مجھے اولادِ نرینہ مل گئی یا میرا کاروبار چمک گیا، تو فلاں مزار پر جا کر نذر و نیاز کا لنگر چڑھاؤں گا، ننگے پاؤں جا کر سلام کروں گا، مزار پر ٹاکی باندھوں گا، وغیرہ۔

منصف مزاج لوگ بتائیں کہ کیا یہ سب کچھ لغوی نذر و نیاز کے لیے کیا جاتا ہے؟ یہ سب امور تعظیم و تقرب کے نقطہ نظر سے کیے جاتے ہیں، جس میں نذر ماننے والا اپنے عجز و انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ تحفہ و ہدیہ میں ایسی صورت موجود نہیں ہوتی۔

شیخ الاسلام ثانی، عالم ربانی، علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ (691-751ھ) فرماتے ہیں:

فَمَا أَسْرَعَ أَهْلُ الشِّرْكِ إِلَى اتِّخَاذِ الْأَوْتَانِ مِنْ دُونِ اللَّهِ، وَلَوْ كَانَتْ مَا كَانَتْ، وَيَقُولُونَ: إِنَّ هَذَا الْحَجَرَ، وَهَذِهِ الشَّجَرَةَ، وَهَذِهِ الْعَيْنَ، تَقْبَلُ النَّذْرَ، أَيْ تَقْبَلُ الْعِبَادَةَ مِنْ دُونِ اللَّهِ تَعَالَى، فَإِنَّ النَّذْرَ عِبَادَةٌ وَقُرْبَةٌ، يَتَقَرَّبُ بِهَا النَّاذِرُ إِلَى الْمُنْذُورِ لَهُ.

”مشرکین اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی چیز کو معبود ٹھہرانے میں کتنے جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ پتھر، یہ درخت اور یہ شخص نذر و نیاز کے لائق ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان مشرکین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے علاوہ یہ شخص بھی عبادت کے لائق ہے، کیونکہ نذر و نیاز عبادت و تقرب ہے، جس کے ذریعے نذر دینے والا کسی کا تقرب حاصل کرتا ہے۔“

(إغاثة اللہفان من مصاید الشیطان 1/212)

علامہ احمد بن عبد الرحیم، المعروف بہ شاہ ولی اللہ دہلوی (1114-1176ھ) لکھتے ہیں:

إِنَّهُمْ يَسْتَعِينُونَ بِغَيْرِ اللَّهِ فِي حَوَائِجِهِمْ مِنْ شِفَاءِ الْمَرِيضِ وَغِنَاءِ



الْفَقِيرَ، وَيَنْذِرُونَ لَهُمْ، يَتَوَقَّعُونَ إِنْجَاحَ مَقَاصِدِهِمْ بِتِلْكَ النُّذُورِ، وَيَتْلُونَ  
 أَسْمَاءَهُمْ رَجَاءَ بَرَكَتِهَا، فَأَوْجَبَ اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِمْ أَنْ يَقُولُوا فِي صَلَاتِهِمْ  
 ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (الفاتحة 1: 5)، وَقَالَ تَعَالَى: ﴿فَلَا تَدْعُوا  
 مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ (الجنّ 72: 18)، وَلَيْسَ الْمُرَادُ مِنَ الدُّعَاءِ الْعِبَادَةُ، كَمَا قَالَهُ  
 الْمُفَسِّرُونَ، بَلْ هُوَ الْإِسْتِعَانَةُ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ  
 مَا تَدْعُونَ﴾ (الأنعام 6: 41) .

”مشرکین اپنی حاجات، مثلاً مرض میں شفا اور فقیری میں خوشحالی کے لیے غیر اللہ سے  
 مدد مانگتے ہیں اور ان کے نام کی نذرونیاز دیتے ہیں۔ ان کو یہ امید ہوتی ہے کہ اس نذرونیاز  
 کی وجہ سے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے۔ وہ برکت کی امید پر غیر اللہ کے ناموں  
 کا ورد بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہر نماز میں یہ کہنا فرض کیا ہے کہ:  
 ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (الفاتحة 1: 5) (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ  
 ہی سے مدد طلب کرتے ہیں)۔ نیز فرمایا: ﴿فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ (الجنّ 72: 18)  
 (تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو)۔ اس آیت کریمہ میں دعا سے مراد عبادت نہیں، جیسا کہ  
 (عام) مفسرین نے کہا ہے، بلکہ یہاں استعانت مراد ہے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:  
 ﴿بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ﴾ (الأنعام 6: 41) (بلکہ تم [سخت مصیبت  
 کے وقت] اسی [اللہ] کو پکارتے ہو، چنانچہ وہ تمہاری مصیبتوں کو دور فرماتا ہے)۔“

(حجّة اللہ البالغة: 185/1، طبعة السلفية)

علامہ، محمود بن عبد اللہ، آلوسی، حنفی (1217-1270ھ) فرماتے ہیں:

وَفِي قَوْلِهِ تَعَالَى : ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا﴾ (الحج 22: 73) إلخ إشارة إلى ذمّ العالين في أولياء الله تعالى، حيثُ يَسْتَغِيثُونَ بِهِمْ فِي الشَّدَّةِ غَافِلِينَ عَنِ اللَّهِ تَعَالَى، وَيَنْذُرُونَ لَهُمُ النُّدُورَ، وَالْعُقَلَاءُ مِنْهُمْ يَقُولُونَ : إِنَّهُمْ وَسَائِلُنَا إِلَى اللَّهِ تَعَالَى، وَإِنَّمَا نَنْذِرُ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَنَجْعَلُ ثَوَابَهُ لِلْوَلِيِّ، وَلَا يَخْفَى أَنَّهُمْ فِي دَعْوَاهُمْ الْأُولَى أَشْبَهُ النَّاسِ بِعَبْدَةِ الْأَصْنَامِ، الْقَائِلِينَ : إِنَّمَا نَعْبُدُهُمْ لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى، وَدَعْوَاهُمْ الثَّانِيَةُ لَا بَأْسَ بِهَا لَوْ لَمْ يَطْلُبُوا مِنْهُمْ بِذَلِكَ شِفَاءَ مَرِيضِهِمْ أَوْ رَدَّ غَائِبِهِمْ أَوْ نَحْوَ ذَلِكَ، وَالظَّاهِرُ مِنْ حَالِهِمُ الطَّلَبُ، وَيُرْشَدُ إِلَى ذَلِكَ أَنَّهُ لَوْ قِيلَ : انذَرُوا لِلَّهِ تَعَالَى وَاجْعَلُوا ثَوَابَهُ لَوَالِدَيْكُمْ، فَإِنَّهُمْ أَحْوَجُ مِنْ أَوْلِيكَ الْأُولِيَاءِ لَمْ يَفْعَلُوا، وَرَأَيْتُ كَثِيرًا مِنْهُمْ يَسْجُدُ عَلَى أَعْتَابِ حَجَرِ قُبُورِ الْأُولِيَاءِ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَثْبُتُ التَّصَرُّفَ لَهُمْ جَمِيعًا فِي قُبُورِهِمْ، لَكِنَّهُمْ مُتَّفَاوِتُونَ فِيهِ حَسَبَ تَفَاوُتِ مَرَاتِبِهِمْ، وَالْعُلَمَاءُ مِنْهُمْ يَحْصُرُونَ التَّصَرُّفَ فِي الْقُبُورِ فِي أَرْبَعَةٍ أَوْ خَمْسَةٍ، وَإِذَا طُوبُوا بِالذَّلِيلِ قَالُوا : ثَبَتَ ذَلِكَ بِالْكَشْفِ، قَاتَلَهُمُ اللَّهُ تَعَالَى، مَا أَجْهَلَهُمْ وَأَكْثَرَ افْتِرَائِهِمْ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَزْعُمُ أَنَّهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْقُبُورِ وَيَتَشَكَّلُونَ بِأَشْكَالٍ مُخْتَلِفَةٍ، وَعُلَمَاؤُهُمْ يَقُولُونَ : إِنَّمَا تَظْهَرُ أَرْوَاحُهُمْ مُتَشَكِّلَةً وَتَطُوفُ حَيْثُ شَاءَتْ، وَرَبَّمَا تَشَكَّلَتْ بِصُورَةِ أَسَدٍ أَوْ غَزَالٍ أَوْ نَحْوِهِ، وَكُلُّ ذَلِكَ بَاطِلٌ لَا أَصْلَ لَهُ فِي



الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَكَلَامِ سَلَفِ الْأُمَّةِ، وَقَدْ أَفْسَدَ هَؤُلَاءِ عَلَى النَّاسِ دِينَهُمْ، وَصَارُوا ضِحْكَةً لِلْأَهْلِ الْأَذْيَانِ الْمَنْسُوحَةِ فِي الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى، وَكَذَا لِأَهْلِ النَّحْلِ وَالذَّهْرِيَّةِ، نَسَأَلُ اللَّهَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ.

”فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا﴾ (الحج 22: 73) (بلاشبہ جن کو [اے مشرک] تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے)۔ اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے، جو اولیاء اللہ کے بارے میں غلو کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر مصیبت میں ان اولیاء سے مدد طلب کرتے ہیں اور ان کے نام پر نذر و نیاز دیتے ہیں۔ ان میں سے ’دانشور‘ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ اولیاء تو ہمارے لیے اللہ کی طرف وسیلہ ہیں اور یہ نذر و نیاز تو ہم اللہ کے لیے دیتے ہیں، البتہ اس کا ثواب اس ولی کو پہنچاتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے پہلے دعوے میں بالکل ان بت پرستوں جیسے ہیں جو کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔ رہا دوسرا دعویٰ تو اس میں کوئی حرج نہ ہوتا اگر وہ بزرگوں سے اپنے مریضوں کے لیے شفاء اور غائب ہونے والوں کی واپسی وغیرہ کا مطالبہ نہ کرتے [حالانکہ شرعاً یہ بھی ناجائز ہے۔ ناقل]۔ ان کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بزرگوں سے مانگنے کے لیے ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی نذر و نیاز دو اور اس کا ثواب (اولیاء) کی بجائے اپنے والدین کو پہنچاؤ، کیونکہ تمہارے والدین ان اولیاء سے بڑھ کر ثواب کے محتاج ہیں، تو یہ مشرکین ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، [اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقصد بزرگوں سے مانگنا ہی ہوتا ہے]۔ میں نے بہت سے مشرکین کو دیکھا

ہے کہ اولیاء کی قبروں کے پتھروں پر سجدہ کر رہے ہوتے ہیں۔ بعض مشرکین تو سب اولیاء کے لیے ان کی قبروں میں تصرف (قدرت) بھی ثابت کرتے ہیں، البتہ مراتب کے اعتبار سے یہ تصرف مختلف قسم کا ہوتا ہے۔ ان مشرکین کے ’اہل علم‘ قبروں میں اولیاء کے لیے چار یا پانچ قسم کا تصرف ثابت کرتے ہیں، لیکن جب ان سے دلیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ چیز کشف سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو تباہ و برباد کرے، یہ کتنے جاہل اور جھوٹے لوگ ہیں! ان میں سے بعض یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اولیاء اپنی قبروں سے نکلتے ہیں اور مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں، جبکہ ان کے ’اہل علم‘ کا کہنا ہے کہ اولیاء کی صرف روہیں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں اور جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں۔ ان کے بقول بسا اوقات اولیاء کی روہیں شیر، ہرن وغیرہ کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ ساری باتیں جھوٹی ہیں، کتاب و سنت اور اسلاف امت کے کلام میں ان کا کوئی ثبوت نہیں۔ ان مشرکین نے (سادہ لوح) لوگوں کا دین بھی برباد کر دیا ہے۔ ایسے لوگ یہود و نصاریٰ، دیگر ادیانِ باطلہ کے پیروکاروں اور بے دین لوگوں کے سامنے مذاق بن گئے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے (دین و دنیا کی) عافیت اور سلامتی کا سوال کرتے ہیں۔“ (روح المعانی: 212-213)

نیز فرماتے ہیں: وَمِنْ أَوْلَئِكَ عَبْدَةُ الْقُبُورِ، النَّاذِرُونَ لَهَا، الْمُعْتَقِدُونَ لِلنَّفْعِ وَالضَّرِّ، مِمَّنِ اللَّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ بِحَالِهِ فِيهَا، وَهُمْ الْيَوْمَ أَكْثَرُ مِنَ الدُّودِ۔  
 ”ان مشرکوں میں سے بعض وہ ہیں جو قبروں کے پجاری ہیں، ان پر نذر و نیاز دیتے ہیں اور ان لوگوں سے نفع و نقصان کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ قبر میں جن کی حالت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ موجودہ دور میں ایسے مشرکین کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔“

(روح المعانی: 67/17)

علامہ محمد بن علی، حنفی، حنفی (1021-1088ھ) اپنے اکثر عوام کی اصلاح میں لکھتے ہیں:

وَأَعْلَمُ أَنَّ النَّذَرَ الَّذِي يَقَعُ لِلْأَمْوَاتِ مِنْ أَكْثَرِ الْعَوَامِّ، وَمَا يُؤْخَذُ مِنَ الدَّرَاهِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّيْتِ وَنَحْوِهَا إِلَى ضَرَائِحِ الْأَوْلِيَاءِ الْكَرَامِ تَقَرُّبًا إِلَيْهِمْ، فَهُوَ بِالْإِجْمَاعِ بَاطِلٌ وَحَرَامٌ.

”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اکثر عوام جو مُردوں کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں اور جو رقوم، چراغ اور تیل وغیرہ اولیائے کرام کی قبروں پر تقرب کی نیت سے لائے جاتے ہیں، وہ بالاجماع باطل اور حرام ہیں۔“ (الدر المختار، ص: 155، رد المحتار: 439/2)

مشہور حنفی امام، محمد امین بن عمر، ابن عابدین، شامی (1198-1252ھ) اس عبارت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

كَأَنَّ يَقُولَ: يَا سَيِّدِي فَلَانُ! إِنْ رُدَّ غَائِبِي أَوْ عَوْفِي مَرِيضِي أَوْ قُضِيَتْ حَاجَتِي، فَلَكَ مِنَ الذَّهَبِ أَوْ الْفِضَّةِ أَوْ مِنَ الطَّعَامِ أَوْ الشَّمْعِ أَوْ الزَّيْتِ كَذَا، (قَوْلُهُ: بَاطِلٌ وَحَرَامٌ) لِيُجْوَهِ: مِنْهَا أَنَّهُ نَذَرٌ لِمَخْلُوقٍ، وَالنَّذَرُ لِلْمَخْلُوقِ لَا يَجُوزُ، لِأَنَّهُ عِبَادَةٌ، وَالْعِبَادَةُ لَا تَكُونُ لِمَخْلُوقٍ، وَمِنْهَا أَنَّ الْمَنْذُورَ لَهُ مَيِّتٌ، وَالْمَيِّتُ لَا يَمْلِكُ، وَمِنْهُ أَنَّهُ ظَنٌّ أَنَّ الْمَيِّتَ يَتَصَرَّفُ فِي الْأُمُورِ دُونَ اللَّهِ تَعَالَى، وَاعْتِقَادُهُ ذَلِكَ كُفْرٌ.

”اولیاء کے لیے نذر و نیاز کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی کہے: اے میرے فلاں پیر! اگر میرا غائب رشتہ دار واپس آگیا یا میرا مریض شفا یاب ہو گیا یا میرا کام ہو گیا تو اتنا سونا، اتنی چاندی، اتنا کھانا چراغ یا اتنا تیل آپ کی نذر کروں گا۔ یہ نذر و نیاز کئی وجوہ سے باطل اور حرام ہے؛ ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ مخلوق کے لیے نذر و نیاز ہے، حالانکہ نذر و نیاز عبادت ہے اور عبادت کسی مخلوق کے لیے جائز نہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ جس کے نام کی نذر و نیاز دی جا



رہی ہوتی ہے، وہ مُردہ ہوتا ہے اور مُردہ کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا۔ تیسری وجہ یہ کہ نذر و نیاز دینے والا اللہ کو چھوڑ کر اس ولی کے امور میں تصرف کرنے کا اعتقاد رکھتا ہے اور یہ اس کا اعتقاد کفر ہے۔“ (ردّ المحتار المعروف بہ الفتاوی الشامی : 2/439)

مشہور حنفی، قاسم بن قطلوبغا (802-879ھ) لکھتے ہیں:

فَمَا يُؤْخَذُ مِنَ الدَّرَاهِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّيْتِ وَغَيْرِهَا، وَيَنْتَقَلُ إِلَى ضَرَائِحِ الْأَوْلِيَاءِ تَقَرُّبًا إِلَيْهِمْ، مُحَرَّمٌ بِإِجْمَاعِ الْمُسْلِمِينَ .

”جو رقوم، شمعیں اور تیل وغیرہ اولیائے کرام کی قبروں پر ان کے تقرب کے لیے لائی جاتی ہیں، ان کے حرام ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔“

(البحر الرائق لابن نجيم : 2/298، الفتاوی الہندیۃ المعروف بہ فتاوی عالمگیری : 1/216، حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ص: 378)

حنفی مذہب کی معتبر و مستند کتاب میں لکھا ہے:

وَالنَّذْرُ الَّذِي يَقَعُ مِنْ أَكْثَرِ الْعَوَامِّ بِأَنْ يَأْتِيَ إِلَى قَبْرِ بَعْضِ الصُّلَحَاءِ، وَيَرْفَعَ سِتْرَهُ قَائِلًا : يَا سَيِّدِي فَلَانُ ! إِنْ قَضَيْتَ حَاجَتِي فَلَكَ مِنِّي مِنَ الذَّهَبِ مَثَلًا كَذَا، بَاطِلٌ إِجْمَاعًا .

”اکثر عوام جو اس طرح نذر مانتے ہیں کہ کسی نیک شخص کی قبر پر آ کر یوں فریاد کرتے ہیں: اے میرے فلاں پیر! اگر تو میری یہ ضرورت پوری کر دے تو میری طرف سے اتنا سونا تیری نذر۔ یہ اجماعی طور پر حرام ہے۔“ (الفتاوی الہندیۃ المعروف بہ فتاوی عالمگیری : 1/216)

علامہ برکوی حنفی، علامہ ابوشامہ (م: 665ھ) سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثُمَّ يَتَجَاوَزُونَ هَذَا إِلَى أَنْ يُعْظَمَ وَقَعَ تِلْكَ الْأَمَاكِنِ فِي قُلُوبِهِمْ،



فِيْعِظُمُوْنَهَا، وَيَرْجُوْنَ الشِّفَاءَ لِمَرْضَاهُمْ وَقَضَاءَ حَوَائِجِهِمْ، بِالنَّذْرِ لَهُمْ، وَهِيَ مِنْ بَيْنِ عَيْوُنٍ وَشَجَرٍ وَحَائِطٍ وَحَجَرٍ .

”پھر یہ مشرکین اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور اپنے دلوں میں ان مقامات کی تعظیم بٹھا لیتے ہیں۔ وہ ان جگہوں کی تعظیم بھی کرتے ہیں اور ان پر نذر و نیاز چڑھا کر اپنے بیماروں کی شفا اور اپنی حاجات کی برآری کی امید بھی کرتے ہیں۔ ایسی جگہیں درختوں، پتھروں، باغات اور چشموں پر واقع ہوتی ہیں۔“

(زيارة القبور، ص: 546-547، طبعة الكردية، وفي نسخة دار الإفتاء، ص: 52)

### فقہ حنفی اور احمد یار خان نعیمی بریلوی:

قارئین کرام! اہل سنت کے علمائے کرام، کتب فقہ اور فقہائے احناف کے اقوال کی روشنی میں آپ نے بزرگوں کے نام کی نذر و نیاز کا حرام اور شرک ہونا ملاحظہ فرما لیا۔ اتنی وضاحت و صراحت کے باوجود بعض ناعاقبت اندیش اس نذر و نیاز کو جائز ثابت کرنے کے لیے سینہ زوری سے کام لیتے ہیں۔

اس کی ایک مثال جناب احمد یار خان نعیمی بریلوی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”کوئی کہتا ہے کہ یا حضور غوث پاک! آپ دُعا کریں، اگر میرا مریض اچھا ہو گیا، تو میں آپ کے نام کی دیگ پکاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ میرے خدا ہیں، اس مریض کے اچھا ہونے پر میں آپ کی یہ عبادت کروں گا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں پلاؤ کا صدقہ کروں گا اللہ کے لیے۔ اس پر جو ثواب ملے گا، آپ کو بخشوں گا، جیسے کوئی شخص کسی طبیب سے کہے کہ اگر بیمار اچھا ہو گیا تو پچاس روپیہ آپ کی نذر کروں گا۔“

(”جاء الحق“: 307/1)

واہ کیا خوب فقاہت ہے، جو اپنی ہی فقہ حنفی کی دھجیاں اڑائے جا رہی ہے۔



اسی بارے میں جناب غلام رسول سعیدی بریلوی لکھتے ہیں :

”آج کل جس طرح اُن پڑھ عوام اپنی حاجات میں اولیاء اللہ کی نذریں اور منتیں مانتے ہیں اور حاجات پوری ہونے کے بعد مزارات پر نذریں پیش کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ اس کو لغوی نذر کہہ کر سندِ جواز پیش کرتے ہیں، اس کا قرآن مجید، احادیثِ صحیحہ اور آثارِ صحابہ میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کتبِ فتاویٰ میں اس نذر کو حرام کہا گیا ہے۔ یہ ایک خالص فقہی مسئلہ ہے۔ اس میں کتبِ فقہیہ کو چھوڑ کر بعض غیر معصوم اور غیر معروف صوفیوں کے اقوال اور احوال سے استدلال کرنا کوئی فقہت نہیں ہے، بلکہ عدل و انصاف سے بعید ہے۔“

(شرح صحیح مسلم : 4/543)

ایک بریلوی عالم نے ہی نعیمی صاحب کو نا انصاف اور غیر فقیہ قرار دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ قرآن و سنت، افعالِ صحابہ کرام اور فقہ حنفی کے رُو سے بزرگوں کے نام کی نذر و نیاز حرام ہے۔

غور و فکر کا مقام ہے کہ جن افعال پر قرآن و حدیث نے کوئی نص قائم نہیں کی اور جن سے سلف صالحین، یعنی صحابہ و تابعین بے خبر تھے، ان کو شرعی جواز فراہم کرنا کتنی زبردست بددیانتی ہے۔ غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز دینا اہل بدعت اور اہل شرک کا وطیرہ ہے، اہل سنت اور اہل حق نہ کبھی ایسا کرتے تھے، نہ کرتے ہیں، نہ کریں گے۔ عام لوگ جب شیخ عبد القادر جیلانی کے نام کی گیارہویں دیتے ہیں، ان کے قصد و نیت میں ان کی نیاز پیش کرنا ہی ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ میں فلاں بزرگ کے نام کی دیگ پکاؤں گا تو اس کا واضح مطلب ہوتا ہے کہ وہ اس کے نام کی نذر و نیاز دے گا اور نذر و نیاز عبادت ہے، جو غیر اللہ کے لیے قطعاً جائز نہیں ہے۔

نعیمی صاحب صرف ”پلاؤ“ کے لیے غیر اللہ کی عبادت کو سندِ جواز دے رہے ہیں اور





دین میں نئے کام داخل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ان کے نزدیک ایک طبیب کو علاج معالجہ پر اجرت دینے اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کی نیاز دینے میں کوئی فرق نہیں۔ کیا کبھی کسی نے طبیب کے نام پر دیگ پکائی اور ”پلاؤ“ کا صدقہ کر کے اس کا ثواب طبیب کو پہنچایا؟ یہ لوگ مُردوں سے مانگنے اور ان کے متعلق مدد کرنے کا اعتقاد رکھتے ہیں، حالانکہ آج تک کسی صاحبِ قبر نے ان کو کچھ نہیں دیا، البتہ اس ڈھونگ سے انہوں نے اپنے جاہل عوام سے بہت کچھ لے لیا ہے۔

### مُردوں کا تصرف!

ایک باطل اعتقاد یہ بھی ہے کہ مُردے سنتے، دیکھتے، اُمور میں تصرف کرتے، غیب جانتے، دعائیں سنتے اور نوازتے ہیں۔

امام بریلویت ”اعلیٰ حضرت“ احمد رضا خان بریلوی (1272-1340ھ) کہتے ہیں:

”سیدی عبدالوہاب اکابر اولیائے کرام میں سے ہیں۔ حضرت سیدی احمد بدوی کبیر کے مزار پر ایک تاجر کی کنیز پر نگاہ پڑی۔ وہ آپ کو پسند آئی۔ جب مزار شریف میں حاضر ہوئے تو صاحبِ مزار نے ارشاد فرمایا: عبدالوہاب! وہ کنیز تمہیں پسند ہے؟ عرض کیا: ہاں! شیخ سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہیے۔ ارشاد فرمایا: اچھا، ہم نے وہ کنیز تم کو ہبہ کی۔ آپ سکوت میں ہیں کہ کنیز تو اس تاجر کی ہے اور حضور ہبہ فرماتے ہیں۔ وہ تاجر حاضر ہوا اور اس نے وہ کنیز مزارِ اقدس کی نذر کی، خادم کو ارشاد ہوا۔ انہوں نے آپ کی نذر کر دی۔ (صاحبِ مزار نے) ارشاد فرمایا: اب دیر کا ہے کی ہے؟ فلاں حجرہ میں لے جاؤ اور اپنی حاجت پوری کرو۔“

(ملفوظات احمد رضا، ص: 275-276)

مفتی نعیمی صاحب تو ”پلاؤ“ پر رال پٹکانے لگے ہیں، لیکن یہاں تو ماجرا ہی عجیب ہے کہ مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے، وہ بزرگوں کی ایما پر ہوتا ہے! مفتی صاحب اس نذر کو بھی



”لغوی نذر“ قرار دے کر زنا اور بدکاری کو عام کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

ان کے بقول اہل قبور سے ان کی گفتگو ہوتی ہے، وہ ان کے دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہیں، موج میلے میں اپنے مریدوں کو بھی شریک کرتے ہیں اور قبروں میں پڑے امور دنیا کی انجام دہی بھی کرتے ہیں۔ اس سارے جھوٹ اور ساری بے حیائی کو یہ لوگ ”خدائی عطا“ کا نام دیتے ہیں۔ کیا اب بھی یہ لوگ دین محمدی سے منحرف نہیں اور شرک و کفر کی دلدل میں پھنسے اور دھنسے نہیں ہوئے؟ کیا ایسے لوگ مشرکین مکہ سے بدتر عقیدہ نہیں رکھتے اور اہل سنت والجماعت کے سخت مخالف نہیں ہیں؟ قرآن و سنت کی من پسند تاویلات میں انہوں نے اہل کتاب کو بھی مات کر دیا ہے۔

## ایک بے تکی تاویل!

مفتی احمد یار خان نعیمی لکھتے ہیں: ”شامی (439/2) نے کتاب الصوم، بحث اموات میں اس طرح بیان فرمایا: بَأَنَّ تَكُونَ صِيغَةُ النَّذْرِ لِلَّهِ تَعَالَى لِلتَّقَرُّبِ إِلَيْهِ، وَيَكُونُ ذِكْرُ الشَّيْخِ مُرَادًا بِهِ فَقَرَأَتْهُ. صِيغَةُ نَذَرِكَ اللَّهُ کی عبادت کے لیے ہو اور شیخ کی قبر پر رہنے والے فقراء اس کا مصرف ہوں۔ یہ محض جائز ہے تو یوں سمجھو کہ یہ صدقہ اللہ کے لیے، اس کے ثواب کا ہدیہ روح شیخ کے لیے، اس صدقہ کا مصرف مزار بزرگ کے خدام فقراء جیسے کہ حضرت مریم کی والدہ نے مانی تھی کہ اپنے پیٹ کا بچہ خدایا تیرے لیے نذر کرتی ہوں، جو بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف ہوگا۔ نذر اللہ کی اور مصرف بیت المقدس۔“ (”جاء الحق“: 307/1)

کہاں وہ نذر جو سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ نے اللہ تعالیٰ کے نام پر کی اور قرآن کریم نے بطور مدح اس کا ذکر کیا اور کہاں مُردوں کے نام کی وہ نذر و نیاز جو قرآن و سنت، اجماع امت، فقہائے



احناف اور سب مسلمانوں کے نزدیک باطل اور حرام ہے۔ سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ ماجدہ نے جو نذر مانی تھی کہ میرے بطن میں جو بچہ ہے، میں نے اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور مسجد اقصیٰ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ نذر پوری کی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ﴾ (آل عمران 3: 37)

”چنانچہ اس کے رب نے اسے بہت اچھی طرح قبول فرمایا۔“

**قبروں پر نذر و نیاز اور حدیث نبوی:**

رہا اللہ تعالیٰ کے لیے نذر مان کر اسے قبروں کے پجاریوں پر خرچ کرنا، تو یہ شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے۔ یہ صریحاً شریعتِ مطہرہ کی خلاف ورزی ہے، جیسا کہ:

صحابی رسول، سیدنا ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

نَذَرَ رَجُلٌ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَنْحَرَ إِبِلًا بَبْوَائَةَ، فَاتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: إِنِّي نَذَرْتُ أَنْ أَنْحَرَ إِبِلًا بَبْوَائَةَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «هَلْ كَانَ فِيهَا وَثْنٌ مِّنْ أَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ؟» قَالُوا: لَا، قَالَ: «هَلْ كَانَ فِيهَا عِيْدٌ مِّنْ أَعْيَادِهِمْ؟» قَالُوا: لَا، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَوْفٍ بِنَذْرِكَ، فَإِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرِ فِي مَعْصِيَةِ اللَّهِ».

”ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بوانہ مقام پر اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں نے بوانہ مقام پر اونٹ ذبح کرنے کی نذر مان لی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا اس جگہ جاہلیت کے استہانوں

میں سے کوئی استہان تھا، جس کی عبادت کی جاتی ہو؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: کیا اس جگہ اہل جاہلیت کا کوئی میلہ لگتا تھا؟ عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: اپنی نذر کو پورا کرلو۔ بلاشبہ اللہ کی نافرمانی میں کسی نذر کو پورا کرنا جائز نہیں۔“

(سنن أبي داود: 3313، المعجم الكبير للطبراني: 2/75، 76، ح: 340، وسنده صحيح)

سیدنا کرم بن سفیان ثقفی رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ روایت میں نبوی الفاظ یہ ہیں:

«هَلْ بِهَا وَثْنٌ أَوْ عَيْدٌ مِّنْ أَعْيَادِ الْجَاهِلِيَّةِ؟» .

”کیا اس جگہ کوئی بت یا جاہلیت کے میلوں میں سے کوئی میلہ تھا؟“

(سنن أبي داود: 3315، وسنده حسن)

سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک صحابیہ نے عرض کیا: اِنِّي نَذَرْتُ اَنْ اَذْبَحَ بِمَكَانٍ كَذَا وَكَذَا، مَكَانٌ كَانَ يَذْبَحُ فِيهِ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ، قَالَ «لِصَنَمٍ؟»، قَالَتْ: لَا، قَالَ «لِوَثْنٍ؟»، قَالَتْ: لَا، قَالَ: «اَوْ فِي بَنْدَرِكٍ» .

”میں نے فلاں جگہ پر جانور ذبح کرنے کی نذر مانی ہے۔ اس جگہ پر اہل جاہلیت جانور ذبح کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: وہ کسی بت کے لیے ذبح کرتے تھے؟ صحابیہ نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: کسی مورتی کے لیے ذبح کرتے تھے؟ عرض کیا: نہیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی نذر پوری کرلو۔“ (سنن أبي داود: 3312، وسنده حسن)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جن جگہوں پر شرک اور کفر ہوتا ہو، وہاں جائز نذر پوری کرنا بھی ممنوع اور حرام ہو جاتا ہے، بلکہ شرک تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ان احادیث میں کسی جگہ نذر کو پورا کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سوال پوچھے؛



① کیا وہاں غیر اللہ کی عبادت ہوتی ہے؟

② کیا وہاں مشرکوں کا سالانہ اکٹھ یا میلہ ہوتا ہے؟

دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ملنے پر آپ ﷺ نے وہاں نذر پوری کرنے کی اجازت دی۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک سوال کا جواب بھی اثبات میں مل جاتا تو اس صورت میں اجازت ممکن نہیں تھی، کیونکہ ایسا کرنا آپ ﷺ کی زبانی اللہ کی نافرمانی ہے۔ کسی جگہ نذر پورا کرنے کے بارے میں یہی نبوی ضابطہ آج بھی برقرار ہے۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قبر پرست بزرگوں کی قبروں پر جو نذر و نیاز پیش کرتے ہیں، اسے وہ بزرگوں کی بجائے اللہ ہی کے نام کرتے ہیں، تو ایسا کرنا بھی شریعت اسلامیہ میں حرام اور ممنوع ہے، چہ جائیکہ ان کی نیت ہی غیر اللہ کی نذر و نیاز کی ہوتی ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔

شیخ الاسلام، علامہ، احمد بن عبد الحلیم، ابن تیمیہ رحمہ اللہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

وَهَذَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ الذَّبْحَ بِمَكَانٍ عِيدِهِمْ وَمَحَلِّ أَوْثَانِهِمْ مَعْصِيَةُ اللَّهِ .

”اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کی میلہ گاہوں اور ان کے استہانوں پر جانور ذبح کرنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔“ (اقتضاء الصراط المستقیم: 495/1)

نیز فرماتے ہیں:

وَإِذَا كَانَ تَخْصِيصُ بُقْعَةِ عِيدِهِمْ مَحْذُورًا،

فَكَيْفَ بِنَفْسِ عِيدِهِمْ؟

”جب مشرکین کے میلے کی جگہ جانور ذبح کرنا ممنوع ہے، تو خاص ان کے میلے میں جانور ذبح کرنا کیسے جائز ہو گیا؟“ (أَيْضًا: 497/1)

**تنبیہ ①:** جناب احمد یار خان نعیمی نے مذکورہ الصدر حدیث یوں ذکر کی ہے:

”مشکوٰۃ باب النذور میں ہے کہ کسی نے نذر مانی تھی کہ میں بوانہ مقام میں اونٹ ذبح



کروں گا، تو فرمایا گیا کہ اگر کوئی وہاں بت وغیرہ نہ ہو، تو نذر پوری کرو۔“

(”جاء الحق“: 308/1)

یعنی اپنے مذہب کے خلاف پڑنے والے میلے کے الفاظ ”مفتی“ صاحب نے ڈکار لیے!

**تنبیہ ②:** ”مفتی“ صاحب نے ایک حدیث یوں لکھی ہے:

”ایک شخص نے نذر مانی تھی کہ میں بیت المقدس میں چراغ کے لیے تیل بھیجوں گا۔“

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس نذر کو پورا کرو۔“ (”جاء الحق“: 307/1-308)

لیکن یہ روایت ذخیرہ حدیث میں موجود نہیں۔ ”مفتی“ صاحب تو فوت ہو گئے ہیں،

اب بریلوی حضرات ہی اس کا کوئی ثبوت اور ماخذ فراہم کر دیں، ورنہ مان لیں کہ۔۔۔

قبر پرستی کی بنیاد فقہ حنفی کا یہ گمراہ کن مسئلہ بنا ہے کہ تقرب الی اللہ کے لیے مزاروں اور

قبروں پر نذر پوری کرنا جائز ہے۔ اس حوالے سے ان کا دامن دلیل سے بالکل خالی ہے۔

اس سارے کاروبار کا اصل مقصود تو قبر اور صاحب قبر کی تعظیم ہوتا ہے۔ باقی رہا مال تو اسے

سجادہ نشین، مجاور اور ملنگ ڈکار جاتے ہیں۔ مجاوری کون سا شرعی اقدام ہے؟ یہ بھی تو زری

کفار کی نقالی ہے۔

**نذر کی لغوی، عرفی اور شرعی تقسیم!**

جناب احمد یار خان نعیمی لکھتے ہیں: ”مشکوٰۃ باب مناقب عمر میں ہے کہ بعض

بیویوں نے نذر مانی تھی کہ اگر حضور ﷺ جنگِ اُحد سے بھیریت واپس آئے تو میں آپ کے

سامنے دف بجاؤں گی۔ یہ نذر بھی عرفی تھی نہ کہ شرعی، یعنی حضور کی خدمت میں خوشی کا

نذرانہ۔ غرضیکہ لفظ نذر کے دو معنی ہیں؛ لغوی اور شرعی۔ لغوی معنی سے نذر بزرگانِ دین کے

لیے جائز ہے، بمعنی نذرانہ۔ جیسے طواف کے دو معنی ہیں؛ لغوی معنی اس کے پاس گھومنا اور

شرعی رب تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَيَطُوفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ 'پرانے گھر کا طواف کریں۔ یہاں طواف شرعی معنی میں ہے اور فرماتا ہے: ﴿يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمِ آن﴾ یہاں طواف بمعنی لغوی ہے۔ آنا، جانا، گھومنا۔“ (”جاء الحق“: 308/1)

اس حدیث میں کسی سیاہ رنگ کی لونڈی کی طرف سے یہ نذر ماننے کا ذکر ہے، لیکن ”مفتی“ صاحب نے اس کا خود ساختہ ترجمہ ”بعض بیویوں“ کر دیا ہے۔ نیز اس حدیث کے الفاظ [بَعْضُ مَغَازِيهِ] کا ترجمہ ”جنگِ اُحد“ کرنا بھی غلط ہے۔

یہ روایت سنن ترمذی، مسند احمد وغیرہ میں آتی ہے۔ اس کو ذکر کر کے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ (384-458ھ) فرماتے ہیں:

وَهَذَا لِأَنَّهُ أَمْرٌ مُّبَاحٌ، وَفِيهِ إِظْهَارُ الْفَرَحِ بِظُهُورِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرُجُوعِهِ سَالِمًا، فَأَذِنَ لَهَا فِي الْوَفَاءِ بِنَذْرِهَا، وَإِنْ لَمْ يَجِبْ.

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نذر کو پورا کرنے کی اجازت اس لیے دی کہ یہ ایک جائز کام تھا۔ اس سے مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جیت اور صحیح و سلامت واپسی پر خوشی کا اظہار تھا۔ یہ نذر پوری کرنا اگرچہ ضروری نہیں تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پورا کرنے کی اجازت دے دی۔“

(السنن الصغیر، تحت الحديث: 3209، السنن الکبریٰ للبیہقی: 77/10)

شرعاً جائز نذر کو لغوی نذر قرار دے کر ناجائز اور حرام نذر کو جائز قرار دینا بہت بڑی بدبختی ہے۔ حدیث کے بارے میں محدثین کرام کا فہم معتبر ہے۔ صحابیہ کا مقصد یہ تھا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحیح و سلامت اور مظفر و منصور واپس لوٹیں گے تو میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمتِ جلیلہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دَف بجا کر خوشی کا اظہار کروں گی۔ اس کا اولیاء اللہ کے نام کی نذر و نیاز اور منت منوتی سے کیا تعلق؟ ”مفتی“ صاحب کا اس حدیث سے ”حضور کی خدمت



میں خوشی کا نذرانہ“ ثابت کرنا ان کی کوتاہ فہمی کی واضح دلیل ہے۔

رہا ”مفتی“ صاحب کا یہ کہنا کہ طواف کے دو معنی ہیں؛ ایک لغوی و عرفی اور دوسرا شرعی، تو دورِ حاضر کے مشرکین قبروں کا بھی طواف کرتے ہیں، شاید وہ لغوی طواف ہی کرتے ہوں۔ اس طرح کل کلاں لغوی رکوع، لغوی سجدہ، لغوی نماز اور لغوی حج بھی مخلوق کے لیے جائز ہو جائے گا؟ لغت کا سہارا لے کر مخلوق کے لیے عبادات کو جائز قرار دینا ظلمِ عظیم ہے۔

اہل حدیث کے ممتاز عالم، حافظ خواجہ محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ (م: 1997ء) فرماتے ہیں:

”مفتی صاحب کا یہ استدلال تب درست ہو سکتا ہے، اگر اولاً وہ یہ ثابت کر دیں کہ زندہ یا مردہ اولیاء کرام کی قبروں کا طواف لغوی معنوں میں جائز ہے یا لغوی معنوں میں انہیں سجدہ جائز ہے۔ مفتی صاحب نے لغوی لغوی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بریلویوں کو چاہیے کہ اپنے عوام کو بتلا دیں کہ ان کے مذہب کا سارا تانا بانا لغوی ہے، شرعی نہیں۔ عبادات اور شرعی اصطلاحات کو لغوی معنی پہنا کر غیر اللہ کے لیے جائز کر دینے کو مذہبی تخریب کاری کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ یہ دین کی خدمت نہیں، ہندوانہ سازش ہے۔“ (معرکہ حق و باطل، ص: 635)

اسی سلسلے میں جناب غلام رسول سعیدی، بریلوی لکھتے ہیں:

”بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی حاجت کے وقت اولیاء اللہ کی نذر اس طرح مانے؛ اے داتا! اگر تو نے میری یہ حاجت پوری کر دی تو میں تیرے لیے ایک بکرا پیش کروں گا۔ تو یہ نذر جائز ہے، کیونکہ یہ نذر لغوی ہے۔ اور جو نذر غیر اللہ کی حرام ہے، وہ نذرِ فتنی یا نذرِ شرعی ہے۔ اور نذرِ لغوی اور نذرِ شرعی میں ان لوگوں کے نزدیک صرف یہ فرق ہے کہ نذرِ شرعی میں اللہ کی نذر مانی جاتی ہے اور نذرِ لغوی میں اولیاء اللہ کی نذر مانی جاتی ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس طرح غیر اللہ کے لیے سجدہ، طواف، روزہ اور دیگر عبادات بھی جائز ہو جائیں گی، مثلاً کوئی شخص کسی ولی کو سجدہ کرے گا اور کہے گا کہ یہ لغوی





سجدہ ہے، کوئی شخص کسی ولی کی قبر کا طواف کرے گا اور کہے گا کہ یہ لغوی طواف ہے اور کوئی شخص کسی ولی کے لیے روزے رکھے گا اور کہے گا کہ یہ لغوی روزہ ہے اور اسی طرح لغت کے سہارے غیر اللہ کے لیے تمام عبادات کا دروازہ کھل جائے گا، کیونکہ جس طرح نذر بالاتفاق عبادت ہے، لیکن لغوی نذر غیر اللہ کے لیے شرعاً مانی جاسکتی ہے، تو اسی طرح غیر اللہ کے لیے لغوی نماز پڑھی جاسکتی ہے، غیر اللہ کے لیے لغوی روزے رکھے جاسکتے ہیں اور لغوی حج کیے جاسکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس!“ (شرح صحیح مسلم: 4/541-542)

## ایک اور دھوکہ!

”مفتی“ صاحب ایک اور طرح سے دھوکہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”دیکھو! غیر اللہ کی قسم کھانا شرعاً منع ہے اور خود قرآن کریم اور نبی ﷺ نے غیر اللہ کی قسمیں کھائیں: ﴿وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ﴾ \* وَطُورِ سِينِينَ ﴿﴾ وغیرہ اور حضور ﷺ نے فرمایا: أَفْلَحَ، وَأَبِیْہ (اس کے باپ کی قسم! وہ کامیاب ہو گیا)۔ مطلب یہی ہے کہ شرعی قسم جس پر احکام قسم کفارہ وغیرہ جاری ہو، وہ خدا کے سوا کسی کی نہ کھائی جاوے، مگر لغوی قسم جو محض تاکید کلام کے لیے ہو، وہ جائز۔ یہی نذر کا حال ہے۔“ (”جاء الحق“: 1/307)

اس کے رد میں جناب غلام رسول سعیدی، بریلوی کا جواب پیش خدمت ہے:

”یہ دلیل متعدد وجود سے صحیح نہیں ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ چونکہ غیر اللہ کے لیے قسم کا ذکر قرآن اور حدیث میں آگیا، اس لیے اس میں تاویل کی ضرورت ہے اور غیر اللہ کے لیے نذر ماننے کا ذکر قرآن و حدیث میں نہیں ہے، اس لیے اس کو تاویل سے غیر اللہ کے لیے جائز کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ (شرح صحیح مسلم: 4/542)





## صفاتِ باری تعالیٰ کی معرفت اور اس کے ثمرات

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں چند اہم قواعد

اسم اور صفت کا معنی اور ان میں فرق:

اسم: وہ لفظ ہے جو اپنا معنی از خود بتا سکے۔ (التعريفات للجر جاني، ص: 24)

ان الفاظ کو اسماء (نام) کہا جاتا ہے، جو چیزوں پر دلالت کرتے ہیں۔

(مجموع الفتاویٰ: 195/6)

ایک قول یہ ہے کہ اسم وہ لفظ ہے جو اپنے مسمیٰ کے بارے میں خبر دے، فعل وہ لفظ ہے جو مسمیٰ کی حرکت کے بارے میں بتائے اور حرف وہ لفظ ہے جو ایسا معنی بتائے جو اسم و فعل نہ ہو۔ (الکلیات لأبي البقاء الكفوي، ص: 83)

صفت: وہ اسم ہے جو کسی ذات کے بعض حالات کے بارے میں بتائے۔ صفت اس موصوف کی لازمی علامت ہوتی ہے، جو اس کے ساتھ معروف ہوتا ہے۔

(التعريفات للجر جاني، ص: 133)

صفت وہ ہوتی ہے جس سے وصف (اسم صفت) مشتق ہوتا ہے اور اسم صفت، صفت پر دلالت کرتا ہے، جیسے علم و قدرت وغیرہ۔ (الکلیات، ص: 546)

ابن فارس کہتے ہیں: ”کسی چیز کی لازمی علامت کو صفت کہتے ہیں۔“

(معجم مقاییس اللغة: 448/5)

نیز کہتے ہیں: ”کسی چیز میں موجود خوبی کا بیان صفت کہلاتا ہے۔“

(أيضاً: 115/6)



اسم اور صفت میں فرق:

سعودیہ کی فتویٰ کمیٹی سے اسم اور صفت کا فرق پوچھا گیا تو یہ جواب دیا گیا:

”اللہ تعالیٰ کے اسماء سے مراد وہ تمام الفاظ ہیں جو باری تعالیٰ کی ذات پر اس کی کمال والی صفات کے ساتھ دلالت کرتے ہیں، جیسا کہ قادر، علیم، حکیم، سمیع، بصیر۔

یہ نام اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بھی بتاتے ہیں اور اس قدرت، علم، حکمت اور سمیع و بصیر کے بارے میں بتاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔

جبکہ صفات وہ کمال والے اوصاف ہیں، جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں، جیسا کہ علم و حکمت اور سمیع و بصیر وغیرہ۔

یوں اسم دو چیزوں پر دلالت کرتا ہے اور صفت ایک چیز پر۔ اس بات کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اسم، صفت کو متضمن ہوتا ہے اور صفت اسم کو مستلزم ہوتی ہے۔

(فتاویٰ اللجنة الدائمة: 116/3، الرقم: 8942)

اسم سے صفت کے اور صفت سے اسم کے فرق کو کئی طرح سے سمجھا جاسکتا ہے؛

① اسماء سے صفات بنائی جاتی ہیں، جبکہ صفات سے اسماء نہیں بنائے جاسکتے۔ مثلاً ہم اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی رحیم، قادر اور عظیم سے رحمت، قدرت اور عظمت والی صفات مشتق کر سکتے ہیں، لیکن ہم ارادہ، محبت اور مکر کی صفات سے اللہ تعالیٰ کے نام مرید، جائی اور ما کر نہیں بنا سکتے۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی صفات پر مشتمل ہیں، جیسا کہ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ قصیدہ نونیہ میں فرماتے ہیں:

أَسْمَاءُ هَ أَوصَافُ مَدَحٍ كُلُّهَا مُشْتَقَّةٌ قَدْ حُمِلَتْ لِمَعَانٍ

”اللہ تعالیٰ کے نام اوصافِ مدح ہیں اور سارے کے سارے مشتق ہیں، جو مختلف



معانی پر محمول کیے جاتے ہیں۔“

② اللہ تعالیٰ کے افعال سے اس کا کوئی نام مشتق نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ہم اللہ تعالیٰ کے محبت، کراہت اور غضب کرنے کے افعال سے محب، مکرہ اور مغضب کی صورت میں اسما نہیں بنا سکتے، البتہ افعال سے صفاتِ باری تعالیٰ بنائی جاسکتی ہیں، لہذا ہم مذکورہ افعالِ باری تعالیٰ سے محبت، کراہت اور غضب کی صفات ثابت کریں گے۔ اسی لیے اہل علم نے کہا ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کا دائرہ اسماءِ حسنیٰ کی نسبت وسیع ہے۔

(مدارج السالکین لابن القیم: 415/3)

③ اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ باری تعالیٰ سے پناہ بھی پکڑی جاسکتی ہے اور ان کی قسم بھی اٹھائی جاسکتی ہے، اس معاملے میں اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ مشترک ہیں۔ البتہ بندگی و دعا میں یہ مختلف ہیں کہ اسمائے حسنیٰ سے بندگی کا اظہار کیا جاتا ہے، چنانچہ ہم اپنا نام عبد الکریم، عبد الرحمن اور عبد العزیز رکھ سکتے ہیں، لیکن عبد الکریم، عبد الرحمت، عبد العزت نام رکھنا جائز نہیں۔ اسی طرح اسمائے حسنیٰ کے ذریعے دعا کی جاسکتی ہے، جیسا کہ اے رحیم! ہم پر رحم فرما، اے کریم! ہم پر کرم فرما، اے لطیف! ہم پر لطف فرما، لیکن ہم صفاتِ باری تعالیٰ کو پکار نہیں سکتے، چنانچہ اے اللہ کے کرم! اور اے اللہ کے لطف! نہیں کہا جاسکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صفت کبھی موصوف نہیں ہوتی۔ اللہ کی رحمت اللہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کی صفت ہے، اسی طرح عزت اور دیگر صفات کا معاملہ ہے کہ یہ صفات ہیں، عین اللہ نہیں۔ عبادت صرف اللہ کی جائز ہے اور دعا بھی صرف اللہ سے کی جاسکتی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا﴾ (النور: 24: 55)

”وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں کریں گے۔“



نیز فرمایا: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (غافر 40 : 60)  
 ”تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔“  
 دیگر کئی آیات مبارکہ میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے۔

(فتاویٰ الشیخ ابن عثیمین: 26/1، بترتیب أشرف عبد المقصود)

## صفات باری تعالیٰ کے بارے میں عمومی قواعد

① إِبْثَاتُ مَا أَثْبَتَهُ اللَّهُ لِنَفْسِهِ فِي كِتَابِهِ، أَوْ أَثْبَتَهُ لَهُ رَسُولُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؛ مِنْ غَيْرِ تَحْرِيفٍ وَلَا تَعْطِيلٍ، وَمِنْ غَيْرِ تَكْيِيفٍ وَلَا تَمْثِيلٍ .  
 ”جو صفات باری تعالیٰ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یا اس کے رسول ﷺ نے اپنے فرامین میں ثابت کی ہیں، بغیر تحریف و تعطیل اور تکلیف و تمثیل ان سب کا اثبات کرنا ضروری ہے۔“ (عقیدۃ السلف أصحاب الحديث للصابوني، ص : 4، مجموع الفتاوى لابن تيمية : 3/3، 4/182، 5/26، 6/38، 6/515)

کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں دوسروں سے بہتر جانتا ہے اور اس کے رسول ﷺ ساری مخلوق سے بڑھ کر اپنے رب کی معرفت رکھتے تھے۔

② نَفْيُ مَا نَفَاهُ اللَّهُ عَنْ نَفْسِهِ فِي كِتَابِهِ، أَوْ نَفَاهُ عَنْهُ رَسُولُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَعَ اعْتِقَادِ ثُبُوتِ كَمَالِ ضِدِّهِ لِلَّهِ تَعَالَى .

”اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جن چیزوں سے اپنی ذات کو منزہ و مبرا قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے فرامین میں جن چیزوں کی ذات باری تعالیٰ سے نفی کر دی ہے، ان کی نفی کرنا اور ان کی کمال ضد کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا ضروری ہے۔“

(العقيدة التدميرية لابن تيمية، ص : 58، الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح)

(لابن تيمية : 3/139)



اللہ تعالیٰ سے موت کی نفی کرنے میں اس کی کمال حیات کا اثبات شامل ہے، اس سے ظلم کی نفی کرنے میں اس کے کمال عدل کا اثبات ہے اور اس سے نیند کی نفی کرنے میں اس کی کمال قیومیت کا اثبات ہے۔

③ صِفَاتُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ تَوْقِيفِيَّةٌ، فَلَا يَثْبُتُ مِنْهَا إِلَّا مَا أَثْبَتَهُ اللَّهُ لِنَفْسِهِ، أَوْ أَثْبَتَهُ لَهُ رَسُولُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَا يُنْفَى عَنِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ إِلَّا مَا نَفَاهُ عَنْ نَفْسِهِ، أَوْ نَفَاهُ عَنْهُ رَسُولُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

”صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات وحی الہی پر موقوف ہے، یعنی صرف وہی صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی جائیں گی، جو خود اللہ نے اپنے لیے ثابت کی ہیں یا اس کے رسول ﷺ نے اس کے لیے ثابت کی ہیں۔ اسی طرح صرف انہی چیزوں کی اللہ تعالیٰ سے نفی کی جائے گی، جن چیزوں کی خود اللہ نے یا اس کے رسول ﷺ نے ذات الہی سے نفی کی ہے۔“ (مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ: 26/5)

④ التَّوَقُّفُ فِي الْأَلْفَاظِ الْمُجْمَلَةِ الَّتِي لَمْ يَرِدْ اثْبَاتُهَا وَلَا نَفْيُهَا، أَمَّا مَعْنَاهَا؛ فَيُسْتَفْصَلُ عَنْهُ، فَإِنْ أُرِيدَ بِهِ بَاطِلٌ يُنْزَعُ اللَّهُ عَنْهُ، رُدٌّ، وَإِنْ أُرِيدَ بِهِ حَقٌّ لَا يَمْتَنِعُ عَلَى اللَّهِ، قَبْلَ، مَعَ بَيَانٍ مَا يَدُلُّ عَلَى الْمَعْنَى الصَّوَابِ مِنَ الْأَلْفَاظِ الشَّرْعِيَّةِ، وَالِدَّعْوَةُ إِلَى اسْتِعْمَالِهِ مَكَانَ هَذَا اللَّفْظِ الْمُجْمَلِ الْحَادِثِ.

”ایسے مجمل الفاظ جن کا اثبات یا نفی ثابت نہیں، ان کے استعمال میں توقف کیا جائے۔ رہا ان الفاظ کے معانی کا معاملہ، تو ایسے الفاظ استعمال کرنے والوں سے تفصیل طلب کی جائے۔ اگر ان کی مراد ایسی باطل ہو جس سے اللہ تعالیٰ منزہ و مبرا ہے، تو انہیں رد کر دیا جائے اور اگر ان کی مراد ایسی ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں اطلاق ممتنع نہیں، تو

انہیں قبول کر لیا جائے، البتہ ساتھ ہی وہ شرعی الفاظ بھی بیان کر دیئے جائیں جو درست معنی پر دلالت کرتے ہوں، نیز ان نئے مجمل الفاظ کی بجائے شرعی الفاظ کے استعمال کی ترغیب بھی دی جائے۔“

(التدمیریۃ لابن تیمیۃ، ص: 65، مجموع الفتاویٰ لابن تیمیۃ: 5/299، 36/6)

اس کی مثال لفظ جہت ہے۔ ہم اس کے اثبات یا نفی میں توقف کریں گے اور اس کا اطلاق کرنے والے سے یہ سوال کریں گے: آپ کی اس لفظ سے کیا مراد ہے؟ اگر وہ کہے کہ میری مراد ایسی جگہ ہے، جو ذات باری تعالیٰ کو محیط ہے، تو ہم کہیں گے: یہ معنی باطل ہے، اس سے اللہ تعالیٰ منزہ و مبرا ہے۔ ہم اس معنی کو رد کر دیں گے۔ البتہ اگر وہ کہے کہ میری مراد مطلق بلندی ہے، تو ہم کہیں گے: یہ معنی حق ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں ممتنع نہیں۔ ہم اس معنی کو قبول کر لیں گے، لیکن ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ اس طرح کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے: اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر یا بلندی میں ہے۔ صحیح دلائل انہی الفاظ کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ لفظ جہت تو مجمل اور نیا لفظ ہے، جس کا ذات باری تعالیٰ کے بارے میں استعمال ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔

⑤ كُلُّ صِفَةٍ ثَبَتَتْ بِالنَّقْلِ الصَّحِيحِ، وَافَقَتْ الْعَقْلَ الصَّرِيحَ،

وَلَا بُدَّ .

”ہر وہ صفت جو نقل صحیح سے ثابت ہو، ضروری طور پر عقل صریح کے بھی موافق ہوتی

ہے۔“ (مختصر الصواعق المرسلۃ لابن قیم: 1/141، 253)

⑥ قَطَعَ الطَّمْعُ عَنْ إِذْرَاكَ حَقِيقَةَ الْكَيْفِيَّةِ .

”ضروری ہے کہ صفات باری تعالیٰ کی کیفیت کے ادراک کی خواہش نہ کی جائے۔“

(منہج ودراسات لآیات الأسماء والصفات للشنقيطي، ص: 26)



کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طہ 20 : 110)

”وہ اللہ کا علم کے ذریعے احاطہ نہیں کر سکتے۔“

④ صِفَاتُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ تُثَبَّتُ عَلَى وَجْهِ التَّفْصِيلِ، وَتُنْفَى

عَلَى وَجْهِ الْإِجْمَالِ.

”جب کسی صفت کو باری تعالیٰ کے لیے ثابت کیا جائے، تو تفصیل کی جائے، لیکن

جب اللہ تعالیٰ کی ذات سے کسی چیز کی نفی کی جائے، تو اجمال سے کام لیا جائے۔“

(مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ: 37/6، 515)

صفات کے اثبات میں تفصیل یوں ہوگی کہ سمع و بصر اور دیگر صفات کو الگ الگ ثابت

کیا جائے، جبکہ نفی میں اجمال یوں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی مثل کی نفی کرتے ہوئے صرف یہ کہا

جائے کہ:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ 42 : 11)

”اللہ کے مثل کوئی چیز نہیں۔“

⑤ كُلُّ اسْمٍ ثَبَتَ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ؛ فَهُوَ مُتَضَمِّنٌ لِصِفَةٍ، وَلَا عَكْسَ.

”ہر وہ اسم جو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے، اس میں کوئی نہ کوئی صفت ضرور موجود

ہے، لیکن ہر صفت سے کوئی نام ثابت نہیں ہوتا۔“ (بدائع الفوائد لابن القيم: 162/1،

القواعد المثلی فی صفات اللہ وأسمائه الحسنی لابن عثیمین، ص: 30)

اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام ”رحمن“ میں صفتِ رحمت موجود ہے، اسی طرح

”کریم“ میں صفتِ کرم اور ”لطیف“ میں صفتِ لطف موجود ہے، لیکن صفاتِ باری تعالیٰ





”ارادہ، اتیان، استواء“ وغیرہ سے نام بنا کر ہم اللہ تعالیٰ کو ”مرید، آتی، مستوی“ نہیں کہہ سکتے۔

⑨ صِفَاتُ اللَّهِ تَعَالَى كُلُّهَا صِفَاتُ كَمَالٍ، لَا نَقْصَ فِيهَا بِوَجْهِ  
مِّنَ الْوُجُوهِ.

”اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمال والی ہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی نقص موجود نہیں۔“ (مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ: 5/206، مختصر الصواعق المرسلۃ لابن القیم: 1/232، بدائع الفوائد لابن القیم: 1/168)

⑩ صِفَاتُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ ذَاتِيَّةٌ وَفَعْلِيَّةٌ، وَالصِّفَاتُ الْفِعْلِيَّةُ  
مُتَعَلِّقَةٌ بِأَفْعَالِهِ، وَأَفْعَالُهُ لَا مُنْتَهَى لَهَا.

”اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی بھی ہیں اور فعلی بھی۔ جو صفات فعلی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے افعال سے تعلق رکھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے افعال کی کوئی انتہا (شمار) نہیں، (لہذا فعلی صفات بھی بے شمار ہیں)۔“

(القواعد المثلی فی صفات اللہ وأسمائه الحسنیٰ لابن عثیمین، ص: 30)

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ﴾ (إبراهيم 14: 27)

”اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔“

⑪ دَلَالَةُ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ عَلَى ثُبُوتِ الصِّفَةِ؛ إِمَّا التَّصْرِيحُ بِهَا،  
أَوْ تَضَمُّنُ الْإِسْمِ لَهَا، أَوْ التَّصْرِيحُ بِفِعْلِ أَوْ وَصْفٍ دَالٍّ عَلَيْهَا.

”کتاب و سنت سے کسی صفت باری تعالیٰ کا ثبوت تین طرح سے ہو سکتا ہے؛ ایک اس کا واضح بیان آجائے، دوسرے کسی نام سے ثابت ہو جائے، تیسرے کسی فعل و وصف



باری تعالیٰ سے اس کا اثبات ہو جائے۔“

(القواعد المثلی فی صفات اللہ وأسمائه الحسنی لابن عثیمین، ص: 38)

۱۔ تصریح کی مثال، جیسے رحمت، عزت، قوت، چہرہ، دو ہاتھ اور انگلیوں کی صفاتِ باری تعالیٰ صریح طور پر قرآن و سنت میں مذکور ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے کسی نام سے صفت کا ثبوت، جیسے اللہ تعالیٰ کے نام ”بصیر“ میں صفتِ بصر اور ”سمیع“ میں صفتِ سمع موجود ہے۔

۳۔ کسی فعل و وصفِ باری تعالیٰ سے صفت کا اثبات، جیسے صفتِ استواء اس فرمانِ باری تعالیٰ سے ثابت ہو رہی ہے:

﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾ (طہ 5. 20)

”رحمن عرش پر مستوی ہوا۔“

نیز اس فرمانِ باری تعالیٰ سے صفتِ انتقام ثابت ہو رہی ہے:

﴿إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ﴾ (السجدة 32: 22)

”یقیناً ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں۔“

⑫ صِفَاتُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ يُسْتَعَاذُ بِهَا وَيُحْلَفُ بِهَا.

”صفاتِ باری تعالیٰ کی پناہ پکڑی جا سکتی ہے اور ان کی قسم بھی اٹھائی جا سکتی

ہے۔“ (مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ: 143/6، 229، 273/35)

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ».

”(اے اللہ!) میں تیرے غصے سے تیری رضا کی پناہ میں آتا ہوں اور تیری سزا سے

تیری معافی کی پناہ میں آتا ہوں۔“ (صحیح مسلم: 486)



اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے ”کتاب الایمان والندو“ میں یہ باب قائم فرمایا ہے:  
بَابُ الْحَلْفِ بِعِزَّةِ اللَّهِ وَصِفَاتِهِ وَكَلِمَاتِهِ .

”اللہ تعالیٰ کی عزت، اس کی دیگر صفات اور اس کے کلمات کی قسم اٹھانے کا بیان۔“  
⑬ الْكَلَامُ فِي الصِّفَاتِ كَالْكَلَامِ فِي الذَّاتِ .

”صفاتِ باری تعالیٰ کا معاملہ بالکل ذاتِ باری تعالیٰ کی طرح ہے۔“

(الكلام على الصفات للخطيب البغدادي، ص: 20، الحجة في بيان المحجة لقوام السنة  
الأصبهاني: 174/1، التدمرية لابن تيمية، ص: 43، مجموع الفتاوى لابن تيمية: 330/5،  
355/6)

یعنی جس طرح اس کی ذات حقیقی ہے، لیکن مخلوق کی ذاتوں سے مشابہ نہیں، اسی طرح  
اس کی صفات بھی حقیقی ہیں، لیکن مخلوق کی صفات سے مشابہ نہیں۔ نیز جس طرح ذاتِ باری  
تعالیٰ کے اثبات میں وجود کا اثبات کیا جاتا ہے، کیفیت کا نہیں، اسی طرح صفاتِ باری تعالیٰ  
کے اثبات میں بھی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔

⑭ الْقَوْلُ فِي بَعْضِ الصِّفَاتِ كَالْقَوْلِ فِي الْبَعْضِ الْآخِرِ .

”کچھ صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں جو (اقراری) رویہ اختیار کیا جاتا ہے، وہ باقی  
تمام صفات کے بارے میں بھی اختیار کرنا ضروری ہے۔“

(التدمرية لابن تيمية، ص: 31، مجموع الفتاوى لابن تيمية: 212/5)

یعنی جو شخص سمع و بصر اور ارادہ کی صفاتِ باری تعالیٰ کا اقرار کرتا ہے، اس کے لیے  
ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت، رضا، غضب اور کراہیت والی صفات کو بھی تسلیم  
کرے۔ کچھ صفات کا اقرار اور کچھ کا انکار عقلی طور پر بھی درست نہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جو شخص صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں فرق والی روش اختیار کرتا ہے، حالانکہ ساری صفات اسبابِ حقیقت و مجاز میں برابر ہیں، ایسے شخص کا قول متناقض ہے، اس کا مذہب بے تکا ہے اور وہ ان لوگوں کی روش اختیار کیے ہوئے ہے، جو کتاب کی بعض آیات پر ایمان لاتے اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔“ (مجموع الفتاویٰ: 212/5)

⑮ مَا أَضِيفَ إِلَى اللَّهِ مِمَّا هُوَ غَيْرُ بَائِنٍ عَنْهُ؛ فَهُوَ صِفَةٌ لَهُ غَيْرُ مَخْلُوقَةٍ، وَكُلُّ شَيْءٍ أُضِيفَ إِلَى اللَّهِ بَائِنٌ عَنْهُ؛ فَهُوَ مَخْلُوقٌ، فَلَيْسَ كُلُّ مَا أُضِيفَ إِلَى اللَّهِ يَسْتَلْزِمُ أَنْ يَكُونَ صِفَةً لَهُ.

”جس چیز کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور وہ چیز اللہ سے جدا نہیں ہے، وہ اللہ کی صفت ہے مخلوق نہیں۔ اس کے برعکس جس چیز کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، لیکن وہ اس سے جدا ہے، وہ مخلوق ہے۔ ہر وہ چیز جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، ضروری نہیں کہ وہ اللہ کی صفت ہی ہو۔“

(الجواب الصحيح لمن بدّل دين المسيح لابن تيمية: 145/3، مجموع الفتاویٰ لابن تيمية: 290/9، مجموع فتاویٰ و رسائل ابن عثيمين: 166/1)

جو چیز اللہ کی طرف منسوب ہے اور اس سے جدا نہیں، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کی سمع و بصر اور رضا و سخط (ناراضی) ہے۔ یہ اللہ کی صفات ہیں۔

اور جو چیز اللہ کی طرف منسوب ہے، لیکن اس سے جدا ہے، اس کی مثال بیت اللہ (اللہ کا گھر) اور ناقۃ اللہ (اللہ کی اونٹنی)۔ بیت یا ناقہ کو اللہ کی صفت نہیں کہا جاسکتا۔

⑯ صِفَاتُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَسَائِرُ مَسَائِلِ الْإِعْتِقَادِ تَثْبُتُ بِمَا ثَبَتَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَإِنْ كَانَ حَدِيثًا وَاحِدًا، وَإِنْ كَانَ آحَادًا.



”صفاتِ باری تعالیٰ اور تمام اعتقادی مسائل رسول اللہ ﷺ کی ایک ہی حدیث، چاہے وہ آحاد ہی ہو، سے ثابت ہو جاتے ہیں۔“

(مختصر الصواعق المرسلۃ لابن القیم: 2/332، 412، 433)

⑫ مَعَانِي صِفَاتِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ الثَّابِتَةُ بِالْكِتَابِ أَوْ السُّنَّةِ  
مَعْلُومَةٌ، وَتُفَسَّرُ عَلَى الْحَقِيقَةِ، لَا مَجَازَ وَلَا اسْتِعَارَةَ فِيهَا أَلْبَتَهُ، أَمَّا  
الْكَيْفِيَّةُ؛ فَمَجْهُولَةٌ.

”جو صفاتِ باری تعالیٰ کتاب و سنت سے ثابت ہیں، ان کے معانی معلوم ہیں، ان کا حقیقی معنی ہی لیا جائے، ان کے معانی میں مجاز و استعارہ کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔ رہی ان کی کیفیت تو وہ معلوم نہیں۔“ (التدمریۃ لابن تیمیۃ، ص: 43-44، مجموع الفتاویٰ لابن تیمیۃ: 5/36-42، مختصر الصواعق المرسلۃ لابن القیم: 2/1)

⑬ مَا جَاءَ فِي الْكِتَابِ أَوْ السُّنَّةِ، وَجَبَ عَلَى كُلِّ مُؤْمِنٍ الْقَوْلُ  
بِمُوجِبِهِ وَالْإِيمَانُ بِهِ، وَإِنْ لَمْ يَفْهَمْ مَعْنَاهُ.

”کتاب و سنت میں جو بات ذکر ہو جائے، اس کا معنی سمجھ نہ بھی سکے، تو ہر مؤمن کے لیے اس پر ایمان لانا اور اسی کے مطابق اپنا مذہب بنانا فرض ہو جاتا ہے۔“

(التدمریۃ لابن تیمیۃ، ص: 65، مجموع الفتاویٰ لابن تیمیۃ: 5/298، دقائق التفسیر لابن تیمیۃ: 5/245)

⑭ بَابُ الْإِخْبَارِ أَوْسَعُ مِنْ بَابِ الصِّفَاتِ، وَمَا يُطْلَقُ عَلَيْهِ مِنَ  
الْإِخْبَارِ؛ لَا يَجِبُ أَنْ يَكُونَ تَوْقِيفِيًّا، كَالْقَدِيمِ، وَالشَّيْءِ، وَالْمَوْجُودِ ---.

”اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سلسلے میں بیان، صفات کے دائرے سے بہت وسیع ہے۔ یہ



بیانِ توقیفی ہونا ضروری نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں خبر دینے کے لیے قدیم، شے اور موجود کے الفاظ استعمال کرنا۔“ (بدائع الفوائد لابن قیم: 162/1)

②٠ صِفَاتُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ لَا يُقَاسُ عَلَيْهَا .

”صفاتِ باری تعالیٰ میں (ایک کو دوسری پر) قیاس کرنا جائز نہیں۔“

(شأن الدعاء للخطابی، ص: 111)

مثلاً صفت ”سخاء“ کو ”جود“ پر، ”ہمت“ کو ”قوت“ پر، ”استطاعت“ کو ”قدرت“ پر، ”رقت“ کو ”رحمت و رافت“ پر اور ”معرفت“ کو ”علم“ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے سلسلے میں نصوصِ شرعیہ سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔

②١ صِفَاتُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ لَا حَضَرَ لَهَا، لِأَنَّ كُلَّ اسْمٍ يَتَضَمَّنُ

صِفَةً، -----، وَأَسْمَاءُ اللَّهِ لَا حَضَرَ لَهَا، فَمِنْهَا مَا اسْتَأْثَرَ اللَّهُ بِهِ فِي عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَهُ .

”اللہ تعالیٰ کی صفات بے شمار ہیں، کیونکہ ہر اسم میں کوئی نہ کوئی صفت موجود ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا شمار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام تو ایسے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس علمِ غیب میں چھپائے ہوئے ہیں۔“

## صفاتِ باری تعالیٰ کی اقسام

اللہ تعالیٰ کی صفات کو تین طرح سے تقسیم کیا جاسکتا ہے؛

- ① اثبات و نفی کے اعتبار سے۔
- ② ذاتِ الہی اور افعالِ باری تعالیٰ سے تعلق رکھنے کے اعتبار سے۔
- ③ ثبوت و دلائل کے اعتبار سے۔



ان تینوں قسموں میں سے ہر قسم کی پھر دو قسمیں ہیں؛

آئیے تفصیل سے ملاحظہ فرمائیں :

① اثبات نفی کے اعتبار سے :

(ا) صفات ثبوتیہ :

یہ وہ صفات ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیے یا اس کے رسول ﷺ نے اللہ کے لیے ثابت کیا ہے، مثلاً صفت استواء، نزول، وجہ (چہرہ)، ید (ہاتھ) وغیرہ۔ یہ ساری مدح و کمال پر مشتمل صفات ہیں۔ کتاب و سنت میں منقول اکثر صفات باری تعالیٰ اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا اثبات ضروری ہے۔

(ب) صفات سلبیہ :

یہ وہ صفات ہیں، جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ سے یا اس کے رسول ﷺ نے ذات باری تعالیٰ سے نفی کیا ہے۔ یہ ساری نقص والی صفات ہیں، مثلاً موت، اونگھ، نیند، ظلم وغیرہ۔ عموماً کتاب و سنت میں ان صفات سے پہلے حرف نفی، جیسے لا، ما، لیس وغیرہ آتا ہے۔ ان صفات کی ذات باری تعالیٰ سے نفی کرنا اور ان کی کمال والی ضد [جیسے موت کی ضد کمال حیات ہے] کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا ضروری ہے۔

② ذات الہی اور افعال باری تعالیٰ سے تعلق رکھنے کے اعتبار سے :

(ا) صفات ذاتیہ :

یہ وہ صفات ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا، مثلاً علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، چہرہ، ہاتھ، وغیرہ۔

(ب) صفات فعلیہ :

یہ وہ صفات ہیں، جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت و قدرت سے ہوتا ہے، اللہ چاہے تو



کرے، نہ چاہے تو نہ کرے، مثلاً محبت (آنا)، نزول، غضب، فرح (خوش ہونا)، ضحک (ہنسنا) وغیرہ۔ انہیں صفاتِ اختیار یہ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے افعال بھی دو طرح کے ہوتے ہیں :

① افعالِ لازمہ، جیسے استواء، نزول، اتیان وغیرہ۔

② افعالِ متعدیہ، جیسے خلق، عطاء وغیرہ۔

افعالِ باری تعالیٰ کا کوئی شمار نہیں۔ فرمانِ الہی ہے :

﴿وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ﴾ (إبراهيم 14 : 27)

”اور اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔“

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کی صفاتِ فعلیہ کا بھی کوئی شمار نہیں۔

ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہونے کی بنا پر صفاتِ فعلیہ کو صفاتِ ذات بھی کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے صادر ہونے والے اقوال و افعال سے تعلق کی بنا پر انہیں صفاتِ افعال کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال صفتِ کلام ہے کہ یہ صفت اپنی اصل اور نوع کے اعتبار سے صفتِ ذات ہے اور کلام کی اکائی اور فرد ہونے کے اعتبار سے صفتِ فعل ہے۔

③ ثبوت و دلائل کے اعتبار سے :

① صفاتِ خبریہ :

یہ وہ صفات ہیں، جن کے اثبات کا انحصار صرف اللہ اور اس کے رسول سے منقول خبر پر ہے۔ انہیں صفاتِ سمعیہ یا نقلیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں صفاتِ ذاتیہ بھی ہو سکتی ہیں، جیسے چہرہ اور دو ہاتھ ہیں اور فعلیہ بھی ہو سکتی ہیں، جیسے فرح و ضحک وغیرہ۔

② صفاتِ سمعیہ و عقلیہ :

یہ ایسی صفات ہیں، جن کا اثبات نقلی دلائل سے بھی ہوتا ہے اور عقلی دلائل سے بھی۔ یہ





کبھی صفاتِ ذاتیہ ہوتی ہیں، جیسے حیات، علم، قدرت وغیرہ اور کبھی صفاتِ فعلیہ ہوتی ہیں، جیسے خلق اور عطا وغیرہ۔

## صفاتِ باری تعالیٰ پر ایمان کے ثمرات

صفاتِ باری تعالیٰ کے علم، ان پر ایمان اور تدبر کے بڑے ثمرات اور گراں قدر فوائد ہیں۔ ان فوائد و ثمرات کو حاصل کرنے والے ایمان کی حلاوت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد، جو تعطیل و تاویل اور تشبیہ کی مرتکب ہے، ان فوائد سے محروم ہو گئی ہے۔ صفاتِ باری تعالیٰ پر ایمان کے کچھ فوائد و ثمرات درج ذیل ہیں:

① صفاتِ باری تعالیٰ پر ایمان کا ایک فائدہ یہ ہے کہ بندہ اپنی اوقات کے مطابق ان صفات سے متصف ہونے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ اہل دانش کو معلوم ہے کہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کی صفات اپنانا پسند کرتا ہے، اسی طرح محبوب بھی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا محب اس کی صفات کو اپنائے۔ یہ بات اپنے رب سے محبت کرنے والے بندے کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی اوقات کے مطابق صفاتِ باری تعالیٰ سے متصف ہو۔ اللہ تعالیٰ کریم ہے، کرم کو پسند کرتا ہے، رحیم ہے، رحم کو پسند کرتا ہے، نرم ہے، نرمی کو پسند کرتا ہے۔ جب بندے کو یہ صفات معلوم ہوں گی تو وہ کرم، رحم اور نرمی کی صفات سے متصف ہونے کی کوشش کرے گا۔ یہی معاملہ ان باقی صفات کا ہے، جن سے بندوں کا متصف ہونا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

② بندہ جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفتِ محبت پر ایمان لاتا ہے اور اسے علم ہوتا ہے کہ اللہ رحیم اور ودود (محبت کرنے والا) ہے تو وہ اپنے رب سے مانوس ہو جاتا ہے اور ان کاموں سے اس کا تقرب حاصل کرتا ہے، جن سے اللہ کی محبت و مودت زیادہ ہوتی ہے، جیسا کہ حدیثِ قدسی ہے:



«وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ، حَتَّى أُحِبَّهُ».

”بندہ نفلی کاموں کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ میں اس سے محبت

کرنے لگتا ہوں۔“ (صحیح البخاری: 6502)

اسی طرح بندہ ان لوگوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتا ہے، جن کے بارے میں

حدیث میں آتا ہے:

«إِذَا أَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيلَ، فَقَالَ: إِنِّي أُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبَّهُ، قَالَ:

فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، ثُمَّ يُنَادِي فِي السَّمَاءِ، يَقُولُ: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوهُ،

فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، قَالَ: ثُمَّ يُوَضَّعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ».

”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: میں

فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو۔ جبریل علیہ السلام اس سے محبت کرنے

لگتے ہیں، پھر جبریل علیہ السلام آسمانوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت

کرتا ہے، تم سب بھی اس سے محبت کرو۔ آسمان کی تمام مخلوق اس سے محبت کرنے لگتی

ہے۔ پھر زمین والوں کے دلوں میں بھی اس بندے کے بارے میں نیک نامی ڈال دی جاتی

ہے۔“ (صحیح البخاری: 3209، صحیح مسلم: 2637، واللفظ لہ)

اس عظیم صفت پر ایمان کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو بندہ اللہ کا محبوب بننا چاہتا

ہے، وہ اس کے نبی ﷺ کی پیروی شروع کر دیتا ہے، جیسا کہ فرمان الہی ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (آل عمران 3: 31)

”(اے نبی!) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ

تم سے محبت کرنے لگے گا۔“



اللہ کی بندے سے محبت کا دار و مدار بندے کی اللہ سے محبت پر ہے۔ جب بندے کے دل میں محبت کا درخت لگ جائے اور اسے اخلاص اور نبی اکرم ﷺ کی پیروی کا پانی ملنا شروع ہو جائے، تو وہ اللہ کی توفیق سے ہر وقت طرح طرح کے ثمرات دیتا رہتا ہے۔

③ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم، احاطہ اور معیت پر ایمان لے آتا ہے، تو اس پر ذاتِ باری تعالیٰ کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ جب وہ صفتِ سمع پر ایمان لاتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ساری باتیں سنتا ہے، چنانچہ وہ صرف اچھی بات اپنی زبان سے ادا کرتا ہے۔ جب وہ صفتِ بصر، رؤیت، نظر اور عین پر ایمان لاتا ہے تو جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے، چنانچہ وہ صرف اچھے کام ہی کرتا ہے۔

جس بندے کو معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی باتیں سن رہا ہے اور اس کے کاموں کو دیکھ رہا ہے، جو کچھ وہ کہتا ہے یا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، آپ کے خیال میں کیا ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو وہاں نہ پائے، جہاں سے اس نے اسے منع کیا ہے اور وہاں سے وہ بندہ غائب نہ ہو، جہاں جانے کا اس نے اسے حکم دیا ہے؟

جب اس بندے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے اور وہ اس بات پر ایمان لے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ محبت بھی کرتا ہے اور راضی بھی ہوتا ہے، تو وہ ایسے اعمال سرانجام دیتا ہے، جن کو اس کا معبود و محبوب پسند کرتا ہے اور جن سے وہ راضی ہوتا ہے۔ جب یہی بندہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ غضب، کراہیت، ناراضی، لعنت پر ایمان لاتا ہے، تو وہ ایسے اعمال کرتا ہے، جو اس کے رب کو غصہ نہیں دلاتے اور جن کو وہ ناپسند نہیں کرتا، تاکہ اس کا رب ناراض ہو کر اس پر لعنت کر کے اسے اپنی رحمت سے دُور نہ کر دے۔

جب بندہ اللہ تعالیٰ کی خوشی، بشاشت اور ہنسنے (جیسا اس کی شان کو لائق ہے) کی صفت پر ایمان لاتا ہے، تو وہ اس رب سے مانوس ہو جاتا ہے، جو بندوں سے خوش بھی ہوتا



ہے اور ان پر ہنستا بھی ہے۔

④ جب بندے کو اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت، رافت، رجوع، لطف، معافی، مغفرت، پردہ پوشی اور قبولیتِ دعا کا علم ہوتا ہے اور وہ ان صفات پر ایمان لاتا ہے، تو جب بھی وہ کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، اپنے لیے اللہ سے رحمت، مغفرت اور قبولیتِ توبہ کی دعا کرتا ہے، نیز اللہ کے ہاں اپنے مؤمن بندوں کے لیے پردہ پوشی اور لطف و کرم کی جو عنایت ہے، بندہ اس کا طمع کرتا ہے۔ جب بھی اس سے کوئی گناہ ہوتا ہے، یہ چیزیں اسے اللہ کی طرف رجوع اور توبہ پر آمادہ کرتی ہیں اور یوں کبھی ناامیدی اس کے دل تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفتِ صبر و حلم پر ایمان رکھتا ہے، وہ کیسے مایوس ہو سکتا ہے؟ وہ شخص اللہ کی رحمت سے ناامید کیسے ہوگا، جو جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کرم، جود اور عطاء کی صفات سے متصف ہے؟

⑤ جو شخص یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ قہر، غلبہ، بادشاہت اور نگرانی کی صفات سے متصف ہے، اسے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی، وہ زمین میں دھنسانے اور آخرت سے پہلے دنیا میں عذاب دینے پر قادر ہے، وہ اپنے بندوں پر مکمل غلبہ اور کنٹرول رکھتا ہے اور وہ قدیم بادشاہت اور سلطنت والا ہے۔

⑥ صفاتِ باری تعالیٰ پر ایمان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ ہمہ وقت اپنے رب سے مانگنے میں مشغول رہتا ہے۔ جب گناہ کر بیٹھے، تو اس کی صفتِ رحمت، رجوع، معافی اور مغفرت کے وسیلے سے رحمت، معافی اور مغفرت کی دعا کرتا ہے۔ اگر اسے کسی ظالم و جابر دشمن سے ڈر محسوس ہو، تو اپنے ہاتھوں کو آسمانوں کی طرف بلند کرتے ہوئے قوت، غلبہ، سلطان، قہر اور جبروت کی صفاتِ باری تعالیٰ کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے کہ



اے قوت و سلطنت اور قہر و غلبے والی ذات! مجھے اس دشمن کے مقابلے میں کافی ہو جا۔  
اگر وہ ایمان رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کفالت کرنے والا، حفاظت کرنے والا، کافی ہونے والا اور کارساز ہے، تو وہ کہتا ہے: ہمیں اللہ ہی کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ وہ واحد، احد اور بے نیاز پر توکل کرتا ہے۔ اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ عزت، شدت، انتقام، قوت اور طاقت والی ذات اسے دشمنوں سے بچالے گی۔

جب اس پر تنگدستی آ جائے، تو وہ غناء، کرم، جود اور عطاء والی صفات کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے۔ جب اسے کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے، تو وہ اللہ کو پکارتا ہے، کیونکہ اللہ طبیب، شفا دینے والا اور کافی ہو جانے والا ہے۔ اگر وہ اولاد سے محروم ہو، تو وہ اللہ سے نیک اولاد کی دُعا کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ ہی عطا فرمانے والا ہے۔ یوں صفات باری تعالیٰ کا علم رکھنے اور ان پر ایمان لانے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا رہتا ہے۔

④ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عظمت، جلال، قوت اور غلبے پر غور و فکر کرتا ہے، تو اپنے آپ کو حقیر سمجھنے اور جانے لگتا ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ تکبر کی صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، تو وہ کبھی کسی پر تکبر نہیں کرتا، نہ ہی اللہ تعالیٰ کے لیے خاص صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

جب اسے علم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غناء، بادشاہت اور عطاء کی صفات سے متصف ہے، تو سمجھ لیتا ہے کہ وہ اپنے اس غنی آقا اور مالک الملک کا محتاج ہے جو جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔

⑤ جب بندے کو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قوت، عزت اور غلبے کی صفات سے متصف ہے اور ان پر ایمان بھی لے آتا ہے، تو یہ بات بھی بخوبی جان لیتا ہے کہ اس کی



قوت و عزت اللہ کی دی ہوئی ہے، چنانچہ وہ کسی کافر کے سامنے ذلیل و خوار نہیں ہوتا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ کا فرمانبردار رہے گا، تو اللہ تعالیٰ بھی اس کا حامی و مددگار ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے امر پر کسی کو غلبہ نہیں۔

⑨ اللہ کی صفات پر ایمان لانے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت، الوہیت، شریعت سازی اور تحلیل و تحریم میں دخل دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اللہ کی وحی کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور اپنے فیصلے وحی کی طرف ہی لے کر جاتا ہے، وہ اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام نہیں کہتا، نہ اللہ کی حرام کردہ کو حلال کہتا ہے۔

⑩ جب کوئی بندہ یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی شان کو لائق ہے، وہ صفتِ کید، مکر، استہزاء اور خداع سے متصف ہے، تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے خلاف مکر و تدبیر نہیں کر سکتا۔ اللہ ہی بہترین مکر و تدبیر کرنے والا ہے۔ کوئی اللہ تعالیٰ سے استہزاء نہیں کر سکتا، نہ اسے دھوکا دے سکتا ہے، کیونکہ جیسے اللہ کی شان کو لائق ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے استہزاء کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بندے سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے سزا دیتا ہے۔ گویا ان صفات پر ایمان بندے کو اللہ کے غصے اور ناراضی والے کاموں میں ملوث ہونے سے بچاتا ہے۔

⑪ بندہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہ بھولے اور اس کے ذکر کو ترک نہ کرے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صفتِ نسیان (فراموشی) اور ترک (بے یار و مددگار چھوڑنے) سے متصف ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو فراموش کرنے، یعنی بے یار و مددگار چھوڑنے پر قادر ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ (التوبة: 67)

”انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں فراموش کر (بے یار و مددگار چھوڑ) دیا۔“



اس طرح بندہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو یاد رکھتا ہے۔

۱۲) جو بندہ یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سلامتی، امن اور صدق کی صفت سے متصف ہے، وہ اپنے اندر اطمینان اور امن پسندی محسوس کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سلامتی والا ہے اور سلامتی کو پسند کرتا ہے، تو وہ مومنوں کے درمیان سلامتی پھیلاتا ہے اور یہی وہ مومن ہوتا ہے جس کے ظلم سے مخلوق محفوظ و مامون رہتی ہے۔ جب بندے کا اعتقاد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ صدق کی صفت سے متصف ہے اور اس نے نیک اعمال کرنے کی صورت میں ایسے باغات کا وعدہ دیا ہے، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کا سچا ہے، وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔

یہ عقیدہ بندے کو اللہ تعالیٰ کا اور زیادہ مطیع و فرمانبردار بنا دیتا ہے، اس مزدور اور محنت کش کی طرح جو اپنے آقا اور کام لینے والے پر مکمل بھروسہ رکھتا ہو کہ وہ اسے اس کا پورا حق بھی دے گا اور زائد انعام بھی دے گا۔

۱۳) اللہ تعالیٰ کی صفات خبریہ، جیسے چہرہ، دو ہاتھ، انگلیاں، پورے، دو قدم، پنڈلی وغیرہ، بندوں کے لیے سخت امتحان سے کم نہیں۔ جو شخص ان صفات کو اس طرح تسلیم کر لیتا ہے، جس طرح یہ اللہ کو لائق ہیں اور اس سلسلے میں کسی تمثیل، تحریف اور تکلیف سے کام نہیں لیتا، صفت علم، حیات، قدرت اور ان صفات میں (تسلیم کرنے کے حوالے سے) کوئی فرق نہیں کرتا، وہ عظیم کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔ اس کے برعکس جس شخص نے اپنی عقلِ سقیم کو نقلِ صحیح پر مقدم کر لیا، ان صفات کی تاویل کرنے لگا، ان کو مجاز قرار دیا اور ان (کو تسلیم کرنے) میں تحریف و تعطیل سے کام لیا، وہ واضح خسارے میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے ایک صفت کے ساتھ اور معاملہ کیا، جبکہ دوسری کے ساتھ اور۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس شخص نے اس میں اللہ کی تکذیب کر دی اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ



تعالیٰ کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس میں آپ ﷺ کو بھی جھٹلا دیا۔

اگر ان صفاتِ خبریہ پر ایمان لانے کا صرف یہ فائدہ ہوتا کہ بندہ ان کو تسلیم کر کے موحدین میں شمار ہو جاتا، تو یہ بھی کافی تھا اور اگر ان صفات پر ایمان کا فائدہ صرف یہی ہوتا کہ ان کے ذریعے اللہ و رسول کی تصدیق کرنے والے مؤمن اور اللہ و رسول کے خلاف جسارت کرنے والے اور ان کے فرامین کی تحریف کرنے والے گستاخ کے درمیان فرق ہو جاتا، تو یہ ثمرہ بھی کافی تھا۔ چہ جائیکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ان صفاتِ خبریہ پر ایمان کے اور بھی بہت سے عظیم فوائد ہیں۔

ایک تو یہ کہ جب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا اس کی شان کے لائق چہرہ ہے اور قیامت کے دن اس پر نظر ڈالنا اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہوگی، جس کا وعدہ اللہ نے اپنے نیک بندوں سے کیا ہے، تو آپ اللہ تعالیٰ سے اس کے معزز چہرے کی طرف دیکھنے کا سوال کریں گے اور اللہ یہ نعمت آپ کو دے دیں گے۔

جب آپ کا یہ ایمان ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا ایسا بھرا ہوا ہاتھ ہے، جس کی عطا میں کبھی کمی نہیں آتی اور ساری بھلائی اس کے ہاتھوں میں ہے، تو آپ اللہ سے اس کے ہاتھوں کی عطا کا سوال کریں گے۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے، تو آپ اس سے اپنے دل کی دین پر استقامت کی دُعا کریں گے۔

⑫ صفاتِ باری تعالیٰ پر ایمان کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کو نقائص سے منزہ و مبرا قرار دیتا ہے اور کمال والی صفات کے ساتھ اسے متصف کرتا ہے۔ جس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ قدوس اور سبحان اللہ کی صفات ہیں، وہ اللہ کو ہر عیب و نقص سے پاک قرار دے گا اور وہ یقین کر لے گا کہ:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشورى 42: 11)





”اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔“

⑮ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفتِ حیات و بقاء کے بارے میں جان لے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایسے معبود کی عبادت کرتا ہے، جو کبھی نہیں مرے گا اور اسے نہ نیند آتی ہے، نہ اونگھ۔ یہ عقیدہ اس کے دل میں اپنے رب کے لیے محبت و تعظیم اور تکریم پیدا کر دے گا۔

⑯ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علُو، فوقیت، استواء علی العرش، نزول، قرب اور دُؤپر ایمان لانے کی وجہ سے بندے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں حلول کرنے سے پاک ہے، وہ ہر چیز سے بلند ہے، ہر چیز پر مطلع ہے، اپنی مخلوق سے جدا ہے، اپنے عرش پر مستوی ہے اور اپنے علم کے اعتبار سے اپنے بندے کے قریب ہے، جب بندے کو اپنے رب سے کوئی حاجت ہوتی ہے تو وہ اس کو اپنے قریب پاتا ہے، اس سے دُعا و التجا کرتا ہے، اللہ اس کی دُعا قبول فرماتا ہے، رات کے آخری تہائی حصے میں اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف، جیسے اس کی شان کو لائق ہے، نزول کرتا ہے اور فرماتا ہے: کون ہے جو مجھے پکارے، تو میں اس کی پکار کو قبول کروں۔

یہ اعتقاد بندے میں ان اوقات کی تلاش کا طمع پیدا کر دیتا ہے، جن میں بندہ اپنے رب سے خلوت میں ملاقات کر سکے۔ اللہ سبحانہ اپنی بلندی کے باوجود (علم کے لحاظ سے) قریب ہے اور اپنے قرب کے باوجود (ذات کے اعتبار سے) دُور ہے۔

⑰ اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام پر ایمان اور قرآنِ کریم کو کلام اللہ تسلیم کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ جب قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا ہے، تو محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام پڑھ رہا ہے۔ جب وہ یہ آیت پڑھتا ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾ (الانفطار 82: 6)



”اے انسان! تجھے تیرے کریم رب کے متعلق کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا ہے؟“  
تو وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے آپ سے ہم کلام محسوس کرتا ہے، اس کا دل خوف سے ہوا ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح جب بندہ صفتِ کلام پر ایمان لانے کے بعد یہ صحیح حدیث پڑھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے اس طرح کلام فرمائے گا کہ درمیان میں کوئی ترجمان نہیں ہوگا، تو وہ دنیا میں اللہ کی نافرمانی سے گریز کرتا ہے اور اس سوال و جواب اور حساب و کتاب کی تیاری کرنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہر صفت پر ایمان لانے کے ایسے ہی عظیم فوائد و ثمرات ہیں۔ اہل سنت پر اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ وہ اس کی ہر صفت پر اسی طرح ایمان لے آئے، جس طرح وہ اس کی شان کے لائق ہے!

**نوٹ:** یہ مضمون علامہ علوی بن عبدالقادر سقاف کی کتاب **صفات اللہ**

**عز وجلّ الواردة في الكتاب والسنة** سے ماخوذ ہے۔

ہر منصف مزاج شخص اس بات کو بخوبی سمجھ لے گا کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں اہل حدیث ہی کا وہ موقف ہے، جو سلف صالحین سے منقول ہے۔ اسلاف قرآن و حدیث میں وارد ہونے والی ہر صفتِ باری تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے، کسی صفت میں تاویل و تحریف یا تمثیل و تکلیف اور تعطیل سے کام نہیں لیتے تھے، اسی طرح اہل حدیث بھی تمام صفاتِ باری تعالیٰ کو بغیر تاویل و تحریف، تمثیل و تکلیف اور تعطیل کے تسلیم کرتے ہیں۔

اس کے برعکس دنیا میں اہل حدیث کے علاوہ کوئی بھی اسلامی مکتبِ فکر ایسا نہیں، جو تمام صفاتِ الہیہ پر من و عن ایمان لاتا ہو۔ اگر کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے، تو دلیل پیش کرے۔  
کیا اہل حدیث کے اہل حق ہونے کے لیے یہی دلیل کافی نہیں؟



## نبی اکرم ﷺ کا طریقہ تیمم

ابن الحسن محمدی

نبی اکرم ﷺ کا جو طریقہ تیمم صحیح احادیث سے ثابت ہے، وہ یوں ہے کہ آپ ﷺ ایک دفعہ مٹی پر دونوں ہاتھ مارتے، پھر چہرے پر پھیرتے اور ہتھیلیوں پر مل لیتے۔ اس کے خلاف آپ ﷺ سے کچھ ثابت نہیں۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں:

**دلیل نمبر ①:** سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

بَعَثَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَاجَةٍ، فَأَجْنَبْتُ، فَلَمْ أَجِدِ الْمَاءَ، فَتَمَرَّغْتُ فِي الصَّعِيدِ كَمَا تَمَرَّغُ الدَّابَّةُ، ثُمَّ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ: «إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ أَنْ تَقُولَ بِيَدَيْكَ هَكَذَا»، ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدَيْهِ الْأَرْضَ ضَرْبَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ مَسَحَ الشِّمَالَ عَلَى الْيَمِينِ، وَظَاهَرَ كَفَّيْهِ، وَوَجَّهَهُ.

”رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک کام کے لیے بھیجا۔ میں جنبی ہو گیا۔ مجھے پانی نہ ملا تو میں مٹی میں جانوروں کی طرح لوٹ پوٹ ہوا۔ پھر میں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: آپ اپنے ہاتھوں کے ساتھ یوں کر لیتے تو یہی کافی تھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک دفعہ اپنے دونوں ہاتھ مبارک زمین پر مارے، پھر بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر پھیرا اور ہر دونوں میں سے ہتھیلی سے مخالف ہاتھ کے باہر والی جانب مسح کیا، پھر دونوں ہتھیلیوں کو اپنے چہرہ مبارک پر پھیرا۔“

(صحیح البخاری: 347، صحیح مسلم: 368، واللفظ لہ)

صحیح بخاری کی ایک روایت (338) کے الفاظ یہ ہیں:

فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ هَكَذَا»،  
وَضَرَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَفِّهِ الْأَرْضَ، وَنَفَخَ فِيهِمَا، ثُمَّ  
مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفِّهِ.

”نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: آپ کے لیے یہی کافی تھا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ مبارک زمین پر مارے اور ان میں پھونکا۔ پھر ان دونوں کے ساتھ اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا۔“

یہ وہ طریقہ تیمم ہے، جس کی تعلیم نبی اکرم ﷺ نے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو دی۔ اس میں زمین پر ایک دفعہ ہاتھ مارنے کا ذکر اور چہرے اور ہتھیلیوں پر پھیرنے کا ثبوت ہے۔ بعض لوگ اس نبوی طریقے سے راضی نہیں۔ وہ اس متفق علیہ حدیث کو تقلیدِ ناسدید پر قربان کر دیتے ہیں اور اس کے بارے میں وہ روش اختیار کرتے ہیں کہ منکرین حدیث بھی شرماتے ہیں۔ بُراہِ تقلید کا جو انسان کو نبی اکرم ﷺ کے دین پر اکتفا نہیں کرنے دیتی۔ جناب تقی عثمانی دیوبندی، حیاتی صاحب اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اس حدیث کا سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اصل مقصود تیمم کے پورے طریقے کی تعلیم دینا نہیں، بلکہ تیمم کے معروف طریقہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ اسی طرح حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی یہ مطلب نہیں کہ ایک ضرب یا مسح کفین (دونوں ہتھیلیوں کے اوپر والے حصے پر مسح) کافی ہے، بلکہ الفاظِ مذکورہ سے طریقہ معروف

کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔“ (درسِ ترمذی: 387/1-388)

جناب حسین احمد مدنی، دیوبندی صاحب کہتے ہیں:



”در اصل اشارہ سے تمرغ اور تمعک کا رد کرنا تھا، افعال تیمم کی تعلیم کرنا نہیں تھا۔“

(تقریر ترمذی، ص: 268)

قارئین کرام! آپ حدیث کے سیاق پر غور کر لیں، پھر تقی اور مدنی صاحبان کی حدیث کے خلاف جرأت کا اندازہ لگائیں۔ حدیث کا ایک ایک لفظ بول بول کر کہہ رہا ہے کہ مقصود طریقہ تیمم تھا۔ پھر قابل غور بات یہ ہے کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے یہی طریقہ تیمم اخذ کیا اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد لوگوں کو اسی کی تعلیم دیتے تھے، جیسا کہ:

ابو مالک، غزوان، کوفی، تابعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: سَمِعْتُ عَمَّارَ بْنَ يَاسِرٍ يَخْطُبُ بِالْكُوفَةِ، وَذَكَرَ التَّيْمُمَ، فَضَرَبَ بِيَدِهِ الْأَرْضَ، فَمَسَحَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ. ”میں نے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں خطبہ دیتے ہوئے سنا۔ آپ نے تیمم کا ذکر کیا تو اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارا اور اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا۔“

(سنن الدارقطني: 702، وسنده صحيح)

سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

إِنَّهُ غَمَسَ بَاطِنَ كَفِّهِ فِي التُّرَابِ، ثُمَّ نَفَخَ فِيهَا، ثُمَّ مَسَحَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ إِلَى الْمَفْصَلِ، وَقَالَ عَمَّارٌ: هَكَذَا التَّيْمُمُ.

”آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی ہتھیلیوں کو مٹی میں ڈبویا، ان پر پھونک ماری، پھر اپنے چہرے اور جوڑ سمیت ہاتھوں پر مسح کیا اور فرمایا: یہ ہے تیمم کا طریقہ۔“ (ایضاً: 703، وسنده صحيح)

کیا سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو احناف مقلدین جتنی بھی سمجھ بوجھ نہیں تھی کہ اس نبوی مراد کو سمجھ پاتے، جو تقی اور مدنی صاحبان نے بیان کی ہے؟ کیا یہ صحابہ کرام کی توہین و تنقیص نہیں ہے اور کیا یہ صحابہ کرام کو (معاذ اللہ) کوتاہ فہم قرار دینے کی سازش نہیں ہے؟

حنفی مقلدین اپنی تائید میں مسند بزار کی یہ روایت بھی پیش کرتے ہیں:



عَنْ عَمَّارٍ، قَالَ : كُنْتُ فِي الْقَوْمِ حَتَّى نَزَلَتِ الرُّخْصَةُ فِي الْمَسْحِ  
بِالتُّرَابِ إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ، فَأَمَرْنَا، فَضَرَبْنَا وَاحِدَةً لِلْوَجْهِ، ثُمَّ ضَرَبْنَا أُخْرَى  
لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ .  
”سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں  
لوگوں میں تھا حتیٰ کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں مٹی کے ساتھ مسح کرنے کی رخصت نازل ہو  
گئی۔ آپ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا تو ہم نے چہرے کے لیے ایک دفعہ مٹی پر ہاتھ مارا، پھر  
دوسری مرتبہ کہنیوں تک ہاتھوں پر مسح کے لیے مٹی پر ہاتھ مارا۔“

(مسند البزار : 1384 ، نصب الرایۃ : 153/1)

لیکن یہ روایت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس کی سند میں امام زہری اور محمد بن اسحاق دونوں  
کی ”تدلیس“ موجود ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا اس کی سند کو ”حسن“ قرار دینا صحیح نہیں۔  
ویسے بھی محمد بن اسحاق بے چارہ فاتحہ خلف الامام کی حدیث بیان کرے تو مقلدین کے  
عتاب کا نشانہ بن جاتا ہے اور یہی محمد بن اسحاق جب ان کے مذہب کے موافق روایت  
بیان کرے، تو اسے سینے سے لگا لیا جاتا ہے۔ کیسا تضاد ہے!

اسی پر بس نہیں، بلکہ جب اپنے مذہب کے خلاف روایت آجائے، تو چاہے کتنی ہی  
قوی اور صحیح کیوں نہ ہو، اس کو ٹھکرا دیا جاتا ہے، خواہ وہ صحیح بخاری ہی کی حدیث ہو، مثلاً:  
سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث، جس کا صحیح ہونا ساری امت مسلمہ کے نزدیک  
مستلم ہے، کے بارے میں جناب حسین احمد مدنی، دیوبندی لکھتے ہیں:

”الحاصل حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت سند کے اعتبار سے قوی سہی، خصوصاً  
دوسرے واقعہ کو۔۔؟ کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، لیکن اس میں شدید اضطراب ہے۔ ① آپ  
کا فعل ہے یا قول؟ ② تیمم بکفہ تھا یا بکفہ (تیمم ایک ہاتھ سے کیا یا دو ہاتھوں سے؟)  
③ مع ظہر الکفین یا الی انصاف الذراعین (صرف ہاتھوں کی اوپر والی جانب مسح کرنا ہے یا



نصف ذراع تک؟)۔ ان اضطرابات کی وجہ سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت کیسے قابل عمل ہو سکتی ہے؟“ (تقریر ترمذی، ص: 265)

مقلدین اپنے تقلیدی مذہب کی خاطر حدیث رسول ﷺ کو مہمل اور ناقابل عمل بنانے سے بھی باز نہیں آتے، حالانکہ محدثین عظام حدیث میں مہارت تامہ رکھنے والے تھے اور حدیث کی مخفی علتوں سے واقف تھے، ان میں سے کسی نے بھی اس حدیث میں اضطراب کا دعویٰ نہیں کیا۔ مقلدین نے محدثین کرام کے علم و فہم کو لات مارتے ہوئے حدیث رسول میں شکوک و شبہات پیدا کرنا شروع کر دیے ہیں۔

خود راوی حدیث سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر عمل کر کے دکھایا۔ اگر یہ حدیث ناقابل عمل تھی، تو سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ رہی بات خود ساختہ اضطراب کی، تو ”مدنی“ صاحب نے تین باتیں ذکر کی ہیں، ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

① آپ ﷺ نے پہلے زبانی فرمایا، پھر اس کو عملی طور پر انجام دے کر دکھا بھی دیا۔

\* جس روایت میں سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے منسوب یہ الفاظ موجود ہیں کہ

آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: چہرے اور ہتھیلیوں کے لیے ایک دفعہ مٹی پر ہاتھ مارو۔

(سنن أبي داود: 327، سنن الترمذي: 144، وقال: حسنٌ صحيحٌ، صحيح ابن خزيمة:

26، صحيح ابن حبان: 1303)

اس کی سند میں سعید بن ابوعروبہ اور ان کے استاذ قتادہ بن دعامہ دونوں ”مدلس“ ہیں، انہوں نے سماع کی تصریح نہیں کی، لہذا یہ روایت ”ضعیف“ ہے۔

② صحیح بخاری (343) میں یہی روایت صراحت کے ساتھ یوں آئی ہے:

وَضَرَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَفَّيْهِ الْأَرْضَ، وَنَفَخَ فِيهِمَا، ثُمَّ

”نبی اکرم ﷺ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مسح بہما وجہہ وکفیہ۔ مارا، ان میں پھونک ماری، پھر دونوں ہاتھوں کے ساتھ اپنے چہرے اور دونوں ہتھیلیوں (کی بیرونی جانب) پر مسح کیا۔“

یہی مطلب ومنہوم صحیح بخاری (347) کے ان الفاظ:

فَضْرَبَ بِكَفَيْهِ الْأَرْضَ . کا ہے۔

۳ سنن ابوداؤد (322) میں ہے:

«إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ أَنْ تَقُولَ هَكَذَا»، وَضْرَبَ بِيَدَيْهِ إِلَى الْأَرْضِ، ثُمَّ نَفَخَهُمَا، ثُمَّ مَسَّ بِهِمَا وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ إِلَى أَنْصَافِ الذَّرَاعِ .

”آپ کے لیے یہی کافی ہے کہ اس طرح کرو۔ پھر آپ ﷺ نے زمین پر دونوں ہاتھ مبارک مارے، ان میں پھونکا، پھر ان کے ساتھ اپنے چہرے پر اور نصف ذراع تک مسح کیا۔“

یہ الفاظ اس روایت کے راوی سلمہ بن کہیل کا شک اور وہم ہیں۔ صحیح حدیث میں کفین (دونوں ہتھیلیوں) کا ذکر ہے۔ اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فَأَمَّا رَوَايَةُ الْمِرْفَقَيْنِ، وَكَذَا نِصْفِ الذَّرَاعِ، فَفِيهِمَا مَقَالٌ .

”رہی کہنیوں اور نصف ذراع والی روایات، تو ان میں مقال ہے۔“

(فتح الباری: 445/1)

**تنبیہ:** ایک روایت میں إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ کے الفاظ ہیں۔

(سنن أبي داود: 328، السنن الكبرى للبيهقي: 220/1)

اس روایت کی سند ”ضعیف“ ہے۔ اس روایت کے بارے میں امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَأَمَّا حَدِيثُ قَتَادَةَ عَنْ مُحَدِّثٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ، فَهُوَ مُنْقَطِعٌ، لَا يُعْلَمُ مَنْ





الَّذِي حَدَّثَهُ، فَيَنْظُرُ فِيهِ . ”رہی قنادہ کی بیان کردہ وہ روایت جس میں ایک محدث کے واسطے سے شعی سے بیان کرتے ہیں، تو وہ منقطع ہے۔ قنادہ کو یہ روایت بیان کرنے والا محدث کون ہے؟ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے حالات دیکھے جاتے۔“

(السنن الكبرى للبيهقي: 220/1)

اس پر ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ یہی روایت مسند طرابلسی (ص: 89) میں موجود ہے اور اس میں شک کے ساتھ یہ الفاظ ہیں: إِلَى الْكُوعَيْنِ أَوْ الْمِرْفَقَيْنِ . لیکن یہ اعتراض بہت بودا ہے، کیونکہ یہ شک امام شعبہ رحمہ اللہ کے استاذ سلمہ بن کہیل کا ہے۔ اس حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا قول ہم چند سطور پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ ہماری ذکر کردہ حدیث عمار رحمہ اللہ امام شعبہ کے استاذ حکم بن عتیبہ نے شک کے بغیر بیان کی ہے۔ یہ روایت دیگر راویوں کے موافق ہے، لہذا اسے ہی ترجیح حاصل ہوگی۔

**دلیل نمبر ۲: (۱)** سیدنا ابو جہیم انصاری رحمہ اللہ کا بیان ہے:

أَقْبَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ نَحْوِ بَيْتِ جَمَلٍ، فَلَقِيَهُ رَجُلٌ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِ، فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، حَتَّى أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ، فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَيَدَيْهِ، ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ .

”نبی اکرم ﷺ بئر جمل کی طرف سے تشریف لائے تو ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے آپ ﷺ کو سلام عرض کیا۔ آپ ﷺ نے اس کو سلام کا جواب نہ دیا، یہاں تک کہ ایک دیوار کے پاس تشریف لائے، اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں پر مسح فرمایا، پھر سلام کا جواب عنایت فرمایا۔“ (صحیح البخاری: 337، صحیح مسلم: 369، تعلیقاً)

(ب) اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ سے روایت ہے:

أَقْبَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْغَائِطِ، فَلَقِيَهُ رَجُلٌ عِنْدَ بَرْجَمَلٍ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِ، فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، حَتَّى أَقْبَلَ عَلَى الْحَائِطِ، فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَى الْحَائِطِ، ثُمَّ مَسَحَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ، ثُمَّ رَدَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الرَّجُلِ السَّلَامَ.

”رسول اکرم ﷺ قضاء حاجت سے فارغ ہو کر آئے تو بزرگمحل کے پاس ایک آدمی آپ ﷺ کو ملا، اس نے سلام عرض کیا۔ آپ ﷺ نے اسے سلام کا جواب نہ دیا، یہاں تک کہ ایک دیوار کے پاس تشریف لائے، اپنے ہاتھ مبارک دیوار پر مارے، پھر اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں پر مسح فرمایا، پھر اس آدمی کے سلام کا جواب مرحمت فرمایا۔“ (سنن أبي داود: 331، سنن الدارقطني: 176/1، ح: 666، السنن الكبرى للبيهقي: 306/1، وسنده حسن)

احادیث ایک دوسری کی تفصیل و تفسیر کرتی ہیں، لہذا ان دونوں حدیثوں میں ہاتھوں سے مراد ہتھیلیاں ہیں، جیسا کہ دوسری صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

## بعض الناس کے دلائل اور ان کا تجزیہ

اب وہ روایات اور اصولِ محدثین کی روشنی میں ان کا منصفانہ تجزیہ پیش خدمت ہے، جن کی بنا پر بعض لوگ تیمم کے نبوی طریقے میں تبدیلی کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

### روایت نمبر ①:

ضَرَبَ يَدَيْهِ عَلَى الْحَائِطِ، وَمَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ، ثُمَّ ضَرَبَ ضَرْبَةً أُخْرَى، فَمَسَحَ ذِرَاعَيْهِ. ”آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دیوار پر مارا اور ان کو اپنے چہرہ مبارک پر پھیرا، پھر دوسری دفعہ ہاتھوں کو دیوار پر مارا اور دونوں بازوؤں پر مسح فرمایا۔“

(سنن أبي داود: 330، سنن الدارقطني: 176/1، ح: 665، شرح معاني الآثار: 85/1)

لیکن اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس کے راوی محمد بن ثابت عبدی، ابو عبد اللہ بصری کو جمہور محدثین کرام نے ”ضعیف“ قرار دیا ہے، جیسا کہ حافظ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَلَيْسَ هُوَ بِالْقَوِيِّ عِنْدَ أَكْثَرِ الْمُحَدِّثِينَ .

”اکثر محدثین کرام کے نزدیک یہ قوی نہیں۔“ (خلاصة الأحكام: 217/1)

**روایت نمبر ۲:** سیدنا ابو جہیم رحمہ اللہ سے منسوب ہے کہ:

فَضْرَبَ الْحَايِطَ بِيَدِهِ ضَرْبَةً، فَمَسَحَ بِهَا وَجْهَهُ، ثُمَّ ضَرَبَ أُخْرَى، فَمَسَحَ بِهَا ذِرَاعَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ .

”آپ ﷺ نے دیوار پر ایک ہاتھ مبارک مارا تو اپنے چہرہ مبارک پر پھیر لیا، پھر دوسری مرتبہ دیوار پر ہاتھ مارا تو کہنیوں تک اپنے ہاتھوں پر مسح فرمایا۔“

(سنن الدارقطني: 674)

یہ جھوٹی روایت ہے، کیونکہ:

① محمد بن خلف بن عبد العزیز بن عثمان بن جبلة کے حالات زندگی نہیں مل سکے۔

② ابو حاتم احمد بن حمدویہ بن جمیل بن مہران مروزی بھی ایسا ہی راوی ہے۔

③ ابو عصمہ نوح بن ابو مریم راوی باتفاق محدثین سخت جھوٹا، ”ضعیف“ اور

”متروک“ ہے۔ اس کے بارے میں ادنیٰ کلمہ توثیق بھی ثابت نہیں۔

ابو عصمہ کی متابعت خارجہ بن مصعب ابو حجاج سرخسی نے کی ہے، اس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ضَعَّفَهُ الْجُمْهُورُ .

”اسے جمہور محدثین کرام نے ضعیف قرار دیا ہے۔“ (طبقات المدلسین، ص: 54)

نیز فرماتے ہیں:

تَرَكَهُ الْجُمْهُورُ .

”اسے جمہور محدثین نے



چھوڑ دیا تھا۔“ (نتائج الأفكار: 262/1، كنز العمال للهندي: 466/9، ح: 26990)

### روایت نمبر ۳: ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ، فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَذَرَاعَيْهِ، ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ.

”آپ ﷺ دیوار کے پاس تشریف لائے، اپنے چہرہ مبارک اور کہنیوں سمیت دونوں

ہاتھوں پر مسح فرمایا، پھر سلام کا جواب عنایت فرمایا۔“ (سنن الدارقطني: 671)

اس روایت میں ذَرَاعَيْهِ (کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں) کے الفاظ ”منکر“ ہیں۔ ان

کو بیان کرنے والا راوی عبد اللہ بن صالح مصری، کاتب الیث ہے۔ اس کے بارے میں امام اہل سنت، احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كَانَ أَوَّلَ أَمْرِهِ مُتَمَاسِكًا، ثُمَّ فَسَدَ بِآخِرَةٍ، وَلَيْسَ هُوَ بِشَيْءٍ.

”یہ شروع میں ثقہ راوی تھا، لیکن آخر عمر میں اس کا حافظہ بگڑ گیا اور یہ ناقابل اعتبار ہو

گیا تھا۔“ (العلل ومعرفه الرجال بروایة ابنه عبد الله: 212/3)

امام ابن خزمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَقَعَ الْمَنَاكِبُ فِي أَخْبَارِهِ.

”اس کی بیان کردہ احادیث میں منکر روایات شامل ہو گئی تھیں۔“

(المجروحین لابن حبان: 40/2)

امام ابن حبان رحمہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے: مُنْكَرُ الْحَدِيثِ جَدًّا، يَرْوِي عَنْ

الْأَثْبَاتِ مَا لَا يُشْبِهُ حَدِيثَ الثَّقَاتِ، وَعِنْدَهُ الْمَنَاكِبُ الْكَثِيرَةُ عَنْ أَقْوَامٍ مَشَاهِيرِ

أَيْمَّةٍ، وَكَانَ فِي نَفْسِهِ صَدُوقًا، يَكْتُبُ لَلَيْثِ بْنِ سَعْدٍ الْحِسَابَ، وَكَانَ كَاتِبَهُ

عَلَى الْغَلَاتِ، وَإِنَّمَا وَقَعَ الْمَنَاكِبُ فِي حَدِيثِهِ مِنْ قَبْلِ جَارٍ لَهُ رَجُلٍ سَوِّءٍ.

”اس کی بیان کردہ احادیث سخت منکر ہیں۔ یہ ثقہ راویوں سے ایسی روایات بیان کرتا



ہے جو ثقہ راویوں کے موافق نہیں ہوتیں۔ اس کے پاس بہت سی منکر روایات ہیں، جو اس نے مشہور ائمہ سے منسوب کی ہیں۔ دراصل یہ خود تو سچا تھا اور لیث بن سعد کے غلوں پر اس کے حساب کتاب لکھتا تھا، لیکن ایک خبیث پڑوسی کی جانب سے اس کی حدیثوں میں منکر روایات کی ملاوٹ ہو گئی۔“ (المجروحین: 2/40)

یہ بھی اس کی ”منکر“ روایت ہے، کیونکہ صحیح بخاری (337) میں لیث کے شاگرد یحییٰ بن کبیر نے فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَيَدَيْهِ کے الفاظ بیان کیے ہیں۔ اسی طرح محمد بن اسحاق کے استاذ عبدالرحمن بن ہرمز نے بھی یہی صحیح بخاری والے الفاظ بیان کیے ہیں۔

(مسند الإمام أحمد: 24277، وسندہ حسن)

حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما (سنن أبي داود: 331، وسندہ حسن) بھی صحیح بخاری والے الفاظ کی تائید کرتی ہے۔

## روایت نمبر ④ : ایک روایت ان الفاظ سے ہے:

ثُمَّ وَضَعَ يَدَيْهِ عَلَى الْجِدَارِ، فَمَسَحَ وَجْهَهُ وَذِرَاعَيْهِ، ثُمَّ رَدَّ عَلَيَّ .  
”پھر آپ ﷺ نے دیوار پر ہاتھ مبارک مارے اور اپنے چہرہ مبارک اور کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں پر پھیرا، پھر میرے سلام کا جواب مرحمت فرمایا۔“

(مسند الشاميين: 1/44، السنن الكبرى للبيهقي: 1/205، شرح السنة للبغوي: 310)

یہ روایت سخت ترین ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

① امام شافعی رحمہ اللہ کے استاذ ابراہیم بن محمد بن ابویحییٰ اسلمی، ابواسحاق مدنی کے

بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: هُوَ مَتْرُوكٌ عِنْدَ الْجُمْهُورِ .

”جمہور کے نزدیک یہ راوی متروک ہے۔“ (دیوان الضعفاء، ص: 13)



حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أَكْثَرُ أَهْلِ الْحَدِيثِ عَلَى تَضْعِيفِ (إِبْرَاهِيمَ) بْنِ أَبِي يَحْيَى .  
”اکثر محدثین کرام ابراہیم بن ابویحییٰ کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔“ (التلخیص الحبیہ: 22/1)

نیز فرماتے ہیں: ضَعَّفَهُ الْجُمُهُورُ . ”اسے جمہور محدثین کرام نے ضعیف کہا ہے۔“ (طبقات المدلسین، ص: 52)

حافظ ابن ملقن رحمہ اللہ لکھتے ہیں: فَالْجُمُهُورُ عَلَى تَضْعِيفِهِ .

”جمہور محدثین کرام اس کو ضعیف ہی قرار دیتے ہیں۔“

(البدر المنیر فی تخریج أحادیث والآثار الواقعة فی الشرح الكبير: 567/6، 375/5، 469/1)

علامہ عینی حنفی لکھتے ہیں: ضَعَّفَهُ الْجُمُهُورُ . ”اسے جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔“ (عمدة القاري: 82/11)

② اس کا راوی عبد الرحمن بن معاویہ ابو حارث بھی جمہور محدثین کے نزدیک ”ضعیف“ ہے، جیسا کہ حافظ یثمی کہتے ہیں: وَالْأَكْثَرُ عَلَى تَضْعِيفِهِ .

”اکثر محدثین تو اسے ضعیف ہی کہتے ہیں۔“ (مجمع الزوائد: 33-32/1)

③ اس کی سند ”منقطع“ ہے، عبد الرحمن بن ہرمز کا سیدنا ابو جہیم سے سماع نہیں۔

**روایت نمبر ⑤:** سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے منسوب مرفوع روایت ہے:

«الَّتِيْمُ؛ ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلذَّرَاعَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ» .

”تیمم میں ایک ضرب (مٹی پر ہاتھ مارنا) چہرے کے لیے اور دوسری ضرب کہنیوں

تک ہاتھوں کے لیے۔“

(سنن الدارقطني: 181/1، المستدرک للحاکم: 180/1، السنن الكبرى للبيهقي: 207/1)



اس کی سند ابو زبیر کی ”تدلیس“ کی بنا پر ”ضعیف“ ہے۔

**روایت نمبر ⑥ :** سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْتَيْمُّ ضَرْبَتَانِ، ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ

لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ». ”تیمم میں دو دفعہ مٹی پر ہاتھ مارا جاتا ہے؛ ایک

دفعہ چہرے کے لیے اور دوسری دفعہ کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے۔“

(سنن الدارقطني: 180/1، المستدرک للحاکم: 179/1، المعجم الكبير للطبراني: 3678)

اس کی سند بھی سخت ”ضعیف“ ہے۔ اس کے راوی علی بن ظہیان کو اگرچہ امام حاکم رحمہ اللہ

نے ”صدوق“ کہا ہے، لیکن ان کے رد و تعاقب میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

بَلْ وَاهٍ. ”بلکہ یہ کمزور راوی ہے۔“

اس راوی کو امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے کيسُ بَشِيءٍ (بے کار) کہا ہے۔

امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے اسے ”متروک الحدیث“ قرار دیا ہے۔ (الجرح والتعديل: 191/6)

امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی اسے ”متروک الحدیث“ کہا ہے۔ (الضعفاء والمتروكون: 433)

امام ابو زرعہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَاهِي الْحَدِيثِ جَدًّا.

”اس کی بیان کردہ حدیث سخت ضعیف ہوتی ہے۔“ (الضعفاء: 429/2)

امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَالضَّعْفُ عَلَى حَدِيثِهِ بَيِّنٌ.

”اس کی بیان کردہ حدیث پر کمزوری واضح نظر آتی ہے۔“

(الكامل في ضعفاء الرجال: 189/5)

اس کے علاوہ بھی کئی محدثین کی جروح بھی اس پر موجود ہیں۔



**روایت نمبر ④ :** سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منسوب ہے کہ:

تَيَمَّمْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِضَرْبَتَيْنِ، ضَرْبَةً لِلْوَجْهِ وَالْكَفَّيْنِ، وَضَرْبَةً لِلذَّرَاعَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ.

”ہم نبی اکرم ﷺ کی ہمراہی میں دو دفعہ مٹی پر ہاتھ مار کر تہتم کیا؛ ایک دفعہ چہرے اور ہتھیلیوں کے لیے ہاتھ مارا اور دوسری دفعہ کہنیوں تک بازوؤں کے لیے۔“

(سنن الدارقطني: 689)

اس روایت کی سند بھی سخت ترین ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

① سلیمان بن ارقم راوی ”متروک“ ہے۔

حافظ سیلی (508-581ھ) فرماتے ہیں:

أَبُو مَعَاذٍ سُلَيْمَانُ بْنُ أَرْقَمٍ، وَهُوَ ضَعِيفٌ بِإِجْمَاعٍ.

”ابو معاذ سلیمان بن ارقم کے ضعیف ہونے پر محدثین کرام کا اجماع ہے۔“

(الروض الأنف: 112/7)

② امام زہری رحمہ اللہ ”مدلس“ ہیں۔

**روایت نمبر ⑤ :** سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدِهِ عَلَى الْأَرْضِ لَوَجْهِهُ ضَرْبَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ ضَرَبَ ضَرْبَةً أُخْرَى، فَمَسَحَ بِهَا عَلَى يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ.

”پھر آپ ﷺ نے مٹی پر ایک دفعہ اپنا دست مبارک چہرہ مبارک پر مسح کے لیے مارا، پھر دوسری دفعہ کہنیوں تک ہاتھوں کے مسح کے لیے مٹی پر ہاتھ مارا۔“

(التحقيق في مسائل الخلاف لابن الجوزي: 269، نصب الراية للزيلعي: 154/1)





اس روایت کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ مثنیٰ بن صباح راوی جمہور کے نزدیک ”ضعیف“ ہے۔ اس کے بارے میں حافظ یشمی لکھتے ہیں: وَهُوَ مَتْرُوكٌ عِنْدَ الْجُمْهُورِ.

”جمہور محدثین کرام کے نزدیک یہ راوی متروک ہے۔“ (مجمع الزوائد: 4/297)

نوٹ: [الْمِرْفَقَيْنِ] کے الفاظ اصلی کتاب سنن کبریٰ بیہقی سے مل ہی نہیں سکے۔

## روایت نمبر ۹:

اسلع بن شریک سے روایت ہے:

فَضَرَبَ بِكَفِّهِ الْأَرْضَ، ثُمَّ نَفَضَهُمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ، ثُمَّ أَمَرَ عَلَى لِحْيَتِهِ، ثُمَّ أَعَادَهُمَا إِلَى الْأَرْضِ، فَمَسَحَ بِهِمَا الْأَرْضَ، ثُمَّ دَلَكَ إِحْدَاهُمَا بِالْأُخْرَى، ثُمَّ مَسَحَ ذِرَاعَيْهِ ظَاهِرَهُمَا وَبَاطِنَهُمَا.

”نبی اکرم ﷺ نے اپنی ہتھیلیوں کو زمین پر مارا، ان کو جھاڑا، دونوں کو چہرہ مبارک پر پھیرا اور اپنی داڑھی مبارک پر مسح کیا۔ پھر زمین پر ہاتھوں کو مارا، ایک ہتھیلی کو دوسری ہتھیلی پر پھیرا، پھر اپنے بازوؤں کے باہر اور اندر والے حصے پر مسح فرمایا۔“

(سنن الدارقطنی: 1/179، المعجم الكبير للطبراني: 876، السنن الكبرى للبيهقي: 1/208)

یہ روایت سخت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

① اس کا راوی ربیع بن بدر جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“ ہے۔

② اس کا باپ بدر بن عمرو ”مجهول“ ہے۔

③ ربیع کے دادا عمرو بن جراد سعدی کا بھی یہی حال ہے۔

## روایت نمبر ۱۰:

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے

رسول ﷺ نے تیمم کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:



«ضَرْبَتَيْنِ؛ ضَرْبَةً لِلْوَجْهِ وَضَرْبَةً لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ».

”یتیم میں دو دفعہ مٹی پر ہاتھ مارے جائیں؛ ایک دفعہ چہرے کے لیے اور دوسری دفعہ کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے۔“

(سنن الدارقطني: 181/1، مسند البزار: 6088، المستدرک علی الصحیحین للحاکم: 179/1-180)

یہ روایت سخت ترین ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس کے راوی سلیمان بن ابوداؤد کو جمہور محدثین کرام نے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔

اس روایت کے بارے میں امام ابوزرعہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

هَذَا حَدِيثٌ بَاطِلٌ، وَسَلِيمَانُ ضَعِيفُ الْحَدِيثِ.

”یہ جھوٹی حدیث ہے اور اس کا راوی سلیمان ضعیف ہے۔“

(علل الحديث لابن أبي حاتم: 54/1، ح: 137)

علامہ مغطائی کہتے ہیں:

وَضَعَّفَهُ أَبُو حَاتِمٍ. ”اسے ابوالحسن مقرئ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے اور امام

ابوحاتم رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔“ (شرح ابن ماجہ: 691/2)

**روایت نمبر ⑪:** سیدنا ابوامامہ باہلی رحمہ اللہ سے منسوب ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الَّتِي تَمُّ ضَرْبَةُ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةُ لِلْكَفَّيْنِ».

”یتیم میں مٹی پر ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری ہتھیلیوں کے لیے ہے۔“

(المعجم الكبير للطبراني: 245/8، ح: 7959)

یہ بے اصل اور باطل روایت ہے۔ اس کا راوی جعفر بن زبیر شامی دنیا کا جھوٹا ترین،

”متروک الحدیث“ اور ”ساقط الحدیث“ راوی ہے۔



**روایت نمبر ۱۲ :** سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: «فِي التَّيَمُّ ضَرْبَتَيْنِ؛ ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ».

”تیمم میں دو ضربیں ہیں؛ ایک چہرے پر مسح کے لیے اور دوسری کہنیوں تک ہاتھوں

کے مسح کے لیے۔“ (الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدي : 442/2، مسند البزار : 240،

المحلی لابن حزم : 152/2)

اس کی سند بھی ”ضعیف“ ہے۔ اس کا راوی حریش بن خزیمہ جمہور محدثین کے نزدیک

غیر ثقہ اور غیر معتبر ہے۔ اس کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ”فی نظر“ فرمایا ہے۔

(التاریخ الكبير : 114/3، نصب الراية للزيلعي : 151/1)

امام ابو زرہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : وَاهِي الْحَدِيثِ .

”اس کی حدیث کمزور ہے۔“ (میزان الاعتدال للذهبي : 476/1)

امام ابو حاتم رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : حَدِيثٌ مُنْكَرٌ، وَالْحَرِيشُ شَيْخٌ

لَا يُحْتَجُّ بِحَدِيثِهِ . ”یہ منکر حدیث ہے اور حریش ایسا راوی ہے جس کی بیان

کردہ حدیث کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔“ (العلل لابن أبي حاتم : 54/1)

امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : وَلَا أَعْرِفُ لَهُ كَثِيرَ حَدِيثٍ، فَأَعْتَبَرُ

حَدِيثَهُ، فَأَعْرِفُ ضَعْفَهُ مِنْ صِدْقِهِ . ”میں اس کی زیادہ حدیثیں نہیں جانتا

کہ اس کی حدیث کو جانچ کر توثیق یا تضعیف کا فیصلہ کر سکوں۔“ (الکامل : 442/2)

امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : يُعْتَبَرُ بِهِ . ”اس کی حدیث کو

صرف متابعات اور شواہد میں لیا جائے گا۔“ (سؤالات البرقاني : 111)

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی اسے ”ضعیف“ کہا ہے۔ (المحلی : 152/2)



حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے کمزور قرار دیا ہے۔ (الکاشف: 1/155)

علامہ ابن ملقن رحمہ اللہ کہتے ہیں: وَهُوَ ضَعِيفٌ، لَا يُحْتَجُّ.

”یہ ضعیف راوی ہے، اس کی بیان کردہ حدیث دلیل نہیں بن سکتی۔“ (البدرد المنیر: 2/12)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ”ضعیف“ راوی ہے۔ (تقریب التہذیب: 1187)

حافظ بوسیری لکھتے ہیں: حَرِيشُ بْنُ خَرِيتٍ مُتَّفَقٌ عَلَى ضَعْفِهِ.

”حریش بن خریث کے ضعیف ہونے پر (اکثر) محدثین کرام کا اتفاق ہے۔“

(مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه: 1/153)

یوں یہ روایت بھی ”ضعیف“ اور ”منکر“ ہے۔

## الحاصل:

نبی اکرم ﷺ سے تیمم کا جو طریقہ ثابت ہے، وہ اس طرح ہے

کہ مٹی پر دونوں ہاتھوں کو ایک ہی دفعہ مارا جائے، پھر ان میں پھونکنے کے بعد ان کو اپنے چہرے پر مسح کیا جائے، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی بیرونی جانب مسح کیا جائے۔

جو لوگ تقلید کے نتیجے میں اس نبوی طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اپناتے ہیں، ان کے پاس اس بارے میں کوئی صحیح دلیل موجود نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کل کائنات کا حال آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

مقلدین کی پیش کردہ روایات کے تجزیے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دو بار مٹی پر ہاتھ مارنا قطعاً ثابت نہیں۔ اس طریقے کو کسی بھی طرح سنتِ نبوی قرار دینا جائز نہیں۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سنتِ رسول کا اتباع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!





## تقلید کی شرعی حیثیت ②

ابو عبد اللہ صارم

تقلید ناسدید جہالت و ضلالت کا دوسرا نام ہے۔ علمائے اسلام اس کی مذمت کرتے رہے ہیں۔ اس کے سبب انسان عقل و شعور سے دشمنی کرنے لگتا ہے، دماغی و عملی پستی کا شکار ہو جاتا ہے اور علم دین سے محرومی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنی آنکھوں پر تقلید کی پٹی باندھ لیتا ہے، تو اسے قرآن و حدیث کی صورت میں ہدایت ربانی کے روشن نشان نظر نہیں آتے۔ اس کی فطرت اس قدر مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ وحی الہی اور تعلیمات نبویہ کا تارک بن جاتا ہے۔ تقلید کی وجہ سے انسان حلت و حرمت کے آسمانی فیصلے نظر انداز کر کے نفسانی خواہشات کے پیچھے لگ جاتا ہے اور وحی کے مقابلے میں انسانی آرا کو دین بنا لیتا ہے۔

شیخ الاسلام ثانی، عالم ربانی، علامہ ابن القیمؒ (691-751ھ) تقلید کے نقصانات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَالْمُصَنِّفُونَ فِي السُّنَّةِ جَمَعُوا بَيْنَ فَسَادِ التَّقْلِيدِ وَإِبْطَالِهِ وَبَيَانِ زَلَّةِ الْعَالِمِ، لِيُبَيِّنُوا بِذَلِكَ فَسَادَ التَّقْلِيدِ، وَأَنَّ الْعَالِمَ قَدْ يَزِلُّ وَلَا بُدَّ؛ إِذْ لَيْسَ بِمَعْصُومٍ، فَلَا يَجُوزُ قَبُولُ كُلِّ مَا يَقُولُهُ، وَيَنْزِلُ قَوْلُهُ مَنْزِلَةَ قَوْلِ الْمَعْصُومِ؛ فَهَذَا الَّذِي ذَمَّهُ كُلُّ عَالِمٍ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ، وَحَرَمُوهُ، وَذَمُّوا أَهْلَهُ، وَهُوَ أَصْلُ بَلَاءِ الْمُقَلِّدِينَ وَفِتْنَتِهِمْ، فَإِنَّهُمْ يُقَلِّدُونَ الْعَالِمَ فِيمَا زَلَّ فِيهِ وَفِيمَا لَمْ يَزَلْ فِيهِ، وَلَيْسَ لَهُمْ تَمْيِيزُ بَيْنَ ذَلِكَ، فَيَأْخُذُونَ الدِّينَ بِالْخَطِإِ وَلَا بُدَّ، فَيَحِلُّونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَيَحْرِمُونَ مَا أَحَلَّ اللَّهُ، وَيُشَرِّعُونَ مَا لَمْ يُشَرِّعْ، وَلَا بُدَّ لَهُمْ مِنْ

ذَلِكَ، إِذْ كَانَتْ الْعِصْمَةُ مُنْتَفِيَةً عَمَّنْ قَلَدُوهُ، وَالْخَطَأُ وَقَعَ مِنْهُ وَلَا بُدَّ.

”محدثین کرام نے تقلید کا رد کرنے کے لیے اس کی خرابیاں بیان کر کے اس کا ابطال بھی کیا ہے اور ایک عالم سے غلطی ہونے کا امکان بھی ذکر کیا ہے۔ ایک عالم سے یقینی طور پر غلطی ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ معصوم نہیں۔ اس کے ہر قول کو اپنانا اور اس کی بات کو پیغمبر ﷺ کی بات کا درجہ دینا جائز نہیں۔ روئے زمین پر موجود ہر عالم نے اس رَوش کا رد کرتے ہوئے اسے حرام قرار دیا اور ایسا کرنے والوں کی مذمت کی۔ یہی رَوش مقلدین کا اصل مسئلہ اور ان کی بنیادی مصیبت ہے۔ وہ ہر غلط اور صحیح بات میں کسی معین عالم کی تقلید کرتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز بھی نہیں کر پاتے۔ وہ یقینی طور پر غلطی پر مبنی دین کی پیروی کرتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام اور حرام کردہ چیزوں کو حلال کر لیتے ہیں۔ وہ یقیناً ایسی شریعت پر عمل پیرا ہوتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ نہیں ہوتی، کیونکہ جس کی وہ تقلید کر رہے ہوتے ہیں، وہ معصوم تو ہوتا نہیں اور اس کے غلطی کا صدور بھی یقینی ہوتا ہے۔“ (إعلام الموقعین عن رب العالمین: 173/2)

### تقلید اور قرآن کریم:

تقلید وہ مذموم بدعت ہے، جو انسان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا نافرمان بنا دیتی ہے۔ تقلید کی مذمت میں یہ فرمان باری تعالیٰ بھی ملاحظہ فرمائیں:

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (التوبة: 33)

”انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا لیا تھا۔“

مشہور تابعی، سعید بن فیروز، ابو بشری، طائی رحمہ اللہ (م: 83ھ) اس آیت کریمہ کی تفسیر

کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أَمَّا إِنَّهُمْ لَوِ أَمَرُوهُمْ أَنْ يَعْبُدُوهُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مَا أَطَاعُوهُمْ، وَلَكِنَّهُمْ أَمَرُوهُمْ فَجَعَلُوا حَلَالَ اللَّهِ حَرَامَةً وَحَرَامَهُ حَلَالَةً، فَأَطَاعُوهُمْ، فَكَانَتْ تِلْكَ الرُّبُوبِيَّةَ .

”یہ بات یقینی ہے کہ اگر ان کے علما ان کو غیر اللہ کی عبادت کا حکم دیتے، تو وہ ان کی بات نہ مانتے، لیکن ان کے حکم پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کاموں کو حلال اور حلال کردہ کاموں کو حرام قرار دے کر ان کی اطاعت کی۔ یہ ان کو رب بنانے کے مترادف تھا۔“  
(جامع بیان العلم وفضله لابن عبد البر: 1863، الإحكام في أصول الأحكام لابن حزم: 189/6، وفي نسخة: 883، وسنده حسن)

امام اندلس، حافظ ابن عبد البرؒ (368-463ھ) اس آیت کریمہ سے تقلید کی مذمت ثابت کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

بَابُ فَسَادِ التَّقْلِيدِ وَنَقْيِهِ، وَالْفَرْقِ بَيْنَ التَّقْلِيدِ وَالِاتِّبَاعِ، قَدْ ذَمَّ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى التَّقْلِيدَ فِي غَيْرِ مَوْضِعٍ مِّنْ كِتَابِهِ، فَقَالَ: ﴿اتَّخِذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (التوبة: 33)۔

”تقلید کی خرابی، اس کے بطلان اور تقلید و اتباع میں فرق کا بیان۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر تقلید کی مذمت فرمائی ہے، چنانچہ فرمانِ گرامی ہے: ﴿اتَّخِذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (التوبة: 9 : 33) انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے احبار و رہبان کو رب بنا لیا تھا۔“

(جامع بیان العلم وفضله: 975/2)

اسی سلسلے میں علامہ ابن حزم اندلسیؒ (384-456ھ) فرماتے ہیں:

فَلَمَّا كَانَ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ أَحْبَارُهُمْ وَرُهْبَانُهُمْ وَيُحِلُّونَ مَا أَحَلُّوا، كَانَتْ هَذِهِ رُبُوبِيَّةً صَحِيحَةً وَعِبَادَةً صَحِيحَةً قَدْ دَانُوا بِهَا، وَسَمَّى اللَّهُ تَعَالَى هَذَا الْعَمَلَ اتِّخَاذَ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ وَعِبَادَةً، وَهَذَا هُوَ الشِّرْكَ بِلَا خِلَافٍ .

”جب یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کی حرام کردہ چیزوں کو حرام اور حلال کردہ چیزوں کو حلال تسلیم کر لیا، تو اس طرح واقعی ان کو اپنا رب اور معبود بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو رب بنانے اور عبادت کرنے کا نام دیا۔ یہ عمل بالاتفاق شرک ہے۔“

(الفصل في الملل والأهواء والنحل: 124/3-125)

علامہ، احمد بن عبد الرحیم، المعروف بہ شاہ ولی اللہ دہلوی (1114-1176ھ) لکھتے ہیں:

وَمِنْهَا أَنَّهُمْ كَانُوا يَتَّخِذُونَ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ تَعَالَى، بِمَعْنَى أَنَّهُمْ كَانُوا يَعْتَقِدُونَ أَنَّ مَا أَحَلَّهُ هَؤُلَاءِ حَلَالٌ لَا بَأْسَ بِهِ فِي نَفْسِ الْأَمْرِ، وَأَنَّ مَا حَرَّمَهُ هَؤُلَاءِ حَرَامٌ يُؤَاخَذُونَ بِهِ فِي نَفْسِ الْأَمْرِ .

”یہود و نصاریٰ کی ایک روش یہ تھی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے احبار و رہبان کو رب بنا لیا تھا۔ اس طرح کہ جس چیز کو یہ لوگ حلال قرار دیتے تھے، یہود و نصاریٰ اسے واقعی حلال سمجھ لیتے تھے اور اس کے استعمال میں کوئی جھجک نہیں کرتے تھے اور جسے یہ لوگ حرام قرار دیتے تھے، اس کو یہود و نصاریٰ واقعی حرام سمجھ لیتے تھے اور اس کے استعمال کو

قابل مواخذہ جرم سمجھ لیتے تھے۔“ (حجۃ اللہ البالغۃ: 1/121، بتحقیق السید السابق)

علامہ، محمد صدیق حسن خان، قنوجی ٹٹلہ (1248-1307ھ) لکھتے ہیں:

وَفِي هَذِهِ الْآيَةِ مَا يَزْجُرُ مَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ، وَهُوَ شَهِيدٌ،



عَنِ التَّقْلِيدِ فِي دِينِ اللَّهِ، وَتَأْثِيرِ مَا يَقُولُهُ الْأَسْلَافُ عَلَى مَا فِي الْكِتَابِ الْعَزِيزِ وَالسُّنَّةِ الْمُطَهَّرَةِ، فَإِنَّ طَاعَةَ الْمُتَمَذِّهِبِ لِمَنْ يَقْتَدِي بِقَوْلِهِ وَيَسْتَنْ بِسُنَّتِهِ، مِنْ عُلَمَاءِ هَذِهِ الْأُمَّةِ، مَعَ مُخَالَفَتِهِ لِمَا جَاءَتْ بِهِ النُّصُوصُ، وَقَامَتْ بِهِ حِجْبُ اللَّهِ وَبَرَاهِينُهُ، وَنَطَقَتْ بِهِ كُتُبُهُ وَأَنْبِيَآؤُهُ، هُوَ كَاتِّخَاذِ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى لِلْأَخْبَارِ وَالرُّهْبَانِ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ، لِلْقَطْعِ بِأَنَّهُمْ لَمْ يَعْبُدُوهُمْ، بَلْ أَطَاعُوهُمْ وَحَرَّمُوا مَا حَرَّمُوا وَحَلَّلُوا مَا حَلَّلُوا، وَهَذَا هُوَ صَنِيعُ الْمُقَلِّدِينَ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ، وَهُوَ أَشْبَهُ بِهِ مِنْ شَبِّهِ الْبَيْضَةِ بِالْبَيْضَةِ، وَالتَّمْرَةِ بِالتَّمْرَةِ، وَالْمَاءِ بِالْمَاءِ.

”یہ آیت کریمہ قلبِ سلیم کے حامل، غور و فکر کرنے والے لوگوں کو اللہ کے دین میں کسی کی تقلید کرنے اور سلف کے کتاب و سنت کے خلاف اقوال کو اپنانے سے روکتی ہے۔ مقلدین کا نصوصِ شرعیہ کی مخالفت کرتے ہوئے کسی اہل علم امتی کی بات ماننا اور اس کے طریقے پر چلنا بالکل ایسے ہی ہے، جیسے یہود و نصاریٰ نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے احبار و رہبان کو رب بنا لیا تھا۔ اگرچہ حقیقت میں انہوں نے ان کی عبادت نہیں کی تھی، لیکن حلت و حرمت میں ان کی اطاعت کی تھی۔ اس امت کے مقلدین کا یہی حال ہے۔ وہ اس سلسلے میں یہود و نصاریٰ سے اتنی مشابہت رکھتے ہیں کہ انڈہ انڈے کے ساتھ، کھجور کھجور کے ساتھ اور پانی پانی کے ساتھ اتنی مشابہت نہیں رکھتا۔“ (فتح البیان فی مقاصد القرآن: 5/286)

یہ اس آیت کریمہ کی اتفاقی تفسیر ہے۔ اس آیت کریمہ سے ایک مقلد کے حالات و کوائف معلوم ہوتے ہیں کہ وہ کس طرح آنکھیں بند کر کے نفس کے پیچھے لگتا ہے اور قرآن و سنت کو نظر انداز کرتا ہے، حلال و حرام کے خود ساختہ اصول اپناتا ہے، سلف صالحین کی



مخالفت میں قرآن و حدیث کی من پسند تاویلات پر اُتر آتا ہے اور پہلوں کی طرح بزرگوں اور اماموں کی بات کو دین کا درجہ دیتا ہے۔

اس حوالے سے ایک اور فرمانِ باری تعالیٰ ملاحظہ فرمائیں :

﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾\*

”اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں، جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی، تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے زیادہ لوگ فاسق ہیں۔“

اس کی تفسیر میں امام اہل سنت، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (701-774ھ) فرماتے ہیں :

وَقَوْلُهُ : ﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾، نَهَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَنْ يَتَشَبَّهُوا بِالَّذِينَ حَمَلُوا الْكِتَابَ قَبْلَهُمْ مِنَ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى، لَمَّا تَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ بَدَّلُوا كِتَابَ اللَّهِ الَّذِي بَأْيَدِهِمْ، وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا، وَبَنَدُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ، وَأَقْبَلُوا عَلَى الْآرَاءِ الْمُخْتَلِفَةِ وَالْأَقْوَالِ الْمُؤْتَفِكَةِ، وَقَلَّدُوا الرِّجَالَ فِي دِينِ اللَّهِ، وَاتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ، فَعِنْدَ ذَلِكَ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ، فَلَا يَقْبَلُونَ مَوْعِظَةً، وَلَا تَلِينُ قُلُوبُهُمْ بِوَعْدٍ وَلَا وَعِيدٍ .

”اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں مومنوں کو پہلے گزرے ہوئے اہل کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ کی مشابہت سے منع فرمایا ہے۔ جب ان اہل کتاب پر لمبی مدت گزر گئی، تو انہوں نے اپنے پاس موجود اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بدل ڈالا، اسے تھوڑی قیمت میں بیچا، اسے پس پشت ڈال دیا، اختلافی آراء اور الٹ پلٹ اقوال کی طرف توجہ کی، اللہ کے دین کے سلسلے میں



لوگوں کی تقلید کی اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے احبار و رہبان کو رب بنا لیا۔ اس وقت ان کے دل سخت ہو گئے۔ نہ وہ نصیحت قبول کرتے تھے، نہ وعد و وعید سے ان کے دل نرم ہوتے تھے۔“

(تفسیر ابن کثیر: 20/8، بتحقیق الدكتور سلامة)

اس سے معلوم ہوا کہ تقلید اور اتباع دو متضاد چیزوں کا نام ہے۔ قرآن و سنت میں اتباع کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ اتباع کرنے والا تقلید نہیں کر سکتا اور تقلید کرنے والا قرآن و سنت کا اتباع نہیں کر سکتا۔ اس بات کو ہم درج ذیل مثالوں سے بھی ثابت کرتے ہیں:

### مثال نمبر ①: قرعہ اندازی اور تقلید!

قرعہ اندازی کی مشروعیت و جواز پر قرآن و حدیث کے دلائل موجود ہیں۔ اہل سنت کے ائمہ بھی اس کی مشروعیت کے قائل ہیں، لیکن دیگر بہت سے مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی فقہ حنفی قرآن و حدیث اور ائمہ اسلام کی مخالفت کرتی ہے۔ حنفی مقلدین قرآن و سنت اور ائمہ اسلام کے خلاف اپنی فقہ کو ماننے پر مجبور ہیں اور اپنے احبار و رہبان کی تقلید کرتے ہوئے اس بارے میں مروی صحیح و صریح احادیث کو بغیر دلیل کے منسوخ کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ آئیے فہم سلف کی روشنی میں قرعہ اندازی کے ثبوت پر دلائل ملاحظہ فرمائیں:

### دلیل نمبر ①: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ﴾ (آل عمران 3: 44)

”(اے نبی!) آپ ان کے پاس نہیں تھے، جب وہ (قرعہ اندازی کے لیے) اپنی قلمیں ڈال رہے تھے کہ سیدہ مریم (علیہا السلام) کی کفالت کون کرے گا اور آپ اس وقت بھی ان کے پاس نہیں تھے، جب وہ باہم تکرار کر رہے تھے۔“

یعنی سیدہ مریم علیہا السلام کی کفالت کے حوالے سے قرعہ ڈالا گیا اور وہ سیدنا زکریا علیہ السلام کے نام نکلا تھا۔ یوں قرعہ اندازی کی بنا پر وہ سیدہ مریم علیہا السلام کے کفیل و نگہبان بنے تھے۔

**دلیل نمبر ② :** سیدنا یونس علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ \* إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلِّ الْمَشْحُونِ \*

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ \*﴾ (الصافات 37 : 139-141)

”بلاشبہ یونس (علیہ السلام) پیغمبروں میں سے تھے۔ (اس وقت کو یاد کرو) جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگے۔ انہوں نے قرعہ اندازی کی تو قرعہ انہی کے نام پر نکلا۔“  
مفسر قرآن، قتادہ بن دعامہ تابعی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

قَارَعَ نَبِيُّ اللَّهِ يُونُسُ عَلَيْهِ السَّلَامُ، فَقُرِعَ، قَالَ: احْتَبَسَتِ السَّفِينَةُ، فَعَلِمَ الْقَوْمُ، إِنَّمَا احْتَبَسَتْ مِنْ حَدَثٍ أَحْدَثَهُ بَعْضُهُمْ، فَتَسَاهَمُوا، فَقُرِعَ يُونُسُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَرَمَى بِنَفْسِهِ.

”اللہ کے نبی سیدنا یونس علیہ السلام نے قرعہ اندازی میں حصہ لیا تو قرعہ انہی کے نام نکلا۔ جب کشتی بھنور میں پھنس رہی تھی تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ کسی سوار کے عمل کی بنا پر ہے، جب انہوں نے قرعہ ڈالا تو یونس علیہ السلام کے نام قرعہ نکلا۔ انہوں نے خود سمندر میں چھلانگ لگا دی۔“  
(السنن الکبریٰ للبیہقی: 287/10، وسندہ صحیح)

**دلیل نمبر ③ :** سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ رَجُلًا أَعْتَقَ سِتَّةَ مَمْلُوكِينَ لَهُ عِنْدَ مَوْتِهِ، لَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ غَيْرَهُمْ، فَدَعَا بِهِمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَجَزَّاهُمْ أَثَلَاثًا، ثُمَّ أَقْرَعَ

بَيْنَهُمْ، فَأَعْتَقَ اثْنَيْنِ، وَأَرَقَّ أَرْبَعَةً، وَقَالَ لَهُ قَوْلًا شَدِيدًا.

”ایک شخص نے موت کے وقت اپنے چھ غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اس کے پاس ان غلاموں کے علاوہ کوئی مال بھی نہیں تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے غلاموں کو بلا کر تین ٹولیوں میں تقسیم کر دیا اور ان کے درمیان قرعہ ڈالا۔ (جس ٹولی کے نام قرعہ نکلا، ان) دو کو رہا کر دیا اور باقی چار کو غلامی میں برقرار رکھا۔ ان کے مالک کے بارے میں بھی سخت بات فرمائی۔“

(صحیح مسلم: 1668)

حافظ، ابو عبد اللہ، محمد بن احمد بن عثمان، ذہبی رحمہ اللہ (643-748ھ) فرماتے ہیں:

وَهُوَ نَصٌّ فِي شَرْعِيَّةِ الْقُرْعَةِ فِي مِثْلِ هَذَا، وَاللَّهُ أَعْلَمُ.

”یہ حدیث قرعہ کے مشروع ہونے پر واضح دلیل ہے۔“ (سیر أعلام النبلاء: 332/18)

امام، ابو عیسیٰ، محمد بن عیسیٰ، ترمذی رحمہ اللہ (209-279ھ) فرماتے ہیں:

وَالْعَمَلُ عَلَى هَذَا عِنْدَ بَعْضِ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَغَيْرِهِمْ، وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ، وَالشَّافِعِيِّ، وَأَحْمَدَ، وَإِسْحَاقَ، يَرَوْنَ اسْتِعْمَالَ الْقُرْعَةِ فِي هَذَا وَفِي غَيْرِهِ، وَأَمَّا بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَهْلِ الْكُوفَةِ، وَغَيْرِهِمْ، فَلَمْ يَرَوْا الْقُرْعَةَ.

”نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام اور دیگر اہل علم میں سے بعض کا اسی حدیث پر عمل ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ یہ سب اہل علم اس جیسے مواقع پر قرعہ اندازی کو جائز سمجھتے تھے۔ البتہ اہل کوفہ وغیرہ میں سے بعض اہل علم قرعہ کو جائز نہیں سمجھتے۔“ (سنن الترمذی، تحت الحديث: 1364)

بویطی کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی رحمہ اللہ سے سنا، وہ بیان فرما رہے تھے:

نَظَرْتُ الْمَرِيسِيَّ فِي الْقُرْعَةِ، فَذَكَرْتُ لَهُ حَدِيثَ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْقُرْعَةِ، فَقَالَ: يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ! هَذَا قِمَارٌ، فَاتَيْتُ أَبَا الْبُخْتَرِيِّ، فَقُلْتُ لَهُ: سَمِعْتُ الْمَرِيسِيَّ يَقُولُ: الْقُرْعَةُ قِمَارٌ، قَالَ: يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ! شَاهِدْ آخَرَ وَاقْتُلْهُ.

”میں نے (بشر) مرہسی سے قرعہ اندازی پر مناظرہ کیا۔ میں نے سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی قرعہ کے بارے میں وہ حدیث ذکر کی جو وہ نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں۔ مرہسی کہنے لگا: ابو عبد اللہ! قرعہ اندازی تو جوا ہے۔ میں ابو بختری کے پاس گیا اور ان سے کہا: میں نے مرہسی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ قرعہ اندازی جوا ہے۔ وہ کہنے لگے: ایک اور شخص کو گواہ بنا کر اسے قتل کر دو۔“

(تاریخ بغداد للخطیب: 60/7، تاریخ دمشق لابن عساکر: 380/51، وسندہ صحیح)

### دلیل نمبر ④: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ سَفَرًا أَقْرَعَ بَيْنَ أَزْوَاجِهِ، فَأَيُّهُنَّ خَرَجَ سَهْمُهَا خَرَجَ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهُ، قَالَتْ عَائِشَةُ: فَأَقْرَعَ بَيْنَنَا فِي غَزْوَةِ غَزَاهَا، فَخَرَجَ فِيهَا سَهْمِي، فَخَرَجْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

”رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواجِ مطہرات کے درمیان قرعہ اندازی کرتے۔ جس کے نام قرعہ نکلتا، اسے اپنے ساتھ سفر میں لے جاتے۔ ایک غزوے میں (جانے کے لیے) آپ ﷺ نے قرعہ اندازی فرمائی تو میرے نام قرعہ نکلا۔ میں آپ ﷺ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئی۔“ (صحیح البخاری: 4141، صحیح مسلم: 2770)



**دلیل نمبر ⑤ :** سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں :

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ سَفَرًا أَقْرَعَ بَيْنَ نِسَائِهِ، فَأَصَابَ عَائِشَةَ الْفُرْعَةَ فِي غَزْوَةِ بَنِي الْمُصْطَلِقِ .

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر میں نکلنے کا ارادہ کرتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی فرماتے۔ غزوہ بنو مصطلق میں (جانے کے لیے) قرعہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے نام نکلا۔“  
(مسند البزار: 8011، وسندہ حسن)

حافظ سیوطی نے اس حدیث کی سند کو ”حسن“ کہا ہے۔ (الدراۃ المنثور: 75/5)

**دلیل نمبر ⑥ :** سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي النِّدَاءِ وَالصَّفِّ الْأَوَّلِ، ثُمَّ لَمْ يَجِدُوا إِلَّا أَنَّهُمْ يَسْتَهْمُوا عَلَيْهِ لَاسْتَهْمُوا، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِي التَّهْجِيرِ لَاسْتَبَقُوا إِلَيْهِ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِي الْعَتَمَةِ وَالصُّبْحِ لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبَوًّا» .

”لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان اور صفِ اول میں کتنا اجر ہے، تو انہیں (سبقت لے جانے کے لیے) اگر قرعہ اندازی بھی کرنا پڑے تو وہ کر لیں۔ اگر وہ جان لیں کہ تکبیر تحریمہ میں کتنا اجر ہے، تو وہ ضرور اس کی طرف جلدی کریں اور اگر انہیں عشاء اور صبح کی نماز کے اجر و ثواب کا علم ہو جائے، تو گھٹنوں کے بل بھی آنا پڑے تو آئیں۔“

(صحیح البخاری: 2689، صحیح مسلم: 437)

**دلیل نمبر ⑦ :** خارجہ بن زید انصاری تابعی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے :

إِنَّ أُمَّ الْعَلَاءِ - امْرَأَةً مِنْ نِسَائِهِمْ - قَدْ بَايَعَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ، أَخْبَرْتُهُ أَنَّ عَثْمَانَ بْنَ مَطْعُونٍ طَارَ لَهُ سَهْمُهُ فِي السُّكْنَى، حِينَ أَقْرَعَتِ النَّاصِرُ سُكْنَى الْمُهَاجِرِينَ، قَالَتْ أُمُّ الْعَلَاءِ : فَسَكَنَ عِنْدَنَا عَثْمَانُ بْنُ مَطْعُونٍ .

”سیدہ ام علاء انصاریہ رضی اللہ عنہا، جنہیں رسول اللہ ﷺ کے

دستِ مبارک پر بیعت کا شرف حاصل تھا، نے انہیں بتایا کہ جب انصار صحابہ کرام نے مہاجرین صحابہ کرام کی رہائش کے سلسلے میں قرعہ اندازی کی، تو سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے نام کا قرعہ نکلا۔ وہ ہمارے ہاں رہائش پذیر ہوئے۔“ (صحیح البخاری: 2687)

**دلیل نمبر ⑧ :** سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے :

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلَى قَوْمِ الْيَمِينِ، فَأَسْرَعُوا، فَأَمَرَ أَنْ يُسْهِمَ بَيْنَهُمْ فِي الْيَمِينِ، أَيُّهُمْ يَخْلِفُ .

”نبی اکرم ﷺ نے ایک قوم پر قسم کی پیش کش کی، تو وہ قسم اٹھانے میں ایک دوسرے سے سبقت کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے ان کے درمیان قرعہ اندازی کا حکم فرمایا کہ کون قسم اٹھائے گا؟“

(صحیح البخاری: 2674)

**دلیل نمبر ⑨ :** سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے ارشاد فرمایا :

«مَثَلُ الْقَائِمِ عَلَى حُدُودِ اللَّهِ وَالْوَاقِعِ فِيهَا، كَمَثَلِ

قَوْمٍ اسْتَهْمُوا عَلَى سَفِينَةٍ، فَأَصَابَ بَعْضُهُمْ أَعْلَاهَا وَبَعْضُهُمْ أَسْفَلَهَا، فَكَانَ الَّذِينَ فِي أَسْفَلِهَا إِذَا اسْتَقَوْا مِنَ الْمَاءِ، مَرُّوا عَلَى مَنْ فَوْقَهُمْ، فَقَالُوا: لَوْ أَنَّا خَرَقْنَا فِي نَصِيبِنَا خَرْقًا وَلَمْ نُؤْذِ مَنْ فَوْقَنَا، فَإِنْ يَتْرَكُوهُمْ وَمَا أَرَادُوا، هَلَكُوا جَمِيعًا، وَإِنْ أَخَذُوا عَلَى أَيْدِيهِمْ نَجَوْا، وَنَجَوْا جَمِيعًا» .





”حدود اللہ کی پابندی کرنے والے اور ان کی پامالی کرنے والوں کی باہمی مثال ان لوگوں کی طرح ہے، جنہوں نے ایک کشتی میں قرعہ اندازی کی۔ ان میں سے بعض کو اوپر والا حصہ ملا اور بعض کو نیچے والا۔ نیچے والوں کو جب پانی کی طلب ہوتی تو ان کو اوپر والوں کے پاس جانا پڑتا۔ انہوں نے کہا: اگر ہم اپنے ہی حصے میں سوراخ کر لیں اور اوپر والوں کو تنگ نہ کریں تو کیا ہی اچھا ہو۔ اگر اوپر والے نیچے والوں کو ان کے ارادے پر چھوڑ دیں تو سب ہلاک ہو جائیں گے، لیکن اگر وہ ان کا ہاتھ پکڑ لیں تو وہ خود بھی بچ جائیں گے اور باقی سب لوگ بھی۔“

(صحیح البخاری: 2493)

ان تمام قرآنی اور حدیثی دلائل اور اقوالِ ائمہ مسلمین کے باوجود امام ابو حنیفہ قرعہ اندازی کی شرعی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے لیے تو ہم یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ شاید ان کے پاس یہ دلائل شرعیہ نہ پہنچے ہوں، لیکن احناف مقلدین کا قرآن و سنت کے ان دلائل کو جان لینے کے بعد کوئی عذر مقبول نہیں ہوگا۔ ان کو چاہیے کہ قرآن و سنت کو اپنی فقہ کی بھینٹ چڑھانے کی بجائے اسے قبول کریں۔

## قرعہ اندازی کی منسوحیت کا دعویٰ!

بعض احناف قرعہ کو منسوخ قرار دینے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں، جیسا کہ:

علامہ، ابو جعفر، احمد بن محمد بن سلامہ، طحاوی حنفی (321-238ھ) لکھتے ہیں:

حَدِيثُ عِمْرَانَ مَنسُوخٌ، لِأَنَّ الْقُرْعَةَ كَانَتْ فِي بَدْءِ الْإِسْلَامِ.

”سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث منسوخ ہے، کیونکہ قرعہ آغاز اسلام میں مشروع تھا۔“

(شرح معانی الآثار: 381/4)

صاحب ہدایہ، علی بن ابوبکر، مرغینانی، حنفی (530-593ھ) لکھتے ہیں:

وَحَدِيثُ الْقُرْعَةِ كَانَ فِي ابْتِدَاءِ الْإِسْلَامِ، ثُمَّ نُسِخَ.



”قرعہ کے بارے میں حدیث آغازِ اسلام کی ہے، اس کے بعد یہ منسوخ ہو گیا تھا۔“

(الہدایۃ شرح فی البدایۃ: 225/3)

طاہوی حنفی اور صاحبِ ہدایہ کا دعویٰ منسوخیت انتہائی تعجب خیز ہے۔ یہ صرف اور صرف تقلیدِ جامد کا کرشمہ ہے۔ جب بہت سے محکم دلائل کا جواب نہ بن پڑا تو بغیر کسی دلیل کے محض اپنے مذہب کے دفاع میں ان کے نسخ کا دعویٰ کر دیا گیا۔ کیا کسی شرعی حکم کو منسوخ کہنے کے لیے ایسے نسخ حکم کا ہونا ضروری نہیں، جو پایہ صحت کو پہنچنے کے ساتھ ساتھ اپنے مفہوم میں صریح بھی ہو؟ وہ نسخ کہاں ہے؟ اہل علم نے اس کا روائی کا سختی سے رد کیا ہے، جیسا کہ:

علامہ علی بن احمد، ابن حزم رحمہ اللہ (384-456ھ) اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَقَدْ كَذَبُوا، مَا نُسَخَ ذَلِكَ قَطُّ.

”ان لوگوں نے جھوٹ بولا ہے۔ قرعہ کبھی بھی منسوخ نہیں ہوا۔“

(المحلی بالآثار: 345/9، الرقم: 1767)

اب قارئین کرام خود فیصلہ فرمائیں کہ انہوں نے قرآن و سنت کے صحیح و صریح دلائل پر عمل کرنا ہے یا فقہ حنفی کے بے دلیل فتوے پر؟

## مثال نمبر ②: کنوارے زانی کی حد!

غیر شادی شدہ زانی کی شرعی حد یہ ہے کہ اسے سو کوڑے لگائے جائیں اور ایک سال کے لیے جلاوطن کیا جائے۔ جلاوطنی کنوارے زانی کی شرعی سزا کا جزو لاینفک ہے۔ صحیح احادیث اور ائمہ مسلمین کا اجماع اس پر دلیل ہے۔ اس کے برعکس حنفی مقلدین کہتے ہیں کہ ایک سال کی جلاوطنی حکم شرعی نہیں۔ جلاوطنی کریں یا نہ کریں، کچھ فرق نہیں پڑتا۔

قارئین کرام پہلے اہل حق کے دلائل ملاحظہ فرمائیں:



**دلیل نمبر ① :** کنوارے زانی کے لیے سو کوڑوں کے ساتھ

ساتھ جلاوطنی کے شرعی حد ہونے پر امت مسلمہ کا اجماع و اتفاق ہے۔ سوائے خفی مقلدین کے کوئی اس کا مخالف نہیں۔ شارح بخاری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

وَنَقَلَ مُحَمَّدُ بْنُ نَصْرِ فِي كِتَابِ «الْإِجْمَاعِ» الْإِتِّفَاقَ عَلَى نَفْيِ الزَّانِي إِلَّا عَنِ الْكُوفِيِّينَ .  
”امام محمد بن نصر نے کتاب الاجماع میں زانی کو جلاوطن

کرنے پر تمام اہل علم کا اتفاق نقل کیا ہے، سوائے کوفیوں کے۔“ (فتح الباری : 157/12)

**دلیل نمبر ② :** سیدنا زید بن خالد جہنی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ

میں نے کنوارے زانی کے لیے نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان مبارک سنا :

”جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيبُ عَامٍ .“ ”اس کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔“

(صحیح البخاری : 6831)

**دلیل نمبر ③ :** سیدنا ابو ہریرہ رحمہ اللہ سے روایت ہے :

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضَى فِيمَنْ زَنَى وَلَمْ يُحْصِنْ،  
بِنَفْيِ عَامٍ بِإِقَامَةِ الْحَدِّ عَلَيْهِ .  
”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے کنوارے زانی

کے لیے سو کوڑے مارنے کے ساتھ ساتھ ایک سال جلاوطنی کا فیصلہ فرمایا۔“

(صحیح البخاری : 6833)

**دلیل نمبر ④ :** سیدنا عبادہ بن صامت رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ

«خُذُوا عَنِّي، خُذُوا عَنِّي، قَدْ جَعَلَ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي ارشاد فرمایا :  
اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا، الْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ، وَالثِّبُّ بِالثِّبِّ



جلد مائتہ وَاَلرَّجْمُ»۔ ”مجھ سے احکامِ شریعت لے لو، مجھ سے احکامِ شریعت سیکھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے زانی عورتوں کے لیے فیصلہ فرما دیا ہے۔ اگر کنواری عورت کنوارے مرد سے زنا کرے، تو دونوں کو سو سو کوڑے مارنے کے ساتھ ایک ایک سال جلاوطن کیا جائے اور اگر شادی شدہ عورت شادی شدہ مرد سے زنا کرے، تو دونوں کو سو سو کوڑے مارنے کے ساتھ رجم کر دیا جائے۔“ (صحیح مسلم: 1690)

**دلیل نمبر ⑤ :** سیدنا ابو ہریرہ اور سیدنا زید بن خالد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَامَ رَجُلٌ، فَقَالَ: أَنْشُدَكَ اللَّهَ! إِلَّا قَضَيْتَ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللَّهِ، فَقَامَ خَصْمُهُ، وَكَانَ أَفْقَهَ مِنْهُ، فَقَالَ: أَقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللَّهِ وَأُذُنِ لِي؟ قَالَ: قُلْ، قَالَ: إِنَّ ابْنِي كَانَ عَسِيفًا عَلَى هَذَا، فَزَنَى بِامْرَأَتِهِ، فَافْتَدَيْتُ مِنْهُ بِمِائَةِ شَاةٍ وَوَخَادِمٍ، ثُمَّ سَأَلْتُ رِجَالًا مِّنْ أَهْلِ الْعِلْمِ، فَأَخْبَرُونِي أَنَّ عَلَى ابْنِي جَلْدَ مِائَةٍ وَتَغْرِيبَ عَامٍ، وَعَلَى امْرَأَتِهِ الرَّجْمُ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللَّهِ جَلَّ ذِكْرُهُ، الْمِائَةُ شَاةٍ وَالْوَخَادِمُ رَدٌّ عَلَيْكَ، وَعَلَى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيبُ عَامٍ، وَاعْدُ يَا أُنَيْسُ عَلَى امْرَأَةٍ هَذَا، فَإِنْ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمَهَا»۔

”ہم نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں موجود تھے کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا:

اللہ کے رسول! آپ کو اللہ کا واسطہ، ہمارے مابین کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیے۔ اس کا مد مقابل کھڑا ہوا، وہ اس سے سمجھ دار بھی تھا۔ اس نے کہا: ہمارے مابین کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیے اور مجھے بات کرنے کی اجازت دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہو۔ اس

نے کہا: میرا بیٹا اس کے ہاں مزدوری کرتا تھا، اس نے اس شخص کی بیوی کے ساتھ زنا کر لیا۔ میں نے ایک سو بکری اور ایک غلام اس کے فدیے کے طور پر دیا۔ پھر میں نے اہل علم لوگوں سے سوال کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا ملے گی، جبکہ اس کی بیوی کو رجم کیا جائے گا۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تمہارے مابین اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ سو بکریاں اور غلام تمہیں لوٹا دیا جائے گا۔ تیرے بیٹے کو سو کوڑے اور ایک سالہ جلاوطنی کی سزا ہوگی۔ اے اُنیس! اس کی بیوی کے پاس جاؤ۔ اگر وہ اعترافِ جرم کرے، تو اسے رجم کر دو۔‘ (صحیح البخاری: 6827، صحیح مسلم: 1697)

**دلیل نمبر ⑥:** سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَرَبَ وَعَرَبَ، وَأَنَّ أَبَا بَكْرٍ ضَرَبَ وَعَرَبَ، وَأَنَّ عُمَرَ ضَرَبَ وَعَرَبَ. ”نبی اکرم ﷺ نے (کنوارے زانی کو (سو) کوڑے مارے اور (ایک سال) جلاوطن کیا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی (کنوارے زانی کو (سو) کوڑے مارے اور (ایک سال) جلاوطن کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی (کنوارے زانی کو (سو) کوڑے مارے اور (ایک سال) جلاوطن کیا۔“

(سنن الترمذی: 1438، السنن الکبریٰ للنسائی: 7302، السنن الکبریٰ للبیہقی: 223/8)

(المستدرک علی الصحیحین للحاکم: 4/369، وسندہ صحیح)

اس حدیث کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔ (فتح الباری لابن حجر: 158/12)

امام حاکم رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ عَلَى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ.



”یہ حدیث امام بخاری و امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔“

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

حافظ ابن قطان فاسی رحمہ اللہ اس حدیث اور اس کے راویوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَعِنْدِي أَنَّهُ حَدِيثٌ صَحِيحٌ، مَا مِنْ هَؤُلَاءِ مَنْ يُسْأَلُ عَنْهُ، لِيَقْتَتِلَهُمْ وَشَهَرَتِهِمْ.

”میرے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔ اس کے راویوں میں سے کوئی ایسا نہیں جس کے

بارے میں پوچھا جائے، کیونکہ یہ سارے ثقہ اور مشہور ہیں۔“ (بیان الوهم والإيهام في كتاب

الأحكام: 5/444-445، ح: 262، نصب الرأية للزيلعي: 3/331)

امام ترمذی رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَقَدْ صَحَّ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّفِيُّ، رَوَاهُ أَبُو هُرَيْرَةَ، وَزَيْدُ بْنُ خَالِدٍ، وَعَبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ، وَغَيْرُهُمْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالْعَمَلُ عَلَى هَذَا عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِنْهُمْ أَبُو بَكْرٍ، وَعُمَرُ، وَعَلِيٌّ، وَأَبِي بَنْ كَعْبٍ، وَعَبْدُ اللَّهِ ابْنُ مَسْعُودٍ، وَأَبُو ذَرٍّ، وَغَيْرُهُمْ، وَكَذَلِكَ رَوَى عَنْ غَيْرِ وَاحِدٍ مِّنْ فُقَهَاءِ التَّابِعِينَ، وَهُوَ قَوْلُ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ، وَمَالِكِ بْنِ أَنَسٍ، وَعَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْمُبَارَكِ، وَالشَّافِعِيِّ، وَأَحْمَدَ، وَإِسْحَاقَ.

”یقیناً نبی اکرم ﷺ سے (کنوارے زانی کو) جلاوطن کرنا ثابت ہے۔ آپ ﷺ سے

اس عمل کو سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا زید بن خالد، سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ وغیرہ نے روایت کیا

ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام، جن میں سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا علی، سیدنا ابی بن

کعب، سیدنا عبد اللہ بن مسعود، سیدنا ابو ذر وغیرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں، کا اسی حدیث کے مطابق



عمل ہے۔ بہت سے تابعین فقہائے کرام سے یہی بات مروی ہے۔ امام سفیان ثوری، امام مالک بن انس، امام عبد اللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا یہی فتویٰ ہے۔“

**دلیل نمبر ④ :** امام عامر شعمی تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں :

إِنَّ عَلِيًّا جَلَدَ وَنَفَى مِنَ الْبَصْرَةِ إِلَى الْكُوفَةِ، أَوْ قَالَ : مِنَ الْكُوفَةِ إِلَى الْبَصْرَةِ . ”سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے (کنوارے زانی کو سو) کوڑے لگائے اور بصرہ سے کوفہ کی طرف یا کوفہ سے بصرہ کی طرف جلاوطن کیا۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی : 223/8 ، وسندہ صحیح)

**دلیل نمبر ⑤ :** مفتی مکہ، امام عطاء بن ابورباح رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

الْبَكْرُ يُجْلَدُ مِائَةً وَيُنْفَى سَنَةً . ”کنوارے زانی کو سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے۔“

(مصنّف عبد الرزّاق : 309/7 ، ح : 13306 ، وسندہ صحیح)

ان تمام دلائل شرعیہ کے خلاف احناف کا مذہب یہ ہے کہ جلاوطنی شرعی حکم نہیں، حالانکہ کسی صحابی و تابعی نے کنوارے زانی کی جلاوطنی کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں فرمائی۔

**جلاوطنی کے بارے میں دعویٰ نسخ کی حقیقت**

احناف ان دلائل کا ایک جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ احادیث منسوخ ہیں۔

(شرح معاني الآثار للطحاوي : 139/3 ، الهداية شرح البداية للمرخيني : 504/2)

حسب ”روایت“ احناف کا یہ دعویٰ نسخ بھی بے دلیل اور محض اپنے مذہب کو سہارا دینے

اور حدیث کو رد کرنے کے لیے ہے۔

ان کے رد و جواب میں حافظ، احمد بن علی، ابن حجر رحمہ اللہ (771-852ھ) فرماتے ہیں:

وَاحْتَجَّ بَعْضُهُمْ بِأَنَّ حَدِيثَ عُبَادَةَ الَّذِي فِيهِ النَّفْيُ مَنْسُوخٌ بِآيَةِ النُّورِ،  
لِأَنَّ فِيهَا الْجَلْدَ بِغَيْرِ نَفْيٍ، وَتُعَقَّبَ بِأَنَّهُ يُحْتَاجُ إِلَى ثُبُوتِ التَّارِيخِ، وَبِأَنَّ  
الْعَكْسَ أَقْرَبُ، فَإِنَّ آيَةَ الْجَلْدِ مُطْلَقَةٌ فِي حَقِّ كُلِّ زَانٍ.

”بعض احناف نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث سورہ نور کی آیت کی بنا پر منسوخ ہے، کیونکہ اس آیت میں جلا وطنی کے بغیر کوڑوں کا ذکر ہے۔ اس کا رد یوں کیا گیا ہے کہ نسخ تاریخ کے ثبوت کا محتاج ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ آیت پہلے نازل ہوئی ہو اور حدیث بعد کی ہو، کیونکہ یہ کوڑوں والی آیت کریمہ ہر زانی کے بارے میں عام ہے (جبکہ حدیث نے بعد میں شادی شدہ کو اس سے خاص کیا ہے)۔“

(فتح الباری: 12/159)

نیز فرماتے ہیں: وَفِي دَعْوَى النَّسْخِ فِي ذَلِكَ نَظَرٌ.

”اس بارے میں نسخ کا دعویٰ کرنا محل نظر ہے۔“ (الدرایۃ مع الہدایۃ: 2/504)

برصغیر پاک و ہند کے مشہور حنفی عالم، علامہ عبدالحی لکھنوی (1263-1304ھ) لکھتے ہیں:

وَهُوَ أَمْرٌ لَا سَبِيلَ إِلَى إِثْبَاتِهِ بَعْدَ ثُبُوتِ عَمَلِ الْخُلَفَاءِ بِهِ، مَعَ أَنَّ  
النَّسْخَ لَا يَثْبُتُ بِالْإِحْتِمَالِ. ”یہ ایسا دعویٰ ہے، جس کو ثابت کرنا ممکن ہی

نہیں، کیونکہ خلفاء راشدین نے اس پر عمل کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نسخ محض احتمال کے ساتھ ثابت نہیں ہو سکتا۔“ (التعلیق الممجد علی مؤطا محمد: 3/90)

کیا جلا وطنی شرعی کی بجائے سیاسی حکم تھا؟

کنوارے زانی کے لیے جلا وطنی کی شرعی سزا رد کرنے کے لیے مقلدین دوسرا جواب





یہ دیتے ہیں کہ یہ سزا شرعی نہیں، بلکہ سیاسی اور تعزیری تھی۔ لو اب مقلدین فیصلہ کریں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے احکامات میں سے شرعی کون سے ہیں اور سیاسی و تعزیری کون سے؟ خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ وہ کنوارے زانی کو جس طرح سوکڑوں کی سزا دیتے تھے، اسی طرح جلاوطنی کی بھی سزا دیتے تھے۔ صحابہ کرام شرعی احکامات کو بخوبی سمجھنے والے تھے، ان میں سے کسی نے جلاوطنی کو سیاسی یا تعزیری سزا قرار دے کر اس میں رخصت نہیں دی۔

مقلدین اس حوالے سے دو روایات پیش کرتے ہیں۔ آئیے ان کی حالت ملاحظہ فرمائیں:

### سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت:

سعید بن مسیب تابعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عَرَّبَ عُمَرُ ابْنَ أُمَيَّةَ بْنَ خَلْفٍ فِي الشَّرَابِ إِلَى خَيْبَرَ، فَلَحِقَ بِهِرْقَلٌ، فَتَنَصَّرَ، قَالَ عُمَرُ: لَا أَعَرِّبُ بَعْدَهُ مُسْلِمًا أَبَدًا.

”سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ربیعہ بن امیہ بن خلف کو شراب پینے کی بنا پر خیبر کی طرف جلاوطن کیا۔ وہ ہرقل کے پاس جا کر نصرانی ہو گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں آج کے بعد کسی مسلمان کو جلاوطن نہیں کروں گا۔“

لیکن اس روایت کی سند سخت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

\* مصنف عبد الرزاق کی ایک سند میں امام عبد الرزاق اور امام ابن جریج دونوں ”مذلس“ ہیں۔ انہوں نے سماع کی تصریح نہیں کی۔

\* مصنف کی دوسری سند میں بھی امام عبد الرزاق اور امام زہری دونوں کی ”مذلیس“ موجود ہے۔



لہذا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے جلاوطنی کو شرعی حد نہ ماننا ثابت نہیں ہو سکا، اس کے برعکس ان کا اپنے دور خلافت میں کنوارے زانی کو جلاوطنی کی سزا دینا ہم ثابت کر چکے ہیں۔ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ثابت شدہ سنت کو چھوڑ کر ضعیف روایات سے دین کے احکام اخذ کرنا کون سی فقاہت ہے؟

## سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور جلاوطنی:

امام ابراہیم نخعی تابعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْعُودٍ، فِي الْبَكْرِ يَزْنِي بِالْبَكْرِ، : يُجْلَدَانِ مِائَةً، وَيُنْفَيَانِ سَنَةً، قَالَ إِبْرَاهِيمُ : لَا يُنْفَيَانِ إِلَى قَرْيَةٍ وَاحِدَةٍ، يُنْفَى كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا إِلَى قَرْيَةٍ، وَقَالَ عَلِيٌّ : حَسْبُهُمَا مِنَ الْفِتْنَةِ أَنْ يُنْفَيَا.

”سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کنوارے مرد کے کنواری عورت کے ساتھ زنا کی صورت میں فرمایا کہ دونوں کو سو سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لیے ان کو جلاوطن کر دیا جائے۔ (ابراہیم نخعی کہتے ہیں:) دونوں کو ایک ہی بستی کی طرف جلاوطن نہ کیا جائے، بلکہ دونوں کو الگ الگ بستیوں میں بھیجا جائے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دونوں کو جلاوطن کرنا بہت بڑے فتنہ کا باعث ہے۔“

(مصنّف عبد الرزّاق: 311/7، ح: 13313، کتاب الآثار لمحمّد بن الحسن الشیبانی نقلاً

عن الدراية مع الهداية لابن حجر: 504/2)

اس قول کی سند بھی سخت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

\* امام عبد الرزاق رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ سند میں درج ذیل چار علتیں ہیں:

① امام عبد الرزاق بن ہمام ”مدلس“ ہیں اور سماع کی تصریح نہیں کی۔



② امام ابو حنیفہ با اتفاقِ محدثین روایتِ حدیث میں معتبر نہیں۔ کسی ثقہ محدث سے ان کا ثقہ ہونا ثابت نہیں۔

③ حماد بن ابوسلیمان ”مختلط“ روای ہیں اور امام ابو حنیفہ ان لوگوں میں سے نہیں، جنہوں نے ان سے قبل از اختلاط سنا ہے۔ اس بارے میں علامہ پیشی لکھتے ہیں:

وَلَمْ يُقْبَلْ مِنْ حَدِيثِ حَمَّادٍ إِلَّا مَا رَوَاهُ عَنْهُ الْقُدَمَاءُ؛ شُعْبَةُ، وَسُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ، وَالِدَسْتَوَائِي، وَمَنْ عَدَا هَؤُلَاءِ رَوَوْا عَنْهُ بَعْدَ الْإِخْتِلَاطِ .

”حماد کی وہی حدیث قبول کی جائے گی، جو ان سے قدماء، یعنی شعبہ، سفیان ثوری اور ہشام دستوائی نے بیان کی ہے۔ باقی لوگوں نے حماد سے اختلاط کے بعد احادیث سنی ہیں۔“

(مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: 1/119)

④ ابراہیم نخعی نے کسی صحابی سے سماع نہیں کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات ہی نہیں ہوئی تو ان سے روایت کیسے بیان کر سکتے ہیں؟

\* رہی کتاب الآثار، تو وہ جھوٹی کتاب ہے۔ اس کا راوی محمد بن حسن شیبانی محدثین کرام کے بقول ”کذاب“ ہے۔ اس کی بیان کردہ کوئی روایت معتبر نہیں۔

معلوم ہوا کہ کنوارے زانی کی شرعی حد سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ جلاوطنی کے شرعی سزا ہونے کا انکار سنتِ رسول کی مخالفت اور حدودِ اسلام کی پامالی ہے۔ اسی طرح قرعہ اندازی بھی قرآنی تعلیم اور سنتِ رسول ہے۔ اس کا انکار قرآن و سنت سے انحراف ہے۔

مقلدین محض تقلید کی بنا پر قرآن و سنت کی ان تعلیمات سے رُوگردانی کیے ہوئے ہیں۔ اس سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ تقلید، اتباع و اطاعت کے منافی اور واضح گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر گمراہی سے محفوظ فرمائے۔





## باغِ فدک

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

اہل تشیع کی بنیاد ہی غلو پر ہے، جیسا کہ مشہور شیعہ عالم محمد باقر مجلسی نے اپنی کتاب بحار الانوار (26/267) میں یوں باب قائم کیا ہے:

بَابُ تَعْظِيمِهِمْ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ، وَعَلَى جَمِيعِ الْخَلْقِ.

”اس بات کا بیان کہ اہل بیت کو انبیائے کرام اور تمام مخلوق پر عظمت حاصل ہے۔“

ان کے نزدیک ائمہ معصومین تمام انبیا اور ساری مخلوق سے افضل ہیں، یعنی ان لوگوں نے اہل بیت کی محبت میں اس قدر غلو کیا کہ ان کو انبیائے کرام سے بھی افضل قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں جو لوگ انبیائے کرام جیسی مقدس ہستیوں کی گستاخی کے درپے ہوں، ان سے صحابہ کرام کے بارے میں کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟

امت کے سب سے بہتر اور افضل انسان سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر اصحاب رسول پر طعن و تشنیع کرنا تو گویا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ یہ لوگ خلیفہ اول، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس بنیاد پر غاصب اور ظالم قرار دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک مدینہ، خیبر اور فدک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں جو مال اور زمین تھی، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تھی۔ ان کے بقول وہ اہل بیت میں تقسیم ہونا چاہیے تھی، وہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اہل بیت کو کیوں نہ دی؟ سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے مطالبے پر بھی ان کو نہیں دی گئی۔۔۔

حالانکہ بدیہی بات ہے کہ یہ سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی اجتہادی خطا تھی، کیونکہ اس دعویٰ میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اہل بیت میں سے کوئی فرد شریک نہیں ہوا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دلیل کے ساتھ قائل کرنے کی کوشش کی۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا



اور اہل بیت میں سے کسی نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس حوالے سے غاصب یا ظالم نہیں کہا۔ وہ کہہ بھی کیسے سکتے تھے؟ وہ مال سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہ غصب کیا، نہ اپنی ذات پر اس میں سے ایک پائی بھی خرچ کی، بلکہ خلیفہ ہونے کے ناطے ان کے پاس امانت تھا۔ ان کے بعد پھر یہی مال سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، ان کے بعد سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آ گیا۔

سوال یہ ہے کہ وہ مال سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اہل بیت کے مابین تقسیم کیوں نہ کیا؟ جو جواب یہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں دیا جائے گا، وہی جواب وہاں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں سمجھا جائے۔ کیا اس بنا پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو غاصب قرار دیا جاسکتا ہے؟

اسی بارے میں امام اندلس، حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ (368-463ھ) فرماتے ہیں:

وَأَمَّا الرِّوَاغُ فَلَيْسَ قَوْلُهُمْ مِمَّا يُشْتَغَلُ بِهِ، وَلَا يُحْكِي مِثْلَهُ، لِمَا فِيهِ مِنَ الطَّعْنِ عَلَى السَّلَفِ، وَالْمُخَالَفَةِ لِسَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ، ----، وَكَيْفَ يَسُوغُ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَظُنَّ بِأَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مَنَعَ فَاطِمَةَ مِيرَاثَهَا مِنْ أَبِيهَا، وَهُوَ يَعْلَمُ بِنَقْلِ الْكَافَةِ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ كَانَ يُعْطِي الْأَحْمَرَ وَالْأَسْوَدَ حُقُوقَهُمْ، وَلَمْ يَسْتَأْذِرْ مِنْ مَالِ اللَّهِ لِنَفْسِهِ، وَلَا لِبَنِيهِ، وَلَا لِأَحَدٍ مِّنْ عَشِيرَتِهِ شَيْءٌ، وَإِنَّمَا أَجْرَاهُ مَجْرَى الصَّدَقَةِ، أَلَيْسَ يَسْتَحِيلُ فِي الْعُقُولِ أَنْ يَمْنَعَ فَاطِمَةَ، وَيَرُدَّهَ عَلَى سَائِرِ الْمُسْلِمِينَ؟

”رِوَاغ کے قول کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے، نہ ہی اُسے نقل کیا جائے، کیونکہ اس میں سلف صالحین پر طعن ہے اور مؤمنوں کے راستے کی مخالفت ہے۔ کسی مسلمان کے لیے



کیسے ممکن ہے کہ وہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گمان کرے کہ انہوں نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے ان کے والد محترم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت روک دی تھی؟ حالانکہ وہ تمام لوگوں کی نقل کی ہوئی اس بات کو جانتا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہر سرخ و سیاہ کے حقوق کو ادا کرتے تھے۔ انہوں نے تو اللہ تعالیٰ کے مال میں سے اپنی ذات، اولاد اور اپنے عزیز و اقارب میں سے بھی کسی کے لئے کچھ نہیں لیا۔ انہوں نے بیت المال میں آنے والے تمام مال کو صدقہ کی حیثیت سے لوگوں پر خرچ کیا۔ کیا عقلاً یہ محال نہیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مال کو روک لیں اور اسے باقی مسلمانوں پر خرچ کر دیں؟“

(التمہید لما فی الموطأ من المعانی والأسانید لابن عبد البر: 161/8-172)

### باغِ فدک اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے باغِ فدک کو صدقہ کی حیثیت دی، جو کہ اہل بیت پر حرام ہے اور ان کا یہ فیصلہ بالکل برحق تھا، جیسا کہ:

① متواتر حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا نُورَثُ، مَا تَرَكَنَا صَدَقَةٌ».

”ہماری میراث نہیں ہوتی۔ ہم (انبیاء) جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں، وہ صدقہ ہوتا ہے۔“

(صحیح البخاری: 6727، صحیح مسلم: 1761، عن أبي هريرة)

② ام المومنین، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

إِنَّ فَاطِمَةَ، عَلَيْهَا السَّلَامُ، أَرْسَلَتْ إِلَى أَبِي بَكْرٍ تَسْأَلُهُ مِيرَاثَهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فِيمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، تَطْلُبُ صَدَقَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّتِي بِالْمَدِينَةِ وَفَدَكَ،



وَمَا بَقِيَ مِنْ خُمْسِ خَيْبَرَ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا نُورُثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ، إِنَّمَا يَأْكُلُ آلُ مُحَمَّدٍ مِّنْ هَذَا الْمَالِ، يَعْنِي مَالَ اللَّهِ، لَيْسَ لَهُمْ أَنْ يَزِيدُوا عَلَى الْمَأْكُلِ»، وَإِنِّي وَاللَّهِ! لَا أُغَيِّرُ شَيْئًا مِّنْ صَدَقَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهَا فِي عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَأَعْمَلَنَّ فِيهَا بِمَا عَمِلَ فِيهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَتَشْهَدْ عَلَيَّ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّا قَدْ عَرَفْنَا يَا أَبَا بَكْرٍ فَضِيلَتَكَ، وَذَكَرَ قَرَابَتَهُمْ مِّنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَقَّهُمْ، فَتَكَلَّمَ أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَقَرَابَةُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ أَصِلَ مِنْ قَرَابَتِي.

”سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس اپنا ایک آدمی بھیج کر نبی کریم ﷺ کی اس میراث کا مطالبہ کیا، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مالِ فتنے کی صورت میں دی تھی، یعنی آپ ﷺ کا مطالبہ مدینہ کی اس جائیداد کے بارے میں تھا، (جس کی آمدن نبی کریم ﷺ مصارفِ خیر میں خرچ کرتے تھے) اور اسی طرح فدک کی جائیداد اور خیبر کے نمس کا بھی مطالبہ کیا۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ خود فرما گئے ہیں کہ ہماری میراث نہیں ہوتی، ہم (انبیاء) جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں، وہ صدقہ ہوتا ہے اور یہ کہ آلِ محمد ﷺ کے اخراجات اس مال سے پورے کئے جائیں، مگر انہیں یہ حق نہیں ہوگا کہ کھانے کے علاوہ اور کچھ تصرف کریں۔ اللہ کی قسم! نبی کریم ﷺ کے جو صدقات آپ ﷺ کے زمانے میں ہوا کرتے تھے، ان میں کوئی رد و بدل نہیں کروں گا، بلکہ وہی نظام جاری رکھوں گا، جو



نبی کریم ﷺ نے خود قائم فرمایا تھا۔ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے: اے ابو بکر رضی اللہ عنہ! ہم آپ کی فضیلت و مرتبہ کا اقرار کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اپنی قرابت داری اور اپنے حق کا ذکر کیا۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، نبی کریم ﷺ کے قرابت داروں سے حسن سلوک کرنا مجھ کو اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے زیادہ عزیز ہے۔“ (صحیح البخاری: 3711، 3712، صحیح مسلم: 1758)

شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (773-852ھ) فرماتے ہیں:

وَ [صَدَقَةً] بِالنَّصَبِ عَلَى الْحَالِ، وَهِيَ دَعْوَى مِنْ بَعْضِ الرَّافِضَةِ، فَادَّعَى أَنَّ الصَّوَابَ فِي قِرَاءَةِ هَذَا الْحَدِيثِ هَكَذَا، وَالَّذِي تَوَارَدَ عَلَيْهِ أَهْلُ الْحَدِيثِ فِي الْقَدِيمِ وَالْحَدِيثِ [لَا نُورُثُ]، بِالنُّونِ وَ [صَدَقَةً] بِالرَّفْعِ، وَأَنَّ لِلْكَلامِ جُمْلَتَيْنِ، وَ [مَا تَرَكْنَا] فِي مَوْضِعِ الرَّفْعِ بِالْإِبْتِدَاءِ، وَ [صَدَقَةً] خَبَرَهُ، وَيُؤَيِّدُهُ وَرُودُهُ فِي بَعْضِ طُرُقِ الصَّحِيحِ [مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةً]، وَقَدْ اِحتَجَّ بَعْضُ الْمُحَدِّثِينَ عَلَى بَعْضِ الْإِمَامِيَّةِ، بِأَنَّ أَبَا بَكْرٍ اِحتَجَّ بِهَذَا الْكَلَامِ عَلَى فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، فِيمَا اِتَّمَسَتْ مِنْهُ مِنَ الَّذِي خَلَفَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْارْاضِي، وَهُمَا مِنْ أَفْصَحِ الْفُصَحَاءِ، وَأَعْلَمُهُمْ بِمَذْلُولَاتِ الْأَلْفَاظِ، وَلَوْ كَانَ الْأَمْرُ كَمَا يَقْرَأُ الرَّافِضِيُّ لَمْ يَكُنْ فِيمَا اِحتَجَّ بِهِ أَبُو بَكْرٍ حُجَّةً، وَلَا كَانَ جَوَابُهُ مُطَابِقًا لِسُؤَالِهَا، وَهَذَا وَاضِحٌ لِمَنْ أَنْصَفَ.





”بعض روافض نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس حدیث کی قراءت میں لفظ [صَدَقَ] کا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہونا ہی صحیح ہے، لیکن جس پر جدید اور قدیم محدثین کا اتفاق ہے، وہ [لَا نُورُث] نون کے ساتھ ہے، [صَدَقَ] مرفوع ہے۔ کلام کے دو جملے ہیں؛ ایک [مَا تَرَكَنَا] مبتدا ہونے کے لحاظ سے محلاً مرفوع ہے، [صَدَقَ] اس کی خبر ہے۔ صحیح بخاری کی ایک راویت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس میں الفاظ یہ ہیں: [مَا تَرَكَنَا فَهُوَ صَدَقَ] یعنی ہم (انبیاء) نے جو مال چھوڑا ہے وہ صدقہ ہی ہے۔ محدثین کرام نے بعض امامی رافضیوں کے خلاف سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو ہی کو دلیل بنایا ہے، جو انہوں نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اس زمین کے متعلق بطور دلیل پیش کی، جس کو نبی کریم ﷺ اپنے پیچھے چھوڑ کر گئے تھے۔ یہ دونوں ہستیاں تمام فصحاء سے بڑی فصیح تھیں۔ دونوں حدیث کے الفاظ کے مطالب و مفاہیم کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اگر ان الفاظ کی قراءت ایسے ہی ہے، جیسے رافضی پڑھتے ہیں، پھر اس سے تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دلیل ہی نہیں بنتی اور ان کا جواب بھی سوال کے مطابق نہیں بنتا۔ انصاف کا دامن تھامنے والے کے لئے بات واضح ہے۔“

(فتح الباری شرح صحیح البخاری: 202/6)

حافظ، عبد الرحیم بن حسین، عراقی رضی اللہ عنہ (725-806ھ) کہتے ہیں:

هَذِهِ الرَّوَايَةُ صَرِيحَةٌ فِي الرَّدِّ عَلَى بَعْضِ جَهْلَةِ الشَّيْعَةِ، حَيْثُ قَالَ فِي الرَّوَايَةِ الَّتِي سَقْنَاهَا مِنْ مُسْلِمٍ: «مَا تَرَكَنَا صَدَقَ» أَنَّهُ بِالنَّصْبِ عَلَى أَنَّ مَا نَافِيَةٌ، وَهُوَ غَلَطٌ قَبِيحٌ، بَلْ هُوَ بِالرَّفْعِ، وَمَا مَوْصُولَةٌ، وَرَوَّايَتُنَا صَرِيحَةٌ فِي ذَلِكَ، لِقَوْلِهِ فِيهَا: «فَهُوَ صَدَقَ».

”یہ روایت بعض جاہل شیعوں کا واضح طور پر رد کرتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو روایت

ہم نے صحیح مسلم سے لی ہے، اس میں لفظ [صَدَقَ] منصوب ہے اور مانافہ ہے، (یعنی جو ہم انبیاء چھوڑتے ہیں، وہ صدقہ نہیں) لیکن یہ ان کی قبیح غلطی ہے، کیونکہ [صَدَقَ] مرفوع ہے، اور ماموصلہ ہے۔ اس ضمن میں ہماری بیان کردہ روایت بالکل واضح ہے، جس میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ان الفاظ میں ہے: [مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ] ہم انبیاء جو چھوڑ جائیں، وہ صدقہ ہی ہوتا ہے۔“ (طرح التثريب في شرح التقریب: 242/6)

شارح سنن ترمذی، علامہ محمد عبدالرحمن، مبارکپوری رحمہ اللہ (م: 1353ھ) کہتے ہیں:

و [مَا تَرَكْنَا] فِي مَوْضِعِ الرَّفْعِ بِالْإِبْتِدَاءِ، وَ [صَدَقَ] خَبَرُهُ، وَقَدْ زَعَمَ بَعْضُ الرَّافِضَةِ أَنَّ [لَا نُورُثُ] بِالْيَاءِ التَّحْتَانِيَّةِ، وَ [صَدَقَ] بِالنَّصْبِ عَلَى الْحَالِ، وَ [مَا تَرَكْنَاهُ] فِي مَحَلِّ رَفْعٍ عَلَى النَّيَابَةِ، وَالتَّقْدِيرُ: لَا يُورَثُ الَّذِي تَرَكْنَاهُ حَالِ كَوْنِهِ صَدَقَةً، وَهَذَا خِلَافُ مَا جَاءَتْ بِهِ الرَّوَايَةُ، وَنَقَلَهُ الْحُفَّاظُ، وَمَا ذَلِكَ بِأَوَّلِ تَحْرِيفٍ مِّنْ أَهْلِ تِلْكَ النِّحْلَةِ، وَيُوضِّحُ بَطْلَانَهُ مَا فِي حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ الْمَذْكُورِ بَلْفَظِ [فَهُوَ صَدَقَةٌ]، وَقَوْلُهُ: «لَا تَقْتَسِمُ وَرَثَتِي دِينَارًا».

”[مَا تَرَكْنَا] مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور [صَدَقَ] اس کی خبر ہے۔ بعض

رافضیوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ لفظ [يُورَثُ] ہے، [صَدَقَ] حال ہونے کے لحاظ سے منصوب ہے۔ [مَا تَرَكْنَا] یہ مرفوع بالنیابۃ ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی: [لَا يُورَثُ الَّذِي تَرَكْنَاهُ حَالِ كَوْنِهِ صَدَقَةً] جو چیز ہم بطور صدقہ چھوڑتے ہیں، وہ میراث نہیں ہوتی۔ یہ تاویل ان صحیح احادیث کے خلاف ہے، جن کو حفاظ محدثین نے نقل کیا ہے۔ یہ اس فرقہ کی کوئی پہلی تحریف نہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی مذکورہ حدیث اس بات کا واضح طور پر رد کرتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: [مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ] ہم انبیاء جو چھوڑ جائیں، وہ صدقہ ہی



ہوتا ہے۔ اور آپ ﷺ کے اس فرمان سے بھی صریح طور پر یہ تاویل باطل قرار پاتی ہے کہ میرے وارث بننے والے لوگ ایک دینار بھی بطور وراثت حاصل نہیں کریں گے۔“

(تحفة الأحوذی: 193/5)

یہاں ہم ایک مناظرہ کا بھی ذکر کیے دیتے ہیں، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مرتضیٰ موسوی شیعہ اور ابوعلی حسین بن خضر قاضی کے مابین مسئلہ ”میراث الانبیاء“ پر ہوا۔ ہمیں اس کی سند تو نہیں مل سکی، البتہ اس قصے میں رافضیوں کے استدلال کا ایک اور طریقہ سے رد موجود ہے۔ اسی فائدے کی خاطر اسے پیش کیا جا رہا ہے:

فَإِنَّ أَبَا عَلِيٍّ تَمَسَّكَ بِهَذَا الْحَدِيثِ (قَوْلُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا نُورَثُ، مَا تَرَكْنَا صَدَقَةً»)، فَاعْتَرَضَ عَلَيْهِ الْمُرْتَضَى الْمُسَوِّيُّ، وَقَالَ: كَيْفَ تَقُولُ إِعْرَابَ صَدَقَةٍ بِالرَّفْعِ أَوْ النَّصْبِ؟ إِنَّ قُلْتَ بِالرَّفْعِ فَلَيْسَ كَذَلِكَ، وَإِنْ قُلْتَ بِالنَّصْبِ فَهُوَ حُجَّتِي، لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَا تَرَكْنَا صَدَقَةً»، يَعْني لَمْ نَتْرُكْهُ صَدَقَةً، فَدَخَلَ أَبُو عَلِيٍّ وَقَالَ: فِيمَا ذَهَبَتْ إِلَيْهِ إِبْطَالُ فَائِدَةِ الْحَدِيثِ، فَإِنْ أَحَدًا لَا يَخْفَى عَلَيْهِ أَنَّ الْإِنْسَانَ إِذَا مَاتَ يَرِثُهُ قَرِيبُهُ، وَأَقْرَبُ النَّاسِ إِلَيْهِ، وَلَا يَكُونُ صَدَقَةً وَلَا يَقَعُ فِيهِ الْإِشْكَالُ، فَبَيَّنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ مَا تَرَكَهُ صَدَقَةٌ بِخِلَافِ سَائِرِ النَّاسِ .

”ابوعلی قاضی نے اس حدیث کو دلیل بنایا (کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہماری میراث نہیں ہوتی، ہم (انبیاء) جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں، وہ صدقہ ہوتا ہے)۔ اس پر مرتضیٰ موسوی شیعہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا: آپ اس حدیث کا اعراب کیسے پڑھتے ہو؟ [صَدَقَةً] کو مرفوع کرتے ہو یا منصوب؟ اگر اسے مرفوع پڑھتے ہو تو آپ کی بات درست نہیں ہے اور



اگر منصوب پڑھتے ہو، پھر تو یہ میری دلیل بنتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [مَا تَرَكَنَا صَدَقَةً]، یعنی ہم صدقہ نہیں چھوڑتے۔ ابوعلی قاضی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: جس طرف آپ اس حدیث کو لے کر جارہے ہیں، اس سے حدیث کا مقصد ہی باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ بات کسی انسان پر مخفی نہیں ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہوتا ہے، لوگوں میں سے جو سب سے بڑھ کر اس کے قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں، وہ اس کے وارث بنتے ہیں، وہ مال صدقہ نہیں ہوتا۔ اس بات میں کوئی اشکال بھی نہیں۔ اس خصوصی بیان کا مقصد ہی یہی ہے کہ عام لوگوں کے برعکس نبی اکرم ﷺ نے جو مال چھوڑا، وہ صدقہ ہے۔“

(الأنساب للسمعاني: 310/9)

یعنی ہر کسی کو معلوم ہے کہ امتیوں کا چھوڑا ہوا مال وارثوں میں تقسیم ہوتا ہے، صدقہ نہیں ہوتا۔ اگر نبی اکرم ﷺ کی وراثت میں بھی یہی معاملہ تھا، تو اس کا خصوصی بیان کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت کا معاملہ خاص تھا اور وہ یہ تھا کہ ان کی وراثت نہیں ہوتی، وہ جو کچھ چھوڑ جائیں، وہ صدقہ ہی ہوتا ہے۔ اس حدیث کا یہی مفہوم ہے، جیسا کہ وضاحت سے بیان بھی ہو چکا ہے۔

③ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

إِنَّ فَاطِمَةَ جَاءَتْ أَبَا بَكْرٍ، وَعُمَرَ، تَسْأَلُ مِيرَاثَهَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَا: سَمِعْنَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «إِنِّي لَا أُوْرَثُ»، قَالَتْ: وَاللَّهِ! لَا أَكَلِمُكُمَا أَبَدًا، فَمَاتَتْ وَلَا تُكَلِّمُهُمَا.

”سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، سیدنا ابو بکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پاس آئیں تاکہ ان سے نبی کریم ﷺ کی میراث طلب کریں۔ ان دونوں نے جواب دیا کہ ہم نے نبی کریم ﷺ



کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: میری کوئی وراثت نہیں ہوگی۔ اس پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ کی قسم! میں آپ دونوں سے کبھی گفتگو نہیں کروں گی۔ پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فوت ہونے تک ان دونوں صحابہ سے بات نہیں کی۔“

(مسند الإمام أحمد: 13/1، سنن الترمذی: 1609، وسنده حسن)

امام ترمذی رحمہ اللہ کے استاذ، علی بن عیسیٰ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مَعْنَى: لَا أَكَلِمَتُكُمْ، تَعْنِي فِي هَذَا الْمِيرَاثِ أَبَدًا، أَنْتُمَا صَادِقَانِ.

”روایت میں مذکور یہ الفاظ کہ میں آپ دونوں سے کبھی گفتگو نہیں کروں گی، ان کا معنی یہ ہے کہ میں اس میراث کے بارے میں کبھی آپ دونوں سے دوبارہ گفتگو نہیں کروں گی، کیونکہ آپ دونوں سچے ہیں۔ پھر ایسا ہی ہوا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی وفات تک دوبارہ اس وراثت کا تقاضا نہیں فرمایا۔“ (سنن الترمذی، تحت الحديث: 1609)

ان الفاظ کا یہی معنی و مفہوم معتبر ہے، کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بات سن کر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ بات ہماری ذکر کردہ حدیث نمبر ② میں بیان ہو چکی ہے۔

③ ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے:

إِنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا جَاءَتْ إِلَى أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، فَقَالَتْ: مَنْ يَرِثُكَ؟ قَالَ: أَهْلِي وَوَلَدِي، قَالَتْ: فَمَا لِي لَا أَرِثُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «إِنَّا لَا نُورِثُ»، وَلَكِنِّي أَعُولُ مَنْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُولُهُ، وَأُنْفِقُ عَلَى مَنْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنْفِقُ عَلَيْهِ.

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور کہنے لگیں: آپ کا وارث کون ہو

گا؟ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میری بیوی اور بچے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بولیں: پھر کیا وجہ ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث نہیں بن رہی۔ اس پر سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا: لیکن میں ان تمام لوگوں کی کفالت کرتا رہوں گا، جن کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفالت کیا کرتے تھے اور میں ان تمام لوگوں کو خرچ فراہم کروں گا، جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خرچ فراہم کیا کرتے تھے۔“ (السنن الکبریٰ للبیہقی: 302/6، وسندہ حسن)

⑤ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَفْتَسِمُ وَرَثَتِي دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا، مَا تَرَكَتْ بَعْدَ نَفَقَةِ نِسَائِي وَمَثُونَةِ عَامِلِي، فَهُوَ صَدَقَةٌ».

”جو لوگ میرے وارث ہیں، وہ میرے چھوڑے ہوئے دینار اور درہم کو تقسیم نہ کریں۔ میرا چھوڑا ہوا مال میری ازواج کے اخراجات اور جائیداد کا اہتمام کرنے والے کا خرچ نکالنے کے بعد صدقہ ہوگا۔“ (صحیح البخاری: 2776، صحیح مسلم: 1760)

⑥ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

إِنَّ فَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ، ابْنَةُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، سَأَلَتْ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيقَ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنْ يَقْسِمَ لَهَا مِيرَاثَهَا، مِمَّا تَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْهِ، فَقَالَ لَهَا أَبُو بَكْرٍ: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا نُورَثُ، مَا تَرَكَنَا صَدَقَةً»، فَغَضِبَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَهَجَرَتْ أَبَا بَكْرٍ، فَلَمْ تَزَلْ مُهَاجِرَتَهُ حَتَّى تُوَفِّيَتْ، وَعَاشَتْ



بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةَ أَشْهُرٍ، قَالَتْ: وَكَانَتْ فَاطِمَةُ تَسْأَلُ أَبَا بَكْرٍ نَصِيبَهَا، مِمَّا تَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ خَيْرٍ، وَفَدَكَ، وَصَدَقَتِهِ بِالْمَدِينَةِ، فَأَبَى أَبُو بَكْرٍ عَلَيْهَا ذَلِكَ، وَقَالَ: لَسْتُ تَارِكًا شَيْئًا، كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْمَلُ بِهِ إِلَّا عَمَلْتُ بِهِ، فَإِنِّي أَخْشَى إِنْ تَرَكَتُ شَيْئًا مِنْ أَمْرِهِ أَنْ أَزِيعَ، فَأَمَّا صَدَقَتُهُ بِالْمَدِينَةِ فَدَفَعَهَا عُمَرُ إِلَى عَلِيٍّ، وَعَبَّاسٍ، وَأَمَّا خَيْرٌ، وَفَدَكَ، فَأَمْسَكَهَا عُمَرُ، وَقَالَ: هُمَا صَدَقَةُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، كَانَتْ لِحَقُوقِهِ الَّتِي تَعْرِوهُ وَنَوَائِبِهِ، وَأَمْرُهُمَا إِلَى مَنْ وَلِيَ الْأَمْرَ، قَالَ: فَهُمَا عَلَى ذَلِكَ إِلَى الْيَوْمِ.

”رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کے جہان فانی سے رخصت ہونے کے بعد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کے ترکہ کا مطالبہ کیا، کہ ان کو نبی کریم ﷺ کی میراث سے حصہ دیا جائے، جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مالِ فنی کی صورت میں دی تھی۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہمارا ورثہ تقسیم نہیں ہوتا، ہمارا ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر غصے کا اظہار کیا اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملاقات کو ترک کر دیا اور وفات تک ان سے نہ ملیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے بعد چھ ماہ زندہ رہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مزید بیان فرمایا: سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کے خیر، فدک اور مدینہ کے صدقہ کی وراثت کا مطالبہ کیا تھا، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس سے انکار تھا۔ انہوں نے فرمایا: میں کسی بھی ایسے عمل کو نہیں چھوڑ سکتا، جسے رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں کرتے تھے، میں ہر ایسے عمل کو ضرور کروں گا، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کے کسی عمل کو چھوڑا تو میں حق سے منحرف



ہو جاؤں گا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ کا مدینہ منورہ میں جو صدقہ تھا، وہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں سیدنا علی اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہما کو دے دیا، البتہ خیبر اور فدک کی جائیداد کو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے روک لیا اور فرمایا: یہ دونوں اشیاء رسول اللہ ﷺ کی طرف سے صدقہ ہیں، ان حقوق کے لئے جو وقتی طور پر پیش آتے یا وقتی حادثات کے لئے۔ یہ جائیدادیں اس شخص کے اختیار میں رہیں گی جو خلیفہ وقت ہوگا۔ امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان دونوں جائیدادوں کا انتظام آج تک ایسے ہی چلا آ رہا ہے۔“

(صحیح البخاری 3093، 3092، صحیح مسلم: 1759)

### فدک کی زمین ہبہ یا وراثت؟

بعض الناس اس مسئلہ میں واضح تناقض و اضطراب کا شکار ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک کی زمین رسول اللہ ﷺ نے ہبہ کی تھی اور کبھی کہتے ہیں کہ انہوں نے بطور میراث فدک کی زمین سے اپنا حصہ مانگا تھا۔

اس بارے میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

إِنَّ مَا ذُكِرَ مِنْ ادِّعَاءِ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا فَدَكَ، فَإِنَّ هَذَا يَنَاقِضُ كَوْنَهَا مِيرَاثًا لَهَا، فَإِنْ كَانَ طَلَبُهَا بِطَرِيقِ الْإِرْثِ امْتَنَعَ أَنْ يَكُونَ بِطَرِيقِ الْهَبَةِ، وَإِنْ كَانَ بِطَرِيقِ الْهَبَةِ امْتَنَعَ أَنْ يَكُونَ بِطَرِيقِ الْإِرْثِ، ثُمَّ إِنْ كَانَتْ هَذِهِ هِبَةً فِي مَرَضِ الْمَوْتِ، فَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْزَعٌ، إِنْ كَانَ يُورَثُ كَمَا يُورَثُ غَيْرُهُ، أَنْ يُوصِيَ لِوَارِثٍ أَوْ يَخْصَهُ فِي مَرَضِ مَوْتِهِ بِأَكْثَرِ مِنْ حَقِّهِ، وَإِنْ كَانَ فِي صِحَّتِهِ فَلَا بُدَّ أَنْ تَكُونَ هَذِهِ هِبَةً مَقْبُوضَةً، وَإِلَّا فَإِذَا وَهَبَ الْوَاهِبُ بِكَلَامِهِ وَلَمْ يَقْبِضِ الْمَوْهُوبُ شَيْئًا حَتَّى مَاتَ



الْوَاهِبُ كَانَ ذَلِكَ بَاطِلًا عِنْدَ جَمَاهِيرِ الْعُلَمَاءِ، فَكَيْفَ يَهْبُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَ لِفَاطِمَةَ، وَلَا يَكُونُ هَذَا أَمْرًا مَعْرُوفًا عِنْدَ أَهْلِ بَيْتِهِ وَالْمُسْلِمِينَ، حَتَّى تُخَصَّ بِمَعْرِفَتِهِ أَمْ أَيْمَنَ أَوْ عَلَيَّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا؟

”مالِ فدک کے متعلق سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعویٰ کا جو ذکر ملتا ہے، اس میں تناقض پایا جاتا ہے، (یہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں) اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک کی جاگیر میراث کی بنا پر طلب کرتی تھیں، تو یہ ہبہ نہیں ہو سکتا اور اگر آپ ﷺ نے یہ جاگیر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی، تو یہ وراثت نہیں بن سکتی۔ اگر یہ مانا جائے کہ یہ جاگیر رسول اللہ ﷺ نے مرض الموت میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی اور دوسرے لوگوں کی طرح آپ ﷺ کی وراثت بھی تقسیم ہونا تھی، تو آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک اس سے مبرا ہے کہ آپ ﷺ، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں وصیت کرتے، یا حالتِ مرض میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کے حق سے زیادہ مال عطا فرماتے، حالانکہ آپ رضی اللہ عنہا حقیقی وارث بھی تھیں اور وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں۔ اگر آپ ﷺ نے حالتِ صحت میں فدک کی جاگیر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عطا کی تھی، تو وہ ہبہ باقبضہ ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ ہبہ کرنے والا اگر کوئی چیز ہبہ کر دے اور جس کو ہبہ کیا گیا ہے، وہ اس چیز پر قابض نہ ہو اور ہبہ کرنے والا فوت ہو جائے، تو ایسا ہبہ جمہور علماء کے نزدیک ختم ہو جاتا ہے۔ یہ امر بھی موجب حیرت و استعجاب ہے کہ آپ ﷺ نے فدک کی جاگیر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عطا کی، مگر اس معاملہ کے متعلق سیدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سوا اہل بیت اور جملہ صحابہ کرام میں سے کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا!“

(منهاج السنة النبویة في نقض كلام الشيعة القدرية: 228/4)

صحیح بات تو یہ ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مطالبہ میراث کی حیثیت سے تھا، جیسا کہ:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے:

④



إِنَّ فَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ، بِنْتُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْسَلَتْ إِلَى أَبِي بَكْرٍ، تَسْأَلُهُ مِيرَاثَهَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْهِ بِالْمَدِينَةِ، وَفَدَكَ، وَمَا بَقِيَ مِنْ خُمْسِ خَيْبَرَ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا نُورَثُ، مَا تَرَكْنَا صَدَقَةً، إِنَّمَا يَأْكُلُ آلُ مُحَمَّدٍ [صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ] فِي هَذَا الْمَالِ»، وَإِنِّي وَاللَّهِ لَا أُغَيِّرُ شَيْئًا مِنْ صَدَقَةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ حَالِهَا الَّتِي كَانَ عَلَيْهَا فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَأَعْمَلَنَّ فِيهَا بِمَا عَمَلَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَبَى أَبُو بَكْرٍ أَنْ يَدْفَعَ إِلَى فَاطِمَةَ مِنْهَا شَيْئًا، فَوَجَدَتْ فَاطِمَةُ عَلَى أَبِي بَكْرٍ فِي ذَلِكَ، فَهَجَرَتْهُ، فَلَمْ تَكَلِّمْهُ حَتَّى تُوَفِّيَتْ.

”نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس کسی آدمی کو بھیجا اور نبی کریم ﷺ کے اس مال سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا، جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مدینہ اور فدک میں عنایت فرمایا تھا، اور خیبر کا جو پانچواں حصہ رہ گیا تھا۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے خود ہی ارشاد فرمایا تھا: ہم نبیوں کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں، وہ سب صدقہ ہوتا ہے۔ البتہ آل محمد ﷺ اس مال سے کھاتی رہے گی۔ اللہ کی قسم! جو صدقہ نبی کریم ﷺ چھوڑ کر گئے ہیں، جس حال میں وہ نبی کریم ﷺ کے عہد میں تھا، میں اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں کروں گا، وہ اب بھی اسی طرح رہے گا۔ اس (کی تقسیم وغیرہ) میں، میں بھی وہی طرز عمل اختیار کروں گا، جو نبی کریم ﷺ کا اپنی حیات مبارکہ میں تھا۔ الغرض سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کچھ دینے سے معذرت کر لی۔ اس پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے خفا ہو گئیں اور

ان سے ملاقات کو ترک کر دیا۔ اس کے بعد وفات تک ان سے کوئی گفتگو نہیں کی۔“

(صحیح البخاری: 4240، صحیح مسلم: 1759)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

كَوْنُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُورَثُ، ثَبَتَ بِالسُّنَّةِ الْمَقْطُوعِ بِهَا وَبِاجْمَاعِ الصَّحَابَةِ، وَكُلُّ مَنْهُمَا دَلِيلٌ قَطْعِيٌّ، فَلَا يُعَارِضُ ذَلِكَ بِمَا يُظَنُّ أَنَّهُ عُمُومٌ، وَإِنْ كَانَ عُمُومًا فَهُوَ مَخْصُوصٌ، لِأَنَّ ذَلِكَ لَوْ كَانَ دَلِيلًا لَمَا كَانَ إِلَّا ظَنًّا، فَلَا يُعَارِضُ الْقَطْعِيَّ، إِذَا الظَّنِّيُّ لَا يُعَارِضُ الْقَطْعِيَّ، وَذَلِكَ أَنَّ هَذَا الْخَبَرَ رَوَاهُ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ فِي أَوْقَاتٍ وَمَجَالِسَ، وَلَيْسَ فِيهِمْ مَنْ يُنْكِرُهُ، بَلْ كُلُّهُمْ تَلَقَّاهُ بِالْقَبُولِ وَالتَّصْدِيقِ، وَلِهَذَا لَمْ يُصَرَّ أَحَدٌ مِنَ أَزْوَاجِهِ عَلَى طَلَبِ الْمِيرَاثِ، وَلَا أَصَرَ الْعَمُّ عَلَى طَلَبِ الْمِيرَاثِ، بَلْ مَنْ طَلَبَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَأُخْبِرَ بِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رَجَعَ عَنِ طَلَبِهِ، وَاسْتَمَرَ الْأَمْرُ عَلَى ذَلِكَ عَلَى عَهْدِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ إِلَى عَلِيٍّ، فَلَمْ يَغْيَرْ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ وَقَسَمَ لَهُ تَرْكَةً.

”کسی کا بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث نہ بن سکتا صحیح و قطعی سنت اور اجماع صحابہ سے

ثابت ہے اور یہ دونوں قطعی دلیلیں ہیں، لہذا اپنے ظن پر مبنی ’عموم‘ سے ان دلائل کا معارضہ کرنا درست نہیں۔ اگر عمومی مفہوم کو درست مان لیا جائے، تو اس میں تخصیص سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ بہر صورت یہ دلیل ظنی ہوگی جو کہ قطعی کے معارض نہیں ہو سکتی، کیونکہ ظنی دلیل قطعی کی معارض نہیں ہو سکتی۔ ہماری دلیل کے قطعی ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیاء کی وراثت کے تقسیم نہ ہونے والی حدیث کو مختلف اوقات اور مجالس میں کئی صحابہ کرام نے

روایت کیا، مگر کسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ اسے قبول کیا اور سچ جانا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی نے میراثِ نبوی کے مطالبہ پر اصرار نہیں کیا، نہ ہی آپ ﷺ کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے اس مطالبہ پر اصرار کیا۔ اگر کسی نے مطالبہ کیا بھی اور اسے نبی کریم ﷺ کا فرمان سنایا گیا تو وہ مطالبہ سے فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت تک تمام خلفائے راشدین کے عہد میں یہی حالت برقرار رہی، کسی نے نہ کوئی تبدیلی کی اور نہ ہی آپ ﷺ کا ترکہ تقسیم کیا۔“

(منہاج السنة في نقض كلام الشيعة والقدرية: 220/4)

یہاں ہم حافظ ابن الجوزی رحمہ اللہ کا ذکر کردہ بے سند قصہ بھی بیان کیے دیتے ہیں کہ ابو العباس، عبد اللہ بن محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس ہاشمی، المعروف بہ السفاح کے بارے میں ہے:

إِنَّهُ خَطَبَ يَوْمًا، فَقَامَ رَجُلٌ مِّنْ آلِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، فَقَالَ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! أَمَدَّنِي عَلَى مَنْ ظَلَمَنِي، قَالَ: وَمَنْ ظَلَمَكَ؟ قَالَ: أَنَا مِنْ أَوْلَادِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، وَالَّذِي ظَلَمَنِي أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، حِينَ أَخَذَ فَدَكَ مِنْ فَاطِمَةَ، قَالَ: وَدَامَ عَلَى ظُلْمِكُمْ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: وَمَنْ قَامَ بَعْدَهُ؟ قَالَ: عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: وَدَامَ عَلَى ظُلْمِكُمْ؟ قَالَ: نَعَمْ، وَمَنْ قَامَ بَعْدَهُ؟ قَالَ: عُثْمَانُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: وَدَامَ عَلَى ظُلْمِكُمْ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: وَمَنْ قَامَ بَعْدَهُ؟ فَجَعَلَ يَلْتَفِتُ كَذَا وَكَذَا، يَنْظُرُ مَكَانًا يَهْرُبُ إِلَيْهِ.

”ایک دن اس نے خطبہ دیا۔ دورانِ خطبہ آلِ علی رضی اللہ عنہ سے تعلق رکھنے والا ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: اے امیر المومنین! ظالم کے خلاف میری مدد کیجئے! خلیفہ نے پوچھا: تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟ اس نے کہا: میں آلِ علی میں سے ہوں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدہ

فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک کی زمین وراثت میں نہ دے کر مجھ پر ظلم کیا۔ خلیفہ نے پوچھا: سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس ظلم پر ڈٹے رہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ خلیفہ نے پوچھا: ان کے بعد کون (ظالم) تحتِ خلافت پر متمکن ہوا؟ اس نے کہا: عمر رضی اللہ عنہ، خلیفہ نے دریافت کیا: انہوں نے بھی یہ ظلم روا رکھا؟ اس نے کہا: ہاں! ان کے بعد کون خلیفہ ہوا؟ اس نے کہا: عثمان رضی اللہ عنہ۔ خلیفہ نے پوچھا: اور انہوں نے بھی یہ ظلم روا رکھا؟ اس نے کہا: ہاں! خلیفہ نے پوچھا: ان کے بعد کون خلیفہ بنا؟ اب وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا اور بھاگنے کی تاک میں لگ گیا۔“

(تلبیسِ إبلیس، ص: 153)

## اہل علم کی طرف سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے غصے کی توجیہات

شارح صحیح مسلم، علامہ، ابو العباس، قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ثُمَّ إِنَّهَا لَمْ تَلْتَقِ بِأَبِي بَكْرٍ لِّشُغْلِهَا بِمُصِيبَتِهَا بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلِمَا لَزِمَتْهَا بَيْتُهَا، فَعَبَّرَ الرَّأَوِيُّ عَنْ ذَلِكَ بِالْهَجْرَانِ.

”سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، نبی کریم ﷺ کی جدائی کی پریشانی، اپنی خانگی مشغولیت اور خانہ نشینی کی وجہ سے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے زیادہ دنوں تک ملاقات نہیں کر سکی تھیں، اسی چیز کو راوی نے ہجران (قطع تعلق) سے تعبیر کر دیا ہے۔“

(المفہم لما أشكل من تلخیص کتاب مسلم: 3/568-569)

شارح صحیح مسلم، حافظ، ابوزکریا، یحییٰ بن شرف، نووی رحمہ اللہ (631-676ھ) فرماتے ہیں:

وَأَمَّا مَا ذُكِرَ مِنْ هِجْرَانِ فَاطِمَةَ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، فَمَعْنَاهُ انْقِبَاضُهَا عَنْ لِقَائِهِ، وَلَيْسَ هَذَا مِنَ الْهِجْرَانِ الْمُحَرَّمِ الَّذِي هُوَ تَرْكُ السَّلَامِ وَالْإِعْرَاضِ عِنْدَ اللَّقَاءِ، قَوْلُهُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ: فَلَمْ تُكَلِّمَهُ، يَعْنِي فِي هَذَا

الْأَمْرِ، أَوْ لَا نَقْبَاضِهَا لَمْ تَطْلُبْ مِنْهُ حَاجَةً، وَلَا اضْطَرَّتْ إِلَى لِقَائِهِ فَتَكَلَّمَهُ، وَلَمْ يُنْقَلْ قَطُّ أَنَّهُمَا التَّقِيَا، فَلَمْ تُسَلِّمْ عَلَيْهِ وَلَا كَلِمَتَهُ.

”سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی قطع تعلقی کا جو ذکر ملتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ملاقات سے کھنچی کھنچی رہنے لگیں اور یہ انداز حرام کی گئی قطع تعلقی میں شامل نہیں ہے، جس میں سلام و کلام بند ہو جاتا ہے اور ملاقات کے وقت ایک دوسرے سے اعراض کیا جاتا ہے۔ حدیث کے الفاظ فَلَمْ تُكَلِّمَهُ کا مطلب یہ ہے کہ پھر وراثت کے سلسلے میں ان سے گفتگو نہ کی، یا دل میں کچھ خلش ہونے کے ناطے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اپنی کسی ضرورت کا مطالبہ نہ کیا اور نہ ہی ملاقات کرنے کی ضرورت محسوس کی تا کہ گفتگو کا کوئی موقع نکلے۔ کہیں بھی اس طرح کی کوئی روایت نہیں ملتی کہ دونوں کی ملاقات ہوئی ہو اور انہوں نے ایک دوسرے سے سلام و کلام نہ کیا ہو۔“

(شرح صحیح مسلم: 73/12)

شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اس رویے کی یہ توجیہ فرماتے ہیں:

وَأَمَّا سَبَبُ غَضَبِهَا مَعَ احْتِجَاجِ أَبِي بَكْرٍ بِالْحَدِيثِ الْمَذْكُورِ، فَلِاعْتِقَادِهَا تَأْوِيلَ الْحَدِيثِ عَلَى خِلَافِ مَا تَمَسَّكَ بِهِ أَبُو بَكْرٍ، وَكَأَنَّهَا اعْتَقَدَتْ تَخْصِيصَ الْعُمُومِ فِي قَوْلِهِ: «لَا نُورَثُ»، وَرَأَتْ أَنَّ مَنَافِعَ مَا خَلَفَهُ مِنْ أَرْضٍ وَعَقَارٍ، لَا يَمْتَنِعُ أَنْ تُورَثَ عَنْهُ، وَتَمَسَّكَ أَبُو بَكْرٍ بِالْعُمُومِ، وَاخْتَلَفَا فِي أَمْرِ مُحْتَمَلٍ لِلتَّأْوِيلِ، فَلَمَّا صَمَّمَ عَلَى ذَلِكَ انْقَطَعَتْ عَنِ الْاجْتِمَاعِ بِهِ لِذَلِكَ.



”سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی دلیل پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اظہارِ غصہ کا سبب یہ تھا کہ ان کے خیال میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جس دلیل پر کاربند تھے، اس کا مقصود اس سے مختلف ہے، «لَا نُورُثُ» والے عمومی حکم میں وہ سمجھتی تھیں کہ اس میں سے کچھ چیزیں خاص ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ نبی کریم ﷺ جو زمین وغیرہ چھوڑ کر گئے ہیں، یہ حدیث آپ ﷺ کے وارثوں کو ایسی جائیداد کا وارث بننے سے نہیں روکتی۔ مگر سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حدیث کے عموم پر قائم رہے۔ بہر حال ان دونوں حکموں میں تاویل کا احتمال تو تھا، چنانچہ جب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے موقف پر ڈٹ گئے تو اس پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ان سے ملاقات ترک کر دی۔“

(فتح الباری شرح صحیح البخاری: 202/6)

قاضی، ابوفضل، عیاض بن موسیٰ، سہتی رحمہ اللہ (476-544ھ) فرماتے ہیں:

وَفِي تَرْكِ فَاطِمَةَ مُنَازَعَةَ أَبِي بَكْرٍ بَعْدَ احْتِجَاجِهِ عَلَيْهَا بِالْحَدِيثِ، التَّسْلِيمِ لِلْإِجْمَاعِ عَلَى قَضِيَّةٍ، وَأَنَّهَا لَمَّا بَلَغَهَا الْحَدِيثُ وَبَيَّنَ لَهَا التَّوِيلَ تَرَكَتْ رَأْيَهَا، ثُمَّ لَمْ يَكُنْ مَنَّهَا وَلَا مِنْ دُرَيْتِهَا بَعْدَ ذَلِكَ طَلَبَ مِيرَاثٍ، ثُمَّ وَلِيَ عَلَيَّ الْخِلَافَةَ، فَلَمْ يَعْدِلْ بِهَا عَمَّا فَعَلَهُ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا .

”جب سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے موقف کا حدیث سے جواب دیا تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں جمہور کے اجماع کو تسلیم کر لیا تھا اور حدیثِ نبوی کا علم ہو جانے، نیز سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیان کیے گئے مفہوم کو ملاحظہ کر لینے کے بعد اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اور ان کی اولاد میں سے کسی نے کبھی میراث کا مطالبہ نہیں کیا، حتیٰ کہ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ خود خلیفہ بنے تو انہوں نے بھی اس سلسلہ میں سیدنا ابو بکر اور سیدنا



عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے موقف کے خلاف کوئی طرزِ عمل اختیار نہیں کیا۔“

(شرح صحیح مسلم للنووي: 73/12)

شارح صحیح مسلم، علامہ، ابو العباس، قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فَأَمَّا طَلَبُ فَاطِمَةَ مِيرَاثَهَا مِنْ أَبِيهَا مِنْ أَبِي بَكْرٍ، فَكَانَ ذَلِكَ قَبْلَ أَنْ تَسْمَعَ فَاطِمَةُ الْحَدِيثَ الَّذِي دَلَّ عَلَى خُصُوصِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذَلِكَ، وَكَانَتْ مُتَمَسِّكَةً بِمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنْ ذَلِكَ، فَلَمَّا أَخْبَرَهَا أَبُو بَكْرٍ بِالْحَدِيثِ تَوَقَّفَتْ عَنْ ذَلِكَ، وَلَمْ تَعُدْ عَلَيْهِ بِطَلَبٍ.

”رہا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اپنے والد ﷺ کی میراث کا مطالبہ تو یہ اس سے پہلے کی بات ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی اس حدیث کو سنا جو وراثت کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کو خاص کرتی ہے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کتاب اللہ کے عموم کو دلیل بنا رہی تھیں۔ جب سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو حدیث بیان کی، تو انہوں نے اس معاملہ میں خاموشی اختیار کر لی، دوبارہ اس کا مطالبہ نہ کیا۔“

(المفہم لما أشکل من تلخیص کتاب مسلم: 563/3)

بعض لوگ اس مسئلہ کو خواہ مخواہ اچھالتے ہوئے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف بطور ثبوت پیش کرتے ہیں، حالانکہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے واضح فرمانِ رسول پیش کیا اور کہا: یہ اہل بیت کا حق ہے کہ ان پر خرچ کیا جائے اور وہ ان پر خرچ کرتے بھی رہے۔ یہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اجتہادی خطا تھی کہ وہ میراث سمجھ کر مطالبہ فرمانے لگیں۔ اس بنیاد پر اہل بیت عظام میں سے کسی نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر اعتراض نہیں کیا۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا تھا:

«فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي، فَمَنْ أَغْضَبَهَا أَغْضَبَنِي».



”فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے، جس نے اسے غصہ دلایا، اس نے مجھے غضبناک کیا۔“

(صحیح البخاری: 3714)

حالانکہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی یہ ناراضی اس سطح کی نہیں تھی کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس حدیث کا مصداق ٹھہرایا جائے۔ انسان ہونے کے ناطے افہام و تفہیم میں غلطی لگ جاتی ہے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دلیل سے قائل کرنا چاہا، مگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بات نہ سمجھ سکیں۔ اس پر تھوڑا سا محسوس کر لیا۔ وہ خیال کرتی تھیں کہ یہ مال میرا موردی حق ہے، جبکہ ایسا نہیں تھا۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ذرا اس حدیث کا مکمل مطالعہ فرمائیں:

✽ صحابی رسول، سیدنا مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

إِنَّ عَلِيًّا خَطَبَ بِنْتَ أَبِي جَهْلٍ، فَسَمِعَتْ بِذَلِكَ فَاطِمَةُ، فَأَتَتْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ: يَزْعُمُ قَوْمُكَ أَنَّكَ لَا تَغْضَبُ لِبَنَاتِكَ، وَهَذَا عَلِيٌّ نَاكِحٌ بِنْتَ أَبِي جَهْلٍ، فَقَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَمِعَتْهُ حِينَ تَشْهَدُ، يَقُولُ: «أَمَّا بَعْدُ! أَنْكَحْتُ أَبَا الْعَاصِ بْنِ الرَّبِيعِ، فَحَدَّثَنِي وَصَدَّقَنِي، وَإِنَّ فَاطِمَةَ بَضْعَةٌ مِنِّي، وَإِنِّي أَكْرَهُ أَنْ يَسُوْئَهَا، وَاللَّهِ! لَا تَجْتَمِعُ بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِنْتُ عَدُوِّ اللَّهِ، عِنْدَ رَجُلٍ وَاحِدٍ»، فَتَرَكَ عَلِيٌّ الْخُطْبَةَ.

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی لڑکی کو پیغام نکاح دیا۔ اس کی اطلاع جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہوئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور عرض کیا: آپ ﷺ کی قوم کا خیال ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی بیٹیوں کی خاطر (جب انہیں کوئی تکلیف دے تو) کسی پر غصہ نہیں آتا۔ اب دیکھئے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر نبی

کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو یوں خطاب فرمایا: حمد و ثنا کے بعد، میں نے ابو العاص بن ربح سے (اپنی بیٹی زینب) کی شادی کی تو انہوں نے جو بات بھی کہی، اس میں سچے ثابت ہوئے۔ بلاشبہ فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے، مجھے یہ پسند نہیں کہ وہ (علی رضی اللہ عنہ) اسے تکلیف دے۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی ایک شخص کے پاس جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔“

(صحیح البخاری: 3729، صحیح مسلم: 2449)

شیخ الاسلام، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

فَسَبَبُ الْحَدِيثِ خُطْبَةُ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ لِابْنَةِ أَبِي جَهْلٍ، وَالسَّبَبُ دَاخِلٌ فِي اللَّفْظِ قَطْعًا، إِذِ اللَّفْظُ الْوَارِدُ عَلَى سَبَبٍ لَا يَجُوزُ إِخْرَاجُ سَبَبِهِ مِنْهُ، بَلِ السَّبَبُ يَجِبُ دُخُولُهُ بِالِاتِّفَاقِ، وَقَدْ قَالَ فِي الْحَدِيثِ: «يُرِيْبُنِي مَا رَابَهَا، وَيُوْذِنُنِي مَا آذَاهَا»، وَمَعْلُومٌ قَطْعًا أَنَّ خُطْبَةَ ابْنَةِ أَبِي جَهْلٍ عَلَيْهَا رَابَهَا وَآذَاهَا، وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَابَهُ ذَلِكَ وَآذَاهُ، فَإِنْ كَانَ هَذَا وَعِيدًا لَّا حَقًّا بِفَاعِلِهِ، لَزِمَ أَنْ يَلْحَقَ هَذَا الْوَعِيدُ عَلِيًّا بْنِ أَبِي طَالِبٍ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ وَعِيدًا لَّا حَقًّا بِفَاعِلِهِ، كَانَ أَبُو بَكْرٍ أَبْعَدَ عَنِ الْوَعِيدِ مِنْ عَلِيٍّ.

”اس فرمان نبوی کا سبب خود اسی حدیث میں موجود ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ابو جہل کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لانا چاہتے تھے۔ حدیث میں بیان کردہ سبب کو اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا، بلکہ حدیث کا سبب ورود کے ساتھ تعلق قائم رکھنا باتفاق محدثین کرام واجب ہے۔ اس حدیث (کی ایک روایت) کے الفاظ یہ ہیں: جو چیز فاطمہ کو پریشان کرتی ہے، وہ مجھے بھی پریشان کرتی ہے اور جس بات سے فاطمہ کو تکلیف پہنچے وہ میرے لئے بھی رنج و الم کی



موجب ہے۔ یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور نبی کریم ﷺ کو یہ تکلیف محض اس لئے پہنچی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اگر یہ وعید (ایسی) ایذا دینے والے کو لاحق ہو سکتی ہے، تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اس وعید کی لپیٹ میں آنا ضروری ہے اور اگر اس کا احتمال نہیں ہے، تو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نسبت اس وعید سے زیادہ دُور ہیں۔“ (منہاج السنّة: 251/4)

یعنی اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پریشان کرنے کی بنا پر سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس حدیث میں بیان کردہ وعید کا مصداق ٹھہرتے ہیں، تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ جن کے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پریشان کرنے پر نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا، وہ اس وعید کے زیادہ مستحق ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی اس وعید کا مستحق نہیں، بلکہ یہ رافضیوں کی ہٹ دھرمی ہے کہ وہ فدک والے مسئلہ میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے کبار صحابہ کرام کو ملامت کرتے ہیں۔

حافظ، ابوفداء، اسماعیل بن عمر، ابن کثیر رحمہم اللہ (700-774ھ) کیا خوب فرماتے ہیں:

وَهَذَا الْهَجْرَانُ، وَالْحَالَةُ هَذِهِ، فَتَحَ عَلَى فِرْقَةِ الرَّافِضَةِ شَرًّا عَرِيضًا، وَجَهْلًا طَوِيلًا، وَأَدْخَلُوا أَنْفُسَهُمْ بِسَبَبِهِ فِيمَا لَا يَعْنِيهِمْ، وَلَوْ نَفَهَمُوا الْأُمُورَ عَلَى مَا هِيَ عَلَيْهِ لَيَعْرِفُوا لِلصَّدِيقِ فَضْلَهُ، وَقَبِلُوا مِنْهُ عُذْرَهُ الَّذِي يَجِبُ عَلَى كُلِّ أَحَدٍ قَبُولُهُ، وَلَكِنَّهُمْ طَائِفَةٌ مَخْذُولَةٌ، وَفِرْقَةٌ مَرْدُودَةٌ، يَتَمَسَّكُونَ بِالْمُتَشَابِهِ، وَيَتْرُكُونَ الْأُمُورَ الْمُحْكَمَةَ الْمُقَدَّرَةَ عِنْدَ أُمَمَةِ الْإِسْلَامِ، مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ فَمَنْ بَعْدَهُمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْمُعْتَبَرِينَ فِي سَائِرِ الْأَعْصَارِ وَالْأَمْصَارِ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَأَرْضَاهُمْ أَجْمَعِينَ .

”اس ناراضی پر روافض نے بہت بڑا شر پکایا، بڑی نادانی کا ثبوت دیا ہے اور لایعنی بحثوں میں الجھ گئے۔ اگر یہ لوگ معاملات کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا ضرور اعتراف کرتے اور آپ رضی اللہ عنہ کی بجا دلیل و معذرت کو لازمی طور پر قبول کرتے، لیکن کیا کیا جائے، یہ ایسا رسوا گروہ اور ذلیل فرقہ ہے، جو متشابہ اور لوچ لچر دلائل سے استدلال کرتا ہے، جبکہ صحابہ کرام، تابعین عظام، ہر دور کے علمائے اسلام اور تمام شہروں کے معتبر علمائے دین کے یہاں جو باتیں مسلم ہوتی ہیں، ان کو چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام ہستیوں سے راضی ہو۔“ (البدایۃ والنہایۃ: 308/5)

اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے درج ذیل روایات بھی ملاحظہ فرمائیں:

✽ ام المومنین، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

أَرْسَلَ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُثْمَانَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ، يَسْأَلْنَهُ ثَمَنَهُنَّ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكُنْتُ أَنَا أَرُدُّهُنَّ، فَقُلْتُ لَهُنَّ: أَلَا تَتَّقِينَ اللَّهَ؟ أَلَمْ تَعْلَمْنَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُولُ: «لَا نُورَثُ، مَا تَرَكَنَا صَدَقَةٌ، [يُرِيدُ بِذَلِكَ نَفْسَهُ] إِنَّمَا يَأْكُلُ آلُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا الْمَالِ»، فَانْتَهَى أَزْوَاجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى مَا أَخْبَرْتُهُنَّ، قَالَ: فَكَانَتْ هَذِهِ الصَّدَقَةُ بِيَدِ عَلِيٍّ، مَنَعَهَا عَلِيٌّ عَبَّاسًا فَعَلَبَهُ عَلَيْهَا، ثُمَّ كَانَ بِيَدِ حَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ، ثُمَّ بِيَدِ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ، ثُمَّ بِيَدِ عَلِيٍّ بْنِ حُسَيْنٍ، وَحَسَنِ بْنِ حَسَنِ، كِلَاهُمَا كَانَ يَتَدَاوَلَانِيهَا، ثُمَّ بِيَدِ زَيْدِ بْنِ حَسَنِ، وَهِيَ صَدَقَةُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَقًّا.



”نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو جو مال بطورِ فہ دیا تھا، اس میں سے ان کے حصے دیئے جائیں، لیکن میں نے انہیں روکا اور ان سے کہا: تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتیں، کیا نبی کریم ﷺ نے خود نہیں فرمایا تھا: ہمارا ترکہ تقسیم نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے؟ [نبی کریم ﷺ کا اشارہ اس فرمان میں خود اپنی ذات کی طرف تھا] البتہ آلِ محمد ﷺ کو اس جائیداد میں سے پوری زندگی (ان کی ضروریات کے لئے) ملتا رہے گا۔ جب میں نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو یہ حدیث سنائی تو انہوں نے بھی اپنا خیال بدل لیا۔ راوی حدیث عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یہی وہ صدقہ ہے، جس کا انتظام سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں بھی رہا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو اس کے احکام میں شریک نہیں کیا تھا، بلکہ خود اس کا انتظام کیا کرتے تھے۔ (اسے نبی کریم ﷺ، سیدنا ابو بکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے طرزِ عمل کے مطابق خرچ کرتے تھے)۔ اس کے بعد یہ صدقہ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے انتظام میں آ گیا، پھر سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے انتظام میں آ گیا، پھر امام علی بن حسین رضی اللہ عنہما اور امام حسن بن حسن رضی اللہ عنہما کے انتظام میں آ گیا۔ وہ دونوں اس کو استعمال کرتے تھے۔ پھر یہ مال امام زید بن حسن رضی اللہ عنہ کے انتظام میں آ گیا۔ بلاشبہ یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے صدقہ ہو گیا تھا۔“ (صحیح البخاری: 4034)

شارح صحیح بخاری، علامہ، علی بن خلف، ابن بطلال رضی اللہ عنہ (م: 449ھ) فرماتے ہیں:

وَقَدْ رَوَى الطَّبْرِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عُلَيَّةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ، قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي جَعْفَرٍ: أَرَأَيْتَ عَلِيًّا حِينَ وَلِيَ الْعِرَاقَ، وَمَا كَانَ بِيَدِهِ مِنْ سُلْطَانِهِ، كَيْفَ صَنَعَ فِي سَهْمِ ذِي الْقُرْبَى؟ قَالَ: سَلَكَ بِهِ، وَاللَّهِ! طَرِيقَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ.

”ابو اسحاق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابوطالب، ابو جعفر باقر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ عراق کے حکمران بنے اور جب حکومت کی باگ ڈوران کے ہاتھ میں آئی، تو انہوں نے اہل بیت کے مابین کس طرح حصوں کو تقسیم کیا؟ امام ابو جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! وہ سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما ہی کے نقش قدم پر چلے۔“

(شرح صحیح البخاری: 265/5، وسندہ صحیح)

شارح صحیح مسلم، علامہ، ابو العباس، قرطبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إِنَّ عَلِيًّا لَّمَّا وَلِيَ الْخِلَافَةَ لَمْ يُغَيِّرْهَا عَمَّا عُمِلَ فِيهَا فِي عَهْدِ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ، وَلَمْ يَتَعَرَّضْ لِتَمَلُّكِهَا، وَلَا لِقِسْمَةِ شَيْءٍ مِّنْهَا، بَلْ كَانَ يَصْرِفُهَا فِي الْوُجُوهِ الَّتِي كَانَ مِنْ قَبْلَهُ يَصْرِفُهَا فِيهَا، ثُمَّ كَانَتْ بِيَدِ حَسَنِ ابْنِ عَلِيٍّ، ثُمَّ بِيَدِ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ، ثُمَّ بِيَدِ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ، ثُمَّ بِيَدِ الْحُسَيْنِ بْنِ الْحَسَنِ، ثُمَّ بِيَدِ زَيْدِ بْنِ الْحَسَنِ، ثُمَّ بِيَدِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْحَسَنِ، ثُمَّ تَوَلَّاهَا بَنُو الْعَبَّاسِ عَلَى مَا ذَكَرَهُ أَبُو بَكْرٍ الْبُرْقَانِيُّ فِي صَحِيحِهِ، وَهُوَ لَا كِبَرَاءَ أَهْلِ الْبَيْتِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ، وَهُمْ مُعْتَمِدُ الشَّيْعَةِ وَأَثَمَتُهُمْ، لَمْ يَرَوْا عَنْ وَاحِدٍ مِنْهُمْ أَنَّهُ تَمَلَّكَهَا، وَلَا وَرَثَتَهَا، وَلَا وَرَثَتِ عَنْهُ، فَلَوْ كَانَ مَا يَقُولُهُ الشَّيْعَةُ حَقًّا لَأَخَذَهَا عَلِيٌّ، أَوْ أَحَدٌ مِّنْ أَهْلِ بَيْتِهِ، لَمَّا ظَفِرُوا بِهَا، وَلَمْ، فَلَا.

”جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت سنبھالا تو سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہم کے عہدِ خلافت میں جاری کسی نظام میں تبدیلی نہیں کی، اس کی ملکیت میں کسی قسم کا کوئی

تعرض نہیں کیا، نہ ہی اس کی کوئی جائیداد تقسیم کی، بلکہ جو املاک خلافت پہلے سے چلے آ رہے تھے، انہی میں خرچ کیا۔ اس کے بعد خلافت سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں میں منتقل ہوئی، پھر ترتیب وار حسین بن علی رضی اللہ عنہ، علی بن حسین رضی اللہ عنہ، حسین بن حسن رضی اللہ عنہ، زید بن حسن رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن حسن رضی اللہ عنہ اور آل عباس کے ہاتھ میں رہی، جیسا کہ ابو بکر برقانی رضی اللہ عنہ نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ یہ سب حکمران اہل بیت کے بزرگ شرفا ہیں، یہ لوگ شیعہ اور ان کے ائمہ کرام کے نزدیک سب سے زیادہ معتمد اور قابلِ قدر ہیں، لیکن ان میں کسی سے کوئی ایک بھی روایت نہیں ملتی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ترکہ کو اپنی وراثت اور ملکیت سمجھا ہو، لہذا اگر شیعہ کا دعویٰ سچ ہے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ یا آپ رضی اللہ عنہ کے اہل بیت میں سے کسی کو اپنا حق ضرور لینا چاہئے تھا، کیونکہ اب حکومت انہیں کے ہاتھوں میں تھی، ورنہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں۔“ (المفہم لما أشکل من تلخیص کتاب مسلم : 564/3)

سیدنا مالک بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أَرْسَلَ إِلَيَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، فَجِئْتُهُ حِينَ تَعَالَى النَّهَارُ، قَالَ : فَوَجَدْتُهُ فِي بَيْتِهِ جَالِسًا عَلَى سَرِيرٍ مُفَضِّيًا إِلَى رُمَالِهِ، مُتَكِنًا عَلَى وِسَادَةٍ مِّنْ أَدَمٍ، فَقَالَ لِي : يَا مَالُ ! إِنَّهُ قَدْ دَفَّ أَهْلُ أَبْيَاتٍ مِّنْ قَوْمِكَ، وَقَدْ أَمَرْتُ فِيهِمْ بِرَضَخٍ، فَخُذْهُ فَاقْسِمْهُ بَيْنَهُمْ، قَالَ : قُلْتُ : لَوْ أَمَرْتَ بِهَذَا غَيْرِي ! قَالَ : خُذْهُ يَا مَالُ ! قَالَ : فَجَاءَ يَرْفَا، فَقَالَ : هَلْ لَكَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ فِي عُثْمَانَ، وَعَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ، وَالزُّبَيْرِ، وَسَعْدٍ؟ فَقَالَ عُمَرُ : نَعَمْ، فَأَذِنَ لَهُمْ فَدَخَلُوا، ثُمَّ جَاءَ، فَقَالَ : هَلْ لَكَ فِي عَبَّاسٍ، وَعَلِيٍّ؟ قَالَ : نَعَمْ، فَأَذِنَ لَهُمَا، فَقَالَ عَبَّاسٌ : يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ! اقْضِ بَيْنِي وَبَيْنَ هَذَا الْكَاذِبِ الْآثِمِ

الْغَادِرِ الْخَائِنِ، فَقَالَ الْقَوْمُ : أَجَلٌ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ! فَاقْضِ بَيْنَهُمْ  
وَأَرَحِهِمْ، فَقَالَ مَالِكُ بْنُ أَوْسٍ : يُخَيَّلُ إِلَيَّ أَنَّهُمْ قَدْ كَانُوا قَدَّمُوهُمْ لَذَلِكَ،  
فَقَالَ عُمَرُ : اتَّبِدَا، أَنَشِدُكُم بِاللَّهِ الَّذِي بِإِذْنِهِ تَقُومُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ،  
أَتَعْلَمُونَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : «لَا نُورُثُ، مَا تَرَكْنَا  
صَدَقَةً»، قَالُوا : نَعَمْ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى الْعَبَّاسِ، وَعَلَيٍّ، فَقَالَ : أَنَشِدُكُم بِاللَّهِ  
الَّذِي بِإِذْنِهِ تَقُومُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ، أَتَعْلَمَانِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ قَالَ : «لَا نُورُثُ، مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةً»، قَالَا : نَعَمْ، فَقَالَ عُمَرُ : إِنَّ اللَّهَ  
جَلَّ وَعَزَّ كَانَ خَصَّ رَسُولَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخَاصَّةٍ، لَمْ يُخَصِّصْ  
بِهَا أَحَدًا غَيْرَهُ، قَالَ : ﴿مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ  
وَلِلرَّسُولِ﴾ (الحشر 59 : 7)، مَا أَذْرِي هَلْ قَرَأَ الْآيَةَ الَّتِي قَبْلَهَا أَمْ لَا، قَالَ :  
فَقَسَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَكُمْ أَمْوَالَ بَنِي النَّضِيرِ، فَوَاللَّهِ !  
مَا اسْتَأْثَرَ عَلَيْكُمْ، وَلَا أَخَذَهَا دُونَكُمْ، حَتَّى بَقِيَ هَذَا الْمَالُ، فَكَانَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْخُذُ مِنْهُ نَفَقَةَ سَنَةٍ، ثُمَّ يَجْعَلُ مَا بَقِيَ أُسْوَةَ  
الْمَالِ، ثُمَّ قَالَ : أَنَشِدُكُم بِاللَّهِ الَّذِي بِإِذْنِهِ تَقُومُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ، أَتَعْلَمُونَ  
ذَلِكَ ؟ قَالُوا : نَعَمْ، ثُمَّ نَشَدَ عَبَّاسًا، وَعَلِيًّا، بِمِثْلِ مَا نَشَدَ بِهِ الْقَوْمَ، أَتَعْلَمَانِ  
ذَلِكَ ؟ قَالَا : نَعَمْ، قَالَ : فَلَمَّا تُوَفِّي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ  
أَبُو بَكْرٍ : أَنَا وَلِيُّ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَجِئْتُمَا تَطْلُبُ مِيرَاثَكَ





مِنْ ابْنِ أَخِيكَ، وَيَطْلُبُ هَذَا مِيرَاثَ امْرَأَتِهِ مِنْ أَبِيهَا، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : «مَا نُورِثُ، مَا تَرَكَنَاهُ صَدَقَةً»، فَرَأَيْتُمَاهُ كَاذِبًا آثِمًا غَادِرًا خَائِنًا، وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُ لَصَادِقٌ بَارٌّ رَاشِدٌ تَابِعٌ لِلْحَقِّ، ثُمَّ تُوَفِّيَ أَبُو بَكْرٍ وَأَنَا وَلِيُّ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَوَلِيُّ أَبِي بَكْرٍ، فَرَأَيْتُمَانِي كَاذِبًا آثِمًا غَادِرًا خَائِنًا، وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنِّي لَصَادِقٌ بَارٌّ رَاشِدٌ تَابِعٌ لِلْحَقِّ، فَوَلَيْتُهَا، ثُمَّ جِئْتَنِي أَنْتَ وَهَذَا، وَأَنْتُمَا جَمِيعٌ، وَأَمْرُكُمَا وَاحِدٌ، فَقُلْتُمَا : ادْفَعْهَا إِلَيْنَا، فَقُلْتُ : إِنْ شِئْتُمْ دَفَعْتُهَا إِلَيْكُمَا عَلَى أَنْ عَلَيْكُمَا عَهْدُ اللَّهِ أَنْ تَعْمَلَا فِيهَا بِالَّذِي كَانَ يَعْمَلُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَخَذْتُمَاهَا بِذَلِكَ، قَالَ : أَكْذَلِكَ ؟ قَالَا : نَعَمْ، قَالَ : ثُمَّ جِئْتُمَانِي لِأَقْضِيَ بَيْنَكُمَا، وَلَا وَاللَّهِ ! لَا أَقْضِي بَيْنَكُمَا بِغَيْرِ ذَلِكَ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ، فَإِنْ عَجَزْتُمَا عَنْهَا فَرُدَّاهَا إِلَيَّ .

”دن چڑھے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مجھے بلانے کے لئے قاصد بھیجا۔ میں دن چڑھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ کھجور کی چھال سے تیار کردہ ایک چارپائی پر چمڑے کے تکیے پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: تمہارے خاندان کے کچھ افراد آئے ہیں، میں نے ان کے لئے کچھ مال رکھا ہے، لے جاؤ اور ان سب میں تقسیم کر دو۔ میں نے عرض کیا: یہ ذمہ داری کسی اور کو دے دیجئے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مالک! اسے پکڑو۔ اسی دوران ان کا دربان یرفا آیا اور عرض کیا: سیدنا عثمان، سیدنا عبدالرحمن بن عوف، سیدنا زبیر اور سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

نے اجازت دے دی۔ سب تشریف لائے۔ ریفہ دوبارہ آیا اور عرض کیا: سیدنا علی اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہما حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں بھی اجازت دی۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المومنین! میرے اور اس جھوٹے، خائن، گناہگار اور دھوکے باز کے درمیان فیصلہ کر دیجئے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ آنے والوں نے بھی عرض کیا کہ آپ ان کا فیصلہ فرمادیں تاکہ دونوں سکھ کا سانس لیں۔ مالک کہتے ہیں کہ میرے خیال میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ کو انہی نے پہلے بھیجا تھا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ذرا نرمی اختیار کرو، پھر فرمایا: میں تمہیں اس ذات کی قسم دے کر سوال کرتا ہوں، جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے: ہماری (انبیاء کی) وراثت نہیں ہوتی، جو ہم چھوڑ جائیں وہ سب صدقہ ہوتا ہے؟ سب نے کہا: ہاں! رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا علی اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میں آپ دونوں کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح فرمایا تھا؟ ان دونوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (میں تمہیں اس مالِ فے کے معاملے کی تفصیل بتاتا ہوں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو کچھ معاملات میں ایسی خصوصیت عطا فرمائی ہے، جو کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ﴾ (الحشر 59 : 7) (اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دیہات والوں سے جو مال دلویا ہے، تو وہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے)۔ [مالک کہتے ہیں کہ اس سے پہلی آیت بھی آپ نے تلاوت کی تھی یا نہیں، مجھے صحیح یاد نہیں۔] آپ ﷺ نے بنو نضیر کے مال تم میں تقسیم فرمادئے۔ آپ ﷺ نے کوئی مال اپنے لیے خاص نہیں کیا، اللہ کی قسم! نہ خود کو تم پر ترجیح دی۔ تمہیں دیا بھی اور تمہارے ہی لئے خرچ بھی کیا، یہاں تک کہ اس سے مال بچا رہا۔ نبی



کریم ﷺ اس مال سے اپنے گھروں کے سالانہ اخراجات پورے فرماتے تھے اور باقی بیت المال میں جمع فرمادیتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ آنے والوں سے فرمایا: آپ کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے؟ سب نے ہاں میں جواب دیا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سیدنا عباس اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما سے بھی یہی سوال کیا۔ ان دونوں نے بھی یہی جواب دیا۔ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی رحمت کو اس دنیا سے بلا لیا۔ ان کے بعد سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں۔ تم دونوں ان کے پاس آئے اور ایک (عباس رضی اللہ عنہ) اپنے بھتیجے کی اور یہ دوسرا (علی رضی اللہ عنہ) اپنی زوجہ کے والد کی طرف سے ملنے والی وراثت لینے کے لیے ان کے پاس گئے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا: ہماری (انبیاء کی) وراثت نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں، وہ سب صدقہ ہو جاتا ہے، لیکن تم دونوں نے انہیں جھوٹا، خائن اور گناہگار سمجھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ اس معاملے میں سچے، مخلص اور برحق تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اٹھا لیا۔ ان کے بعد میں رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہما کا جانشین بنا۔ تم نے مجھے بھی جھوٹا، خائن اور گناہگار سمجھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں اس میں سچا، مخلص اور برحق ہوں۔ یہ مال میرے تصرف میں آگیا۔ پھر آپ دونوں میرے پاس آئے۔ آپ دونوں کا ایک ہی دعویٰ تھا۔ اے عباس! آپ نے مجھ سے اس مال کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا: اگر تم دونوں چاہو تو میں یہ مال آپ کو اس شرط پر دے سکتا ہوں کہ آپ مجھے اللہ تعالیٰ کے نام پر عہد و پیمان دو کہ اس مال کا تصرف اسی طریقے کے مطابق کرو گے، جو نبی اکرم ﷺ اس کے بارے میں اختیار کرتے تھے۔ تم نے اسی شرط پر وہ مال لے لیا۔ کیا بات ایسے ہی ہے؟ دونوں کہنے لگے: جی ہاں! اس پر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب تم مجھ سے اپنے مابین فیصلہ کروانے آ گئے ہو۔ اللہ کی قسم! اب قیامت تک میں تمہارے مابین فیصلہ نہیں



کروں گا۔ ہاں! اگر تم اس مال کے انتظام سے عاجز آ چکے ہو تو اسے واپس کر دو، (میں اس کا انتظام خود کر لوں گا)۔“ (صحیح البخاری: 3094، صحیح مسلم: 1757، واللفظ لہ)

شارح صحیح مسلم، حافظ، یحییٰ بن شرف، نووی رحمہ اللہ (631-676ھ) فرماتے ہیں:

وَأَمَّا قَوْلُ عُمَرَ: جِئْتُمَانِي تَكْلِمَانِي، وَكَلَّمْتُكُمَا فِي وَاحِدَةٍ، جِئْتَ يَا عَبَّاسُ تَسْأَلْنِي نَصِيْبَكَ مِنْ ابْنِ أَخِيكَ، وَجَأْتَنِي هَذَا يَسْأَلْنِي نَصِيْبَ امْرَأَتِهِ مِنْ أَبِيهَا، فِيهِ إِشْكَالٌ مَعَ إِعْلَامِ أَبِي بَكْرٍ لَهُمْ قَبْلَ هَذَا الْحَدِيثِ، وَأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا نُورَثُ»، وَجَوَابُهُ أَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ إِنَّمَا طَلَبَ الْقِيَامَ وَحْدَهُ عَلَى ذَلِكَ، وَيَحْتَجُّ هَذَا بِقُرْبِهِ بِالْعُمُومَةِ، وَذَلِكَ بِقُرْبِ امْرَأَتِهِ بِالنُّبُوَّةِ، وَلَيْسَ الْمُرَادُ أَنَّهُمَا طَلَبَا مَا عَلِمَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْعَهُمَا مِنْهُ أَبُو بَكْرٍ، وَبَيَّنَّ لَهُمَا دَلِيلَ الْمَنْعِ، وَاعْتَرَفَا لَهُ بِذَلِكَ.

”سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ پھر تم دونوں میرے پاس آئے، تم دونوں کا ایک ہی دعویٰ تھا۔ اے عباس! آپ مجھ سے اپنے بھتیجے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتے تھے، اور یہ (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) اپنی زوجہ محترمہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حصہ طلب کرتے تھے۔ یہاں یہ اشکال آتا ہے کہ یہ حدیث کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہمارا (انبیاء کا) کوئی وارث نہیں ہوتا، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی ان دونوں کو بتادی تھی (اس کے باوجود انہوں نے پھر مطالبہ کیوں کیا؟)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں (وراثت طلب کرنے نہیں، بلکہ) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس اس لئے آئے تھے کہ دونوں میں سے ہر ایک کا مطالبہ تھا کہ مالِ فِذک وغیرہ پر اُس اکیلے کو نگران بنایا جائے۔ ان میں سے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ چچا ہونے کی قربت کو دلیل بنا رہے تھے، جبکہ دوسری طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ کی طرف

سے نبی کریم ﷺ کے ساتھ قرابت داری کو بطور دلیل پیش کیا۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ دونوں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نبی کریم ﷺ کی اس میراث کا مطالبہ کر رہے تھے، جس سے آپ ﷺ نے منع فرمایا تھا اور جس سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ان دونوں کو روک دیا تھا اور ان دونوں نے اس حقیقت کو تسلیم بھی کر لیا تھا۔ (شرح صحیح مسلم: 74/12)

شارح صحیح بخاری، حافظ، احمد بن علی، ابن حجر رحمہ اللہ (773-852ھ) فرماتے ہیں:

وَفِي ذَلِكَ إِشْكَالٌ شَدِيدٌ، وَهُوَ أَنَّ أَصْلَ الْقِصَّةِ صَرِيحٌ فِي أَنَّ الْعَبَّاسَ وَعَلِيًّا قَدْ عَلِمَا بِأَنَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا نُورُثُ»، فَإِنْ كَانَا سَمِعَاهُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَيْفَ يَطْلُبَانِهِ مِنْ أَبِي بَكْرٍ؟ وَإِنْ كَانَا إِنَّمَا سَمِعَاهُ مِنْ أَبِي بَكْرٍ، أَوْ فِي زَمَنِهِ بِحَيْثُ أَفَادَ عِنْدَهُمَا الْعِلْمَ بِذَلِكَ، فَكَيْفَ يَطْلُبَانِهِ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْ عُمَرَ؟ وَالَّذِي يَظْهَرُ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ! حَمْلُ الْأَمْرِ فِي ذَلِكَ عَلَى مَا تَقَدَّمَ فِي الْحَدِيثِ الَّذِي قَبْلَهُ فِي حَقِّ فَاطِمَةَ، وَأَنَّ كُلًّا مِّنْ عَلِيٍّ وَفَاطِمَةَ وَالْعَبَّاسِ اعْتَقَدَ أَنَّ عُمُومَ قَوْلِهِ: «لَا نُورُثُ»، مَخْصُوصٌ بِبَعْضٍ مَا يَخْلُفُهُ دُونَ بَعْضٍ، وَلِذَلِكَ نَسَبَ عُمَرُ إِلَى عَلِيٍّ وَعَبَّاسٍ أَنَّهُمَا كَانَا يَعْتَقِدَانِ ظُلْمَ مَنْ خَالَفَهُمَا فِي ذَلِكَ، وَأَمَّا مُخَاصَمَةُ عَلِيٍّ وَعَبَّاسٍ بَعْدَ ذَلِكَ ثَانِيًا عِنْدَ عُمَرَ، فَقَالَ إِسْمَاعِيلُ الْقَاضِي، فِيمَا رَوَاهُ الدَّارِقُطْنِيُّ مِنْ طَرِيقِهِ: لَمْ يَكُنْ فِي الْمِيرَاثِ، إِنَّمَا تَنَارَعَا فِي وَلَايَةِ الصَّدَقَةِ، وَفِي صَرَفِهَا كَيْفَ تُصَرَفُ؟ كَذَا قَالَ، لَكِنْ فِي رِوَايَةِ النَّسَائِيِّ وَعُمَرُ بْنُ شَبَّةٍ مِنْ طَرِيقِ أَبِي الْبُخْتَرِيِّ مَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّهُمَا أَرَادَا أَنْ يُقَسَّمَا



بَيْنَهُمَا عَلَى سَبِيلِ الْمِيرَاثِ، وَلَفْظُهُ فِي آخِرِهِ : ثُمَّ جِئْتُمَانِي الْآنَ تَخْتَصِمَانِ، يَقُولُ هَذَا : أُرِيدُ نَصِيبِي مِنْ ابْنِ أَخِي، وَيَقُولُ هَذَا : أُرِيدُ نَصِيبِي مِنْ أُمْرَاتِي، وَاللَّهِ ! لَا أَقْضِي بَيْنَكُمَا إِلَّا بِذَلِكَ، أَيُّ : إِلَّا بِمَا تَقَدَّمَ مِنْ تَسْلِيمِهَا لَهُمَا عَلَى سَبِيلِ الْوِلَايَةِ، وَكَذَا وَقَعَ عِنْدَ النَّسَائِيِّ مِنْ طَرِيقِ عِكْرَمَةَ بْنِ خَالِدٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ أَوْسٍ نَحْوَهُ، وَفِي السُّنَنِ لِأَبِي دَاوُدَ وَغَيْرِهِ، أَرَادَا أَنَّ عُمَرَ يُقَسِّمُهَا لِيَنْفَرِدَ كُلُّ مِّنْهُمَا بِنَظَرٍ مَا يَتَوَلَّاهُ، فَامْتَنَعَ عُمَرُ مِنْ ذَلِكَ، وَأَرَادَ أَنْ لَا يَقَعَ عَلَيْهَا اسْمُ قَسْمٍ، وَلِذَلِكَ أَقْسَمَ عَلَى ذَلِكَ، وَعَلَى هَذَا اقْتَصَرَ أَكْثَرُ الشُّرَاحِ وَاسْتَحْسَنُوهُ، وَفِيهِ مِنَ النَّظَرِ مَا تَقَدَّمَ، وَأَعْجَبُ مِنْ ذَلِكَ جَزْمُ ابْنِ الْجَوْزِيِّ ثُمَّ الشَّيْخِ مُحْيِي الدِّينِ بِأَنَّ عَلِيًّا وَعَبَّاسًا لَمْ يَطْلُبَا مِنْ عُمَرَ إِلَّا ذَلِكَ، مَعَ أَنَّ السِّيَاقَ صَرِيحٌ فِي أَنَّهُمَا جَاءَاهُ مَرَّتَيْنِ فِي طَلَبِ شَيْءٍ وَاحِدٍ، لَكِنَّ الْعُدْرَ لِابْنِ الْجَوْزِيِّ وَالنَّوَوِيِّ أَنَّهُمَا شَرَحَا اللَّفْظَ الْوَارِدَ فِي مُسْلِمٍ، دُونَ اللَّفْظِ الْوَارِدِ فِي الْبُخَارِيِّ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ، وَأَمَّا قَوْلُ عُمَرَ : جِئْتَنِي يَا عَبَّاسُ ! تَسْأَلُنِي نَصِيبَكَ مِنْ ابْنِ أَخِيكَ، فَإِنَّمَا عَبَّرَ بِذَلِكَ لِبَيَانِ قِسْمَةِ الْمِيرَاثِ، كَيْفَ يُقَسَّمُ أَنْ لَوْ كَانَ هُنَاكَ مِيرَاثٌ، لَا أَنَّهُ أَرَادَ الْغَضَّ مِنْهُمَا بِهَذَا الْكَلَامِ، وَزَادَ الْإِمَامِيُّ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عِنْدَ عُمَرَ بْنِ شَبَّةٍ فِي آخِرِهِ : فَأَصْلَحَا أَمْرَكُمَا، وَإِلَّا لَمْ يَرْجِعْ، وَاللَّهِ، إِلَيْكُمَا، فَقَامَا وَتَرَكََا الْخُصُومَةَ، وَأُمْضِيَتْ صَدَقَةٌ، وَزَادَ شُعَيْبٌ فِي آخِرِهِ، قَالَ ابْنُ شِهَابٍ :



فَحَدَّثْتُ بِهِ عُرْوَةَ، فَقَالَ: صَدَقَ مَالِكُ بْنُ أَوْسٍ، أَنَا سَمِعْتُ عَائِشَةَ تَقُولُ،  
 فَذَكَرَ حَدِيثًا، قَالَ: وَكَانَتْ هَذِهِ الصَّدَقَةُ بِيَدِ عَلِيٍّ مَنَعَهَا عَبَّاسًا، فَغَلَبَهُ  
 عَلَيْهَا، ثُمَّ كَانَتْ بِيَدِ الْحَسَنِ، ثُمَّ بِيَدِ الْحُسَيْنِ، ثُمَّ بِيَدِ عَلِيٍّ بْنِ الْحُسَيْنِ،  
 وَالْحَسَنِ بْنِ الْحَسَنِ، ثُمَّ بِيَدِ زَيْدِ بْنِ الْحَسَنِ، وَهِيَ صَدَقَةُ رَسُولِ اللَّهِ  
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَقًّا، وَرَوَى عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ  
 مِثْلَهُ، وَزَادَ فِي آخِرِهِ: قَالَ مَعْمَرٌ: ثُمَّ كَانَتْ بِيَدِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ حَسَنِ حَتَّى  
 وَلَّى هَوْلَاءَ، يَعْنِي بَنِي الْعَبَّاسِ، فَقَبَضُوهَا، وَزَادَ إِسْمَاعِيلُ الْقَاضِي أَنَّ  
 إِعْرَاضَ الْعَبَّاسِ عَنْهَا كَانَ فِي خِلَافَةِ عُثْمَانَ، قَالَ عُمَرُ بْنُ شَبَّهَةَ: سَمِعْتُ  
 أَبَا غَسَّانَ، هُوَ مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى الْمَدَنِيُّ، يَقُولُ: إِنَّ الصَّدَقَةَ الْمَذْكُورَةَ  
 الْيَوْمَ بِيَدِ الْخَلِيفَةِ يَكْتُبُ فِي عَهْدِهِ، يُؤَلِّي عَلَيْهَا مِنْ قَبْلِهِ مَنْ يَقْبِضُهَا،  
 وَيَقْرِقُهَا فِي أَهْلِ الْحَاجَةِ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ، قُلْتُ: كَانَ ذَلِكَ عَلَى رَأْسِ  
 الْمِائَتَيْنِ، ثُمَّ تَغَيَّرَتِ الْأُمُورُ، وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ.

”اس حدیث میں سخت اشکال وارد ہوا ہے، کیونکہ اس قصہ میں صراحتاً موجود ہے کہ  
 سیدنا عباس اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما دونوں جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ہم (انبیاء)  
 اپنی کوئی وراثت نہیں چھوڑتے۔ اگر انہوں نے اس حدیث کو نبی کریم ﷺ سے سنا تھا، پھر  
 انہوں نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے وراثت کا مطالبہ کیوں کیا؟ اور اگر ان دونوں نے اس  
 بات کو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سنا یا ان کے دورِ خلافت میں اس علم سے مستفید ہوئے



تھے، تو انہوں نے بعد میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اس کا مطالبہ کیوں کیا؟ معاملات کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے مگر جو بات میری سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ جو حدیث اس سے قبل سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں گزری ہے، اسی پر اسے محمول کیا جائے گا، یعنی سیدنا علی، سیدہ فاطمہ اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہم تینوں یہ نظریہ رکھتے تھے کہ «لَا نُورَثُ» والی حدیث سے نبی کریم ﷺ کے بعض وارثوں کو استثنا حاصل ہے اور بعض کو نہیں۔ اس لئے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہما دونوں کی طرف یہ بات منسوب کی تھی کہ ان کے خیال میں جو شخص ان کی اس رائے سے اختلاف کرتا ہے، وہ ظلم کر رہا ہے۔ اب رہا سیدنا عباس اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کا وہ تنازع، جس کو لے کر وہ دوسری مرتبہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تھے، تو اس حوالے سے اسماعیل قاضی رحمہ اللہ اس روایت سے دلیل لیتے ہیں، جسے امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ ان دونوں کا تنازع میراث میں نہیں تھا، یہ جھگڑا صرف فدک وغیرہ کے مال کی نگرانی و تصرف کے بارے میں تھا، البتہ امام نسائی رحمہ اللہ اور عمر بن شبہ رحمہ اللہ نے ابو البختری سے ایک روایت نقل کی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ دونوں اس مال کو آپس میں وراثت کے اعتبار سے تقسیم کرنے کے خواہاں تھے۔ اس حدیث کے آخر میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں کہ ابھی تم دونوں میرے پاس یہ جھگڑا لے آئے ہو، یہ (سیدنا عباس رضی اللہ عنہ) اپنے بھتیجے کی میراث سے حق مانگتے ہیں اور یہ (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) اپنی زوجہ محترمہ کے حق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں اس مال کو صرف اسی ایک انداز میں تقسیم کروں گا، جسے تم اس سے قبل تسلیم کر چکے ہو، یعنی اس پر صرف تمہاری نگرانی ہوگی۔ (یہ روایت انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے، ابو البختری کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں ہے۔) امام نسائی رحمہ اللہ (4153؛ وسندہ صحیح) نے عکرمہ بن خالد کے ایک دوسرے طریق سے بھی اسی طرح بات نقل کی ہے۔ سنن ابی داؤد وغیرہ میں بھی اسی





طرح روایت آتی ہے۔ وہ دونوں یہ چاہتے تھے کہ ان کے لئے مال کی نگرانی کو تقسیم کر دیا جائے، جتنے حصہ کی نگرانی ایک کے حصہ میں آئے، وہ اس پر نظر رکھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس سے روک دیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس بات کے خواہاں تھے کہ اس مال پر تقسیم کا لفظ نہ بولا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایسا نہ کرنے کی قسم اٹھائی تھی۔ اکثر شارحین نے اتنی ہی بات پر اکتفا کیا ہے اور اسی کو نگاہِ تحسین سے دیکھا ہے، مگر یہ گزشتہ بات محلِ نظر ہے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ اس سے بھی قابلِ تعجب بات حافظ ابن الجوزی اور حافظ نووی کی ہے کہ سیدنا علی اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہما دونوں نے یہی مطالبہ کیا تھا، حالانکہ حدیث کے سیاق میں یہ بات واضح ہے کہ وہ دونوں ہر مرتبہ ایک ہی چیز کا مطالبہ لے کر آئے تھے۔ مگر حافظ ابن الجوزی اور حافظ نووی رحمہما کی طرف سے یہ عذر مانا جاسکتا ہے کہ انہوں نے شرح کرتے ہوئے صرف صحیح مسلم کے الفاظ کو مد نظر رکھا ہے اور صحیح بخاری کے الفاظ کی طرف ان کی توجہ نہیں گئی، واللہ اعلم! رہا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ اے عباس! آپ نے میرے پاس آ کر اپنے بھتیجے کی میراث سے حصے کا مطالبہ کیا تھا، تو اس قول سے ان کی مراد صرف میراث کی تقسیم کا بیان تھا کہ اگر یہ واقعی میراث ہے، تو اسے کیسے تقسیم کیا جائے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد ان دونوں صحابہ کی گفتگو کی تحقیر کرنا نہیں تھا۔ امامی نے اس روایت میں کچھ الفاظ زیادہ بیان کیے ہیں، جنہیں عمر بن شبہ نے ابن شہاب سے نقل کیا ہے، اس روایت کے آخری الفاظ یہ ہیں: آپ دونوں اپنے معاملے کی اصلاح کر لو، ورنہ اللہ کی قسم! دوبارہ یہ مال تمہارے پاس نہیں آئے گا، اس پر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے اور اپنے تنازع کو ختم کر لیا۔ اس مال کو بطورِ صدقہ ہی جاری رکھا گیا۔ اس روایت کے آخر میں راوی شعیب نے یہ الفاظ زائد بیان کیے ہیں: ابن شہاب کا کہنا ہے کہ میں نے عروہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بیان کی، تو انہوں نے فرمایا: سیدنا مالک بن اوس رضی اللہ عنہ نے سچ بیان کیا ہے، میں نے خود سیدہ



عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا وہ یہ فرما رہی تھیں، پھر انہوں نے حدیث کا پورا قصہ بیان کیا۔ عروہ نے کہا: یہی وہ صدقہ ہے، جس کا انتظام پہلے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو اس میں شریک نہیں کیا تھا اور وہ اس معاملے میں سیدنا عباس رضی اللہ عنہ پر غالب رہے۔ اس کے بعد یہ صدقہ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے انتظام میں آ گیا، پھر سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے انتظام میں آ گیا، پھر امام علی بن حسین رضی اللہ عنہما پھر امام حسن بن حسن رضی اللہ عنہ اور پھر امام زید بن حسن رضی اللہ عنہ کے انتظام میں آ گیا اور یہ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ تھا۔ امام عبد الرزاق رضی اللہ عنہ نے معمر کے واسطے سے زہری سے اسی طرح روایت کی ہے، البتہ یہ الفاظ زیادہ بیان کیے ہیں کہ معمر نے کہا: پھر وہ مال عبد اللہ بن حسن رضی اللہ عنہ کے انتظام میں آ گیا، یہاں تک کہ بنو عباس اس کے والی بن گئے۔ اسماعیل قاضی رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ کو زیادہ کیا ہے کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اس سے اعراض کیا تھا۔ عمر بن شبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو غسان محمد بن یحییٰ مدنی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اس وقت مذکورہ صدقہ کا انتظام خلیفہ وقت کے ہاتھ میں ہے، وہ اسی شخص کے سپرد کر دیتا ہے، جس کے قبضہ میں سابقہ حکمران کے دور میں تھا، وہ شخص شہر کے ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم کرتا ہے۔ میں (ابن حجر) کہتا ہوں کہ یہ نظام دو صدیوں تک چلتا رہا، پھر اس میں تبدیلی آ گئی۔“ (فتح الباری شرح صحیح البخاری: 207/6)

✽ صحابی رسول، سیدنا ابو طفیل، عامر بن وائلہ، لیشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

جَاءَتْ فَاطِمَةُ إِلَى أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، فَقَالَتْ: يَا خَلِيفَةَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ! أَنْتَ وَرِثْتَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمْ أَهْلُهُ؟ قَالَ: لَا، بَلْ أَهْلُهُ، قَالَتْ: فَمَا بَالُ الْخُمْسِ؟ فَقَالَ: إِنِّي سَمِعْتُ

رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «إِذَا أَطْعَمَ اللَّهُ نَبِيًّا طُعْمَةً ثُمَّ قَبَضَهُ، كَانَتْ لِلَّذِي يَلِي بَعْدَهُ»، فَلَمَّا وَلِيَتْ رَأَيْتُ أَنْ أُرَدَّهُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ، قَالَتْ: أَنْتَ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْلَمُ، ثُمَّ رَجَعَتْ.

”سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور عرض کیا: رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! نبی کریم ﷺ کے وارث آپ رضی اللہ عنہ ہیں یا آپ ﷺ کے اہل بیت؟ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نبی کریم ﷺ کا وارث نہیں ہوں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت ہی آپ ﷺ کے وارث ہیں۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تو پھر مالِ خمس کا کیا بنے گا؟ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا: جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو کوئی مال عطا فرماتا ہے، پھر اپنے پاس بلا لیتا ہے، تو اس مال کا نظم و نسق اس شخص کے ہاتھ میں ہوگا، جو خلیفہ وقت ہوگا۔ چنانچہ جب میں خلیفہ بنا، تو یہ مناسب سمجھا کہ اس مال کو مسلمانوں میں تقسیم کر دوں۔ اس پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اس معاملے میں آپ اور رسول اللہ ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں، پھر آپ رضی اللہ عنہا چلی گئیں۔“

(مسند الإمام أحمد: 4/1، السنن الكبرى للبيهقي: 303/6، والسياق له، وسنده حسن)

مورخ اسلام اور مفسر قرآن، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (700-774ھ) فرماتے ہیں:

وَقَدْ رَوَيْنَا أَنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا احْتَجَّتْ أَوَّلًا بِالْقِيَّاسِ وَبِالْعُمُومِ فِي الْآيَةِ الْكَرِيمَةِ، فَأَجَابَهَا الصِّدِّيقُ بِالنَّصِّ عَلَى الْخُصُوصِ بِالْمَنْعِ فِي حَقِّ النَّبِيِّ، وَأَنَّهَا سَلَّمَتْ لَهُ مَا قَالَ، وَهَذَا هُوَ الْمَطْنُونُ بِهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا.

”بلاشبہ ہمارے پاس ایک روایت ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اولاً تو آیت کریمہ کے عموم سے قیاس کرتے ہوئے اپنی دلیل بنائی، لیکن جب سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے واضح

نص سے اس کا جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ کی میراث کے بارے میں تقسیم نہ ہونے کا خاص حکم ہے، تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ فرمانِ رسول ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا۔ جگر گوشہ رسول ﷺ سے ایسا ہی گمان کیا جاسکتا تھا۔“

(البدایة والنهاية : 309/5)

## فائدہ ① :

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منسوب روایت ہے کہ :

لَمَّا نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ : ﴿وَأَتِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ (بنی اسرائیل 17 : 26) دَعَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ فَأَعْطَاهَا فَدَكَ .  
”جب یہ فرمانِ باری تعالیٰ نازل ہوا کہ اپنے عزیز و اقارب کو ان کا حق دیجئے، تو رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر باغِ فدک دے دیا۔“

(مسند البزار (كشف الأستار) : 2223)

لیکن یہ روایت باطل ہے۔

اس کے راوی عطیہ عوفی کو جمہور محدثین کرام نے ”ضعیف“ قرار دیا۔

(تهذيب الأسماء واللغات للنووي : 48/1، طرح التثريب لابن العراقي : 42/3، مجمع

الزوائد للهيثمي : 412/1، البدر المنير لابن الملقن : 463/7، عمدة القاري للعيني : 250/6)

اس کو امام یحییٰ بن سعید قطان، امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام ابو حاتم رازی، امام ابو زرعہ رازی، امام نسائی، امام ابن عدی، امام دارقطنی، امام ابن حبان اور علامہ جوزجانی وغیرہ نے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔

اس کے ضعیف ہونے پر اجماع ہو گیا تھا، جیسا کہ حافظ ابن الجوزی رحمہ اللہ کہتے ہیں :

أَمَّا عَطِيَّةٌ، فَاجْتَمَعُوا عَلَى تَضْعِيفِهِ .

”عطیہ عونی کے ضعیف ہونے پر محدثین کرام نے اتفاق کر لیا ہے۔“

(الموضوعات: 386/1)

نیز حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: مُجْمَعٌ عَلَىٰ ضُعْفِهِ .

”اس کے ضعیف ہونے پر محدثین کرام کا اجماع ہے۔“ (المغنی فی الضعفاء: 62/2)

حافظ ابن ملقن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وَهُوَ ضَعِيفٌ بِإِجْمَاعِهِمْ .

”یہ باتفاقِ محدثین ضعیف ہے۔“ (البدر المنیر: 313/5)

یہ تدلیس کی بُری قسم میں بُری طرح ملوث تھا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ضَعِيفُ الْحِفْظِ، مَشْهُورٌ بِالتَّدْلِيسِ الْقَبِيحِ .

”یہ کمزور حافظے والا تھا اور بُری تدلیس کے ساتھ مشہور تھا۔“

(طبقات المدلسین، ص: 50)

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ زیر بحث روایت کے بارے میں فرماتے ہیں:

هَذَا بَاطِلٌ، وَلَوْ كَانَ وَقَعَ ذَلِكَ لَمَا جَاءَتْ فَاطِمَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا تَطْلُبُ شَيْئًا، هُوَ فِي حَوْزِهَا وَمِلْكِهَا .

”یہ روایت باطل ہے، اگر واقعی ایسا ہوتا، تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اس چیز کا مطالبہ کرنے نہ

آتیں جو پہلے سے ان کے پاس موجود اور ان کی ملکیت میں تھی۔“ (میزان الاعتدال: 135/3)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَهَذَا الْحَدِيثُ مُشْكَلٌ لَوْ صَحَّ إِسْنَادُهُ، لِأَنَّ الْآيَةَ مَكِيَّةً، وَفَدَكُ إِنَّمَا

فُتِحَتْ مَعَ خَبِيرَ سَنَةِ سَبْعٍ مِنَ الْهَجْرَةِ، فَكَيْفَ يَلْتَمِمْ هَذَا مَعَ هَذَا؟

”اگر اس روایت کی سند صحیح بھی ہو، تو اس میں اشکال ہے، کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور فدک



تو سات ہجری میں خیبر کے ساتھ فتح ہوا۔ کیسے اس آیت کو اس واقعہ کے ساتھ ملایا جاسکتا ہے۔“  
(تفسیر ابن کثیر: 69/5، بتحقیق الدكتور سلامة)

**فائدہ ②:** خلیفہ ثانی، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے کہ:

لَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الَّذِي تُوفِّيَ فِيهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُويعَ لِأَبِي بَكْرٍ فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ، فَلَمَّا كَانَ مِنَ الْعَدِ جَاءَتْ فَاطِمَةُ إِلَى أَبِي بَكْرٍ مَعَهَا عَلِيٌّ، فَقَالَتْ: مِيرَاثِي مِنْ رَسُولِ اللَّهِ أَبِي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: أَمِنَ الرِّثَّةُ أَوْ مِنَ الْعُقَدِ؟ قَالَتْ: فَدُكٌ وَخَيْرٌ وَصَدَقَاتُهُ بِالْمَدِينَةِ أَرِثُهَا، كَمَا يَرِثُكَ بَنَاتُكَ إِذَا مِتَّ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: أَبُوكَ وَاللَّهِ خَيْرٌ مِنِّي، وَأَنْتِ وَاللَّهِ خَيْرٌ مِّنْ بَنَاتِي، وَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا نُورَثُ، مَا تَرَكَنَا صَدَقَةٌ»، يَعْنِي هَذِهِ الْأَمْوَالُ الْقَائِمَةُ، فَتَعْلَمِينَ أَنَّ أَبَاكَ أَعْطَاكِهَا، فَوَاللَّهِ! لَئِنْ قُلْتُ نَعَمْ، لَأَقْبِلَنَّ قَوْلَكَ وَلَأُصَدِّقَنَّكَ، قَالَتْ: جَائِئْنِي أَمْ أَيْمَنَ، فَأَخْبَرْتَنِي أَنَّهُ أَعْطَانِي فَدَكَ، قَالَ: فَسَمِعْتَهُ يَقُولُ هِيَ لَكَ؟ فَإِذَا قُلْتُ: قَدْ سَمِعْتُهُ، فَهِيَ لَكَ، فَأَنَا أَصَدِّقُكَ، وَأَقْبِلُ قَوْلَكَ، قَالَتْ: قَدْ أَخْبَرْتُكَ مَا عِنْدِي.

”جس دن رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے، اسی روز سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی گئی۔ دوسرا دن ہوا تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں، انہوں نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے والد رسول اللہ ﷺ کی میراث مجھے دی جائے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اسبابِ خانہ داری

سے یا جائیداد سے؟ سیدہ نے کہا: فدک، خیر اور صدقاتِ مدینہ کی میں وارث ہوں، جیسا کہ جب آپ ﷺ فوت ہوں گے، تو آپ ﷺ کی بیٹیاں آپ کی وارث ہوں گی۔ سیدنا ابو بکر ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! آپ ﷺ کے والد مجھ سے بہتر تھے اور اللہ کی قسم! آپ میری بیٹیوں سے بہتر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ہم (انبیاء) کسی کو وارث نہیں بناتے، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں، وہ صدقہ ہوتا ہے۔ آپ کی مراد یہی اموال موجودہ تھے۔ آپکو یقین ہے کہ آپ کے والد ﷺ نے یہ اموال آپ کو دے دیے ہیں؟ اللہ کی قسم! اگر آپ ہاں کہہ دیں تو میں ضرور آپ کی بات کو ماننے ہوئے آپ کی تصدیق کروں گا۔ سیدہ نے کہا: میرے پاس ام ایمن بنتی تھیں اور انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فدک مجھے دے دیا ہے۔ سیدنا ابو بکر صدیق ﷺ نے فرمایا: کیا آپ نے بھی رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ فدک آپ کے لئے ہے۔ اگر آپ یہ کہہ دیں تو میں آپ ﷺ کی تصدیق کروں گا اور آپ کی بات مان لوں گا۔ سیدہ فاطمہ ﷺ نے کہا: جو دلیل میرے پاس تھی، اس سے میں نے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔“ (الطبقات الكبرى لابن سعد: 241/2)

لیکن یہ جھوٹ کا پلندہ ہے، جسے محمد بن عمر واقدی ”کذاب و متروک“ نے جمع کیا ہے۔

**فائدہ (۳):** فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا \* يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾

(مریم: 19-5-6)

”(زکریا علیہ السلام نے دُعا کی: اے میرے رب) مجھے اپنی جناب سے اولاد عطا فرما، جو

میری اور آلِ یعقوب کی وارث بنے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:



﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ (سورة النمل 27 : 16)

”اور سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام کے وارث بنے۔“

ان دونوں مقامات پر انبیاء کرام کی وراثت سے مراد مال و جائیداد نہیں، بلکہ علم نبوت اور حکمت ہے، جیسا کہ:

مفسر قرآن، حافظ، اسماعیل بن عمر، ابن کثیر رحمہ اللہ (700-774ھ) فرماتے ہیں:

﴿يَرِثُنِي﴾ عَلَى مِيرَاثِ النُّبُوَّةِ، وَلِهَذَا قَالَ : ﴿وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾، كَمَا قَالَ تَعَالَى : ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ (النمل 27 : 16)،  
أَيَّ فِي النُّبُوَّةِ، إِذْ لَوْ كَانَ فِي الْمَالِ لَمَا خَصَّهُ مِنْ بَيْنِ إِخْوَتِهِ بِذَلِكَ، وَلَمَا كَانَ فِي الْإِخْبَارِ بِذَلِكَ كَبِيرُ فَائِدَةٍ، إِذْ مِنَ الْمَعْلُومِ الْمُسْتَقَرِّ فِي جَمِيعِ الشَّرَائِعِ وَالْمِلَلِ أَنَّ الْوَلَدَ يَرِثُ أَبَاهُ، فَلَوْلَا أَنَّهَا وَرَاثَةٌ خَاصَّةٌ لَّمَّا أَخْبَرَ بِهَا، وَكُلُّ هَذَا يَقْرُرُهُ وَيُثَبِّتُهُ مَا صَحَّ فِي الْحَدِيثِ.

”﴿يَرِثُنِي﴾ سے میراث نبوت مراد ہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ وہ میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ (سورة النمل 27 : 16) اور سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام کے وارث بنے۔ یہاں بھی نبوت میں وارث بننا مراد ہے۔ اگر اس سے مالی وراثت مراد ہوتی تو سیدنا زکریا علیہ السلام اپنے بھائیوں میں سے ایک ہی کو کیوں خاص کرتے؟ نیز مالی وراثت کی بات بتانا کوئی بڑا فائدہ نہ تھا، جبکہ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ تمام شریعتوں اور ملتوں میں یہ بات مسلسل چلی آرہی ہے کہ باپ کی میراث میں اولاد وارث ہوتی ہے۔ اگر یہ میراث خاص نہ ہوتی تو اس کی خبر دینے کی کیا ضرورت تھی؟ احادیث صحیحہ کے تمام دلائل اسی بات کو ثابت کرتے ہیں۔“

(تفسیر ابن کثیر : 213/5، بتحقیق الدكتور سلامة)



حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: ”اسی موقف کو امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اختیار کیا ہے۔“ (تفسیر ابن کثیر: 213/5، بتحقیق الدكتور سلامة)

**الحاصل:** اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ انبیائے کرام کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی، بلکہ جو مال و متاع وہ چھوڑ کر جائیں، وہ صدقہ ہو جاتا ہے۔

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے باغِ فدک کو بطور وراثت تقسیم کرنے سے صرف اس لیے انکار کیا تھا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سنا ہوا تھا کہ انبیا کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطالبے پر انہوں نے یہی فرمان رسول پیش فرمایا تھا۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے باغِ فدک کا بطور وراثت ان کی مطالبہ اجتہادی خطا تھی، جس سے انہوں نے حدیث نبوی سننے کے بعد رجوع فرمالیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل بیت میں سے کسی نے بھی سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس وجہ سے ملامت نہیں کیا، نہ ہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں فدک کو بطور وراثت تقسیم کیا۔

رہیں وہ روایات جن میں باغِ فدک سے حصہ نہ ملنے پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کلام نہ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے، تو ان روایات کی اصل مراد یہ ہے کہ سیدہ رضی اللہ عنہا نے وراثت کے مطالبے کے حوالے سے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کوئی کلام نہیں کی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی سننے کے بعد وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گئی تھیں۔

اور جن روایات میں یہ ذکر ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئی تھیں، رائج یہی ہے سیدہ رضی اللہ عنہا اپنے والد گرامی کی وفات حسرت آیات پر اس قدر افسردہ تھیں اور اپنے خانگی معاملات میں اس قدر مصروف ہوئیں اور پھر صرف چھ ماہ بعد وفات پا گئیں، تو سمجھنے والے نے یہ سمجھ لیا کہ وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہیں۔

لہذا فدک کے معاملے کو بنیاد بنا کر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو غاصب قرار دینا عقلی و نقلی کسی حوالے سے درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محبت صحابہ پر زندہ رکھے اور اسی پر موت دے۔

## مولودِ کعبہ

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

کسی صحیح اور معتبر دلیل سے ثابت نہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ولادت باسعادت خانہ کعبہ میں ہوئی۔ یہ کہنا کہ آپ رضی اللہ عنہ خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے، دلیل کا محتاج ہے۔ بعض لوگ اس سلسلے میں کچھ دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ ان مزعومہ دلائل پر اصولِ محدثین کی روشنی میں علمی و تحقیقی تبصرہ ملاحظہ ہو:

### دلیل نمبر ①: ام عارہ بنتِ عبادہ سے منسوب ہے کہ:

ایک دن میں عرب عورتوں کے پاس تھی کہ ابو طالب مغموم و پریشان تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا: ابو طالب! کیا ہوا؟ وہ کہنے لگے: فاطمہ بنتِ اسد اس وقت سخت دردِ زہ میں مبتلا ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ اسی اثنا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: چچا جی کیا مسئلہ ہے؟ انہوں نے بتایا: فاطمہ بنتِ اسد دردِ زہ سے دوچار ہیں۔ ان کو کعبہ میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا نام لے کر بیٹھ جائیے۔ انہوں نے ایک خوش، صاف ستھرا اور حسین ترین بچہ جنم دیا۔ ابو طالب نے اس کا نام علی رکھ دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بچے کو اٹھا کر گھر لائے۔

(مناقب علی بن ابی طالب لابن المغازلی، الرقم: 3)

### تبصرہ: یہ جھوٹی روایت ہے، کیونکہ:

① اس کا راوی ابو طاہر یحییٰ بن حسن علوی کون ہے، کوئی پتہ نہیں۔

② محمد بن سعید دارمی کی توثیق درکار ہے۔

③ زیدہ بنت قریبہ کے حالاتِ زندگی نہیں مل سکے۔

④ ان کی ماں ام العارہ بنتِ عبادہ کون ہے، معلوم نہیں۔

پے در پے ”مجهول“ راویوں کی بیان کردہ روایت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

**دلیل نمبر ② :** سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے کہ:

”خانہ کعبہ میں سب سے پہلے سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔۔۔۔۔ اور بنو ہاشم میں سب سے پہلے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔“

(أخبار مكة للفاکھی : 198/3 ، الرقم : 2018)

**تبصرہ:** اس قول کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ امام فاکھی کے استاذ ابراہیم

بن ابو یوسف کے حالاتِ زندگی نہیں مل سکے۔ شریعت نے ہمیں ثقہ اور معتبر راویوں کی روایات کا مکلف ٹھہرایا ہے، نہ کہ مجهول اور غیر معتبر راویوں کے بیان کردہ قصے کہانیوں کا۔

**تنبیہ:** امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ (المستدرک : 384/3) فرماتے ہیں کہ متواتر روایات سے

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مولودِ کعبہ ہونا ثابت ہے، لیکن یہ بات امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خطا ہے، کیونکہ متواتر تو کیا اس مفہوم کی روایات ”حسن“ یا ”صحیح“ بھی نہیں۔

رہی مؤرخین کی تصریحات، تو وہ بھی اس کے بالکل خلاف ہیں، وہ سب یہی کہتے ہیں کہ سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ پہلے اور آخری مولودِ کعبہ ہیں۔

**الحاصل :** سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مولودِ کعبہ ہونا کسی معتبر دلیل سے ثابت

نہیں۔ اس بارے میں کوئی صحیح و صریح روایت ذخیرہ حدیث میں موجود نہیں۔





## مجاہد بن سعید جرح و تعدیل کی میزان میں

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

مجاہد بن سعید ہمدانی کوئی (م: 144ھ) جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“ ہے، نیز یہ آخری عمر میں ”اختلاط“ کا شکار بھی ہو گیا تھا، جیسا کہ:

① حافظ عبد الرحیم بن حسین، عراقی رحمۃ اللہ علیہ (765-406ھ) فرماتے ہیں:

وَقَدْ ضَعَّفَهُ الْجُمُھُورُ، وَقَدْ اخْتَلَطَ آخِرًا.

”جمہور محدثین کرام نے اسے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ یہ آخری عمر میں مختلط بھی ہو گیا تھا۔“  
(طرح التریب فی شرح التقریب: 389/2)

② حافظ، ابوالحسن، علی بن ابوبکر، پیشی (735-807ھ) فرماتے ہیں:

وَقَدْ ضَعَّفَهُ الْجُمُھُورُ. ”اسے جمہور محدثین نے ضعیف کہا ہے۔“

(مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: 33/5، 190)

③ علامہ، محمود بن احمد، عینی، حنفی (762-855ھ) لکھتے ہیں:

وَمَجَالِدٌ ضَعَّفَهُ الْجُمُھُورُ. ”مجاہد کو جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔“

(عمدة القاري شرح صحيح البخاري: 240/6، تحت الحديث: 934)

④ علامہ ابن مُفْلِح (816-884ھ) فرماتے ہیں:

وَقَدْ ضَعَّفَهُ الْأَكْثَرُ. ”اسے اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے۔“

(المبدع في شرح المقنع: 345/7)

⑤ علامہ عبدالرؤف مناوی رحمۃ اللہ علیہ (952-1031ھ) حافظ عراقی سے نقل کرتے ہیں:

”اسے جمہور نے ضعیف کہا ہے۔“ (فیض القدير: 14/6، ح: 8247)



① علامہ، احمد بن محمد بن علی، شوکانی رحمۃ اللہ علیہ (1173-1250 ھ) فرماتے ہیں:

وَقَدْ ضَعَّفَهُ الْجُمْهُورُ. ”اسے جمہور محدثین کرام نے ضعیف کہا ہے۔“

(نیل الأوطار: 273/2)

## جارحین

① امام ابو عبد اللہ، احمد بن محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (164-241 ھ) فرماتے ہیں:

مُجَالِدٌ حَدِيثُهُ عَنْ أَصْحَابِهِ كَأَنَّهُ حُلْمٌ.

”مجالد کی اپنے اصحاب سے بیان کردہ حدیث ایسے ہے، جیسے خواب۔“

(المجروحین لابن حبان: 11/3، وسندہ صحیح)

نیز فرماتے ہیں: حَدِيثُ مُجَالِدٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ، كَأَنَّهُ حُلْمٌ.

”مجالد کی شعبی سے بیان کردہ روایت گویا خواب ہے۔“

(مسائل الإمام أحمد وإسحاق بن راهويه: 750)

مزید فرماتے ہیں: ضَعِيفُ الْحَدِيثِ. ”اس کی حدیث ضعیف ہے۔“

(سؤالات الميموني: 362)

نیز فرماتے ہیں: فَإِنَّهُ كَانَ يُكْثِرُ وَيَضْطَرُّ.

”مجالد زیادہ روایات بیان کرتا تھا اور اضطراب کا شکار رہتا تھا۔“

(المعرفة والتاريخ للإمام يعقوب بن سفيان: 165/2، وسندہ صحیح)

② امام محمد بن ادريس، شافعی رحمۃ اللہ علیہ (150-204 ھ) فرماتے ہیں:

وَالْحَدِيثُ عَنْ مُجَالِدٍ يُجَالِدُ الْحَدِيثَ.

”مجالد سے بیان کی گئی روایات (صحیح) حدیث کی مخالفت کرتی ہیں۔“

(المجروحین لابن حبان: 11/3، وسندہ حسن)



③ امام، ابو عبد اللہ، محمد بن سعد بن منیع رحمہ اللہ (168-230 ھ) فرماتے ہیں:

وَكَانَ ضَعِيفًا فِي الْحَدِيثِ . ”یہ حدیث میں ضعیف تھا۔“

(الطبقات الكبير: 349/6)

④ علامہ، ابراہیم بن یعقوب، جوزجانی (م: 259 ھ) لکھتے ہیں:

يُضَعَّفُ حَدِيثُهُ . ”اس کی بیان کردہ حدیث ضعیف قرار دی جائے۔“

(أحوال الرجال: 126)

⑤ امام، ابو عبد الرحمن، احمد بن شعیب، نسائی رحمہ اللہ (215-303 ھ) فرماتے ہیں:

ضَعِيفٌ . ”یہ ضعیف راوی ہے۔“ (الضعفاء المتروكون، ص: 233)

**نوٹ:** بعض اہل علم نے امام نسائی رحمہ اللہ سے مجاہد کو ”ثقہ“ قرار دینا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس کا ثبوت نہیں مل سکا۔

⑥ امام، ابو الحسن، علی بن عمر، دارقطنی رحمہ اللہ (306-385 ھ) فرماتے ہیں:

لَيْسَ بِقَوِيٍّ . ”یہ قوی راوی نہیں۔“ (الضعفاء المتروكون: 532)

نیز فرماتے ہیں: لَيْسَ بِثِقَةٍ، ---، لَا يُعْتَبَرُ بِهِ .

”یہ ثقہ راوی نہیں۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔“ (سؤالات البرقاني: 474)

⑦ امام، ابو حاتم، محمد، ابن حبان رحمہ اللہ (م: 354 ھ) فرماتے ہیں:

وَكَانَ رَدِيءَ الْحِفْظِ، يُقَلِّبُ الْأَسَانِيدَ، وَيَرْفَعُ الْمَرَاسِيلَ، لَا يَجُوزُ

الِاخْتِجَاجُ بِهِ . ”اس کا حافظہ بہت کمزور تھا۔ یہ سندوں کو بدل دیتا تھا اور مراسیل

کو مرفوع بنا دیتا تھا۔ اس کی بیان کردہ حدیث سے دلیل لینا جائز نہیں۔“

(المجروحين: 11-10/3)



⑧ امام، ابو زکریا، یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ (158-233 ھ) فرماتے ہیں:

”مُجَالِدٌ ضَعِيفٌ، وَاهِي الْحَدِيثِ .“  
”مجاہد ضعیف راوی ہے اور اس کی بیان کردہ احادیث کمزور ہیں۔“

(الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: 362/8، وسنده صحيح)

نیز فرماتے ہیں: مُجَالِدٌ وَحَجَّاجٌ لَا يُحْتَجُّ بِحَدِيثِهِمَا .  
”مجاہد اور حجاج کی بیان کردہ حدیث کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔“

(تاریخ ابن معین بروایۃ الدوري: 3142)

نیز فرماتے ہیں: كَانَ ضَعِيفًا . ”ضعیف راوی تھا۔“

(الضعفاء الكبير للعليلي: 233/4، وسنده حسن، المجروحین لابن حبان: 1039، وسنده حسن)

ایک مرتبہ فرمایا: إِسْرَائِيلُ وَشَرِيكُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ مُجَالِدٍ .  
”اسرائیل اور شریک میرے نزدیک مجاہد سے اچھے راوی ہیں۔“

(تاریخ ابن معین: 3056)

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد کو ایک مقام پر ”ثقة“ بھی کہا ہے۔

(تاریخ یحییٰ بن معین بروایۃ العباس الدوري: 1277)

امام صاحب کا توثیق والا قول جمہور کے بھی اور ان کے اپنے قول کے بھی خلاف ہے، لہذا جمہور کے موافق قول لیا جائے گا۔

⑨ امام، ابو سعید، یحییٰ بن سعید، قطان رحمۃ اللہ علیہ (120-198 ھ) فرماتے ہیں:

”مِيرَادِلُ اس کے بارے میں صاف نہیں۔“  
فِي نَفْسِي مِنْهُ شَيْءٌ .

(الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: 361/8، وسنده صحيح)

امام یحییٰ بن سعید قطان رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن سعید سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟



انہوں نے بتایا کہ میں وہب بن جریر کے پاس سیرت لکھنے جا رہا ہوں، جو مجالد سے مروی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

تَكْتُبُ كَذِبًا كَثِيرًا، لَوْ شِئْتَ أَنْ يَجْعَلَهَا لِي مُجَالِدٌ كُلُّهَا عَنِ الشَّعْبِيِّ  
عَنْ مَسْرُوقٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ فَعَلَ.

”آپ بہت سے جھوٹ لکھنے جا رہے ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ مجالد میرے لیے ان ساری سندوں کو شععی اور مسروق کے واسطے سے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تک پہنچا دے، تو وہ ایسا کر دے گا۔“ (الجرح والتعديل: 361/8، وسندہ صحیح)

مطلب یہ ہے کہ مجالد کا حافظہ اس حد تک بگڑ گیا تھا کہ وہ ”تلقین“ قبول کرنے لگا تھا، یعنی جب اسے کوئی من گھڑت سند بیان کر کے کہتا کہ اصل سند اس طرح ہے، تو وہ اسے تسلیم کر لیتا تھا۔

⑩ امام ابو حاتم رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا مجالد کی بیان کردہ حدیث کو دلیل بنایا جاسکتا ہے؟ تو فرمایا: نہیں، پھر فرمایا: وَلَيْسَ مُجَالِدٌ بِقَوِيِّ الْحَدِيثِ.  
”مجالد کی بیان کردہ حدیث قوی نہیں ہوتی۔“ (الجرح والتعديل: 362/8)

⑪ امام، ابو احمد، عبد اللہ، ابن عدی رضی اللہ عنہ (277-365ھ) فرماتے ہیں:  
أَكْثَرُ رَوَايَتِهِ عَنْهُ (الشَّعْبِيِّ)، وَعَامَّةُ مَا يَرْوِيهِ غَيْرُ مَحْفُوظٍ.  
”اس نے زیادہ روایات شععی کے واسطے سے بیان کی ہیں۔ اس کی بیان کردہ اکثر

روایات غیر محفوظ (منکر) ہیں۔“ (الكامل في ضعفاء الرجال: 423/6)

⑫ امام، ابو عیسیٰ، محمد بن عیسیٰ، ترمذی رضی اللہ عنہ (209-279ھ) فرماتے ہیں:

وَقَدْ ضَعَّفَ مُجَالِدًا بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ، وَهُوَ كَثِيرُ الْعَلَطِ.





”بعض اہل علم نے مجالد کو ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ بہت زیادہ غلطیاں کرتا ہے۔“

(سنن الترمذی، تحت الحديث: 648)

نیز فرماتے ہیں: وَقَدْ تَكَلَّمَ بَعْضُهُمْ فِي مُجَالِدِ بْنِ سَعِيدٍ مِنْ قَبْلِ حِفْظِهِ. ”بعض اہل علم نے حافظ کی خرابی کی بنا پر مجالد پر کلام کی ہے۔“

(سنن الترمذی، تحت الحديث: 1172)

۱۳ امام، ابوبکر، محمد بن حسین، بیہقی رحمہ اللہ (384-458ھ) فرماتے ہیں:

غَيْرُ مُحْتَجِّ بِهِ. ”اس کی بیان کردہ حدیث سے دلیل نہیں لی جاسکتی۔“

(السنن الكبرى للبيهقي: 128/8)

۱۴ علامہ، علی بن احمد، ابن حزم رحمہ اللہ (384-456ھ) کہتے ہیں:

ضَعِيفٌ. ”یہ ضعیف راوی ہے۔“ (المحلی بالآثار: 62/3)

نیز فرماتے ہیں: هَالِكٌ. ”سخت ضعیف ہے۔“ (المحلی: 429/10)

۱۵... ۱۹ حافظ منذری (مختصر سنن أبي داود: 256/6)، حافظ بوصری (اتحاف

الخيرة المهرة: 45)، علامہ ابن ملقن (البدر المنير: 391/9)، حافظ ابن حجر (فتح الباري:

480/9) اور حافظ ابن کثیر (البداية والنهاية: 141/8) نے بھی اس کو ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔

لہذا حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (البداية والنهاية: 14/3) کا اس کی حدیث کی ایک سند کو

”حسن“ کہنا صحیح نہیں۔

۲۰ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مَشْهُورٌ، صَاحِبُ حَدِيثٍ،

عَلَى لَيْنٍ فِيهِ. ”مشہور محدث ہے، البتہ کمزور راوی ہے۔“

(میزان الاعتدال للذهبي: 438/3)



نیز فرماتے ہیں: لَيْسَ بِالْقَوِيَّ. ”قوی نہیں ہے۔“

(سير أعلام النبلاء للذهبي: 146/2)

اتنی جروح کے بعد اب مجاہد کے بارے میں ذکر کی گئی تو وثیقات بھی ملاحظہ فرمائیں:

## معدلین

① امام ابن شاہین رحمہ اللہ نے امام یحییٰ بن معین سے اس کا ”ثقة“ ہونا ذکر کیا ہے۔

(تاریخ الثقات: 1435)

اس کا جواب گزر چکا ہے کہ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کی یہ بات جمہور محدثین، نیز خود اپنی ہی جرح کے خلاف ہونے کی وجہ سے مرجوح ہے۔

② امام ابو عبد اللہ سفیان بن سعید، ثوری رحمہ اللہ (93-161ھ) فرماتے ہیں:

وَقَدْ تَكَلَّمَ النَّاسُ فِيهِ، وَبِخَاصَّةٍ يَحْيَىٰ بْنُ سَعِيدٍ، وَهُوَ ثَقَّةٌ.

”ائمہ دین نے اس پر جرح کی ہے، خصوصاً امام یحییٰ بن سعید نے، تاہم وہ ثقة ہے۔“

(المعرفة والتاريخ: 100/3)

③ امام، ابو یوسف، یعقوب بن سفیان، فسوی رحمہ اللہ (م: 277ھ) فرماتے ہیں:

وَأَمَّا مُجَالِدٌ وَالْأَجْلَحُ، فَقَدْ تَكَلَّمَ النَّاسُ فِيهِمَا، وَمُجَالِدٌ عَلَى كُلِّ

حَالٍ أَمْثَلُ مِنَ الْأَجْلَحِ.

”مجاہد اور اُجلح دونوں کے بارے میں محدثین کی جرح موجود ہے اور مجاہد ہر حال میں

اُجلح سے اچھا ہے۔“ (المعرفة والتاريخ: 83/3)

یاد رہے کہ اُجلح کندی جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ثقة“ ہے۔

اس کے بارے میں علامہ پیشی فرماتے ہیں: وَالْأَكْثَرُ عَلَى تَوْثِيقِهِ.



”اکثر محدثین کرام اس کی توثیق ہی کرتے ہیں۔“ (مجمع الزوائد: 1/189)

اس کی توثیق اور اس پر جرح کی حقیقت تفصیلاً جاننے کے لیے میرے مایہ ناز شاگرد اور اندوختہ سرمایہ، حافظ ابو یحییٰ نور پوری رحمۃ اللہ علیہ کی بیش قیمت کتاب ”صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنہ انکار حدیث (ص: 271-275)“ ملاحظہ فرمائیں۔

## نوٹ:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے مجالد کو ”صدوق“ کہنا ثابت نہیں۔

③ امام، ابو الحسن، احمد بن عبد اللہ، عجل رحمۃ اللہ علیہ (181-261 ھ) فرماتے ہیں:

جَائِزُ الْحَدِيثِ، حَسَنُ الْحَدِيثِ .

”اس کی حدیث درست اور حسن ہے۔“ (تاریخ الثقات: 460)

④ امام، ابو بسطام، شعبہ بن حجاج، عتقی رحمۃ اللہ علیہ (م: 160 ھ) نے الحسن بن علی

بن عاصم سے کہا: يَا حَسَنُ اسْتَخِرِ اللَّهَ، وَأَذِبرْ عَلَيَّ مُجَالِدٍ .

”حسن! اللہ سے خیر طلب کرو اور مجالد کے پاس جاؤ۔“

(الضعفاء الكبير للعقيلي: 232/4، وسنده حسن)

⑤ امام، ابو الحسن، علی بن عبد اللہ، مدینی رحمۃ اللہ علیہ (161-234 ھ) نے امام شععی رحمۃ اللہ علیہ

کے شاگردوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: مُجَالِدٌ فَوْقَ أَشْعَثَ بْنِ سَوَّارٍ،

فَوْقَ أَجْلَحَ الْكِنْدِيِّ . ”مجالد، اشعث بن سوار سے کم درجہ اور ارجح کندی سے بلند

درجہ ہے۔“ (المعرفة والتاريخ للفسوي: 1713، وسنده صحيح)

⑥ امام، ابو عبد اللہ، محمد بن مثنیٰ، بصری رحمۃ اللہ علیہ (118-215 ھ) فرماتے ہیں:

يُحْتَمَلُ حَدِيثُهُ لِصِدْقِهِ . ”اس کی سچائی کی بنا پر اس کی حدیث روایت

کی جائے گی۔“ (تہذیب التہذیب لابن حجر: 37/10)



**نوٹ:** امام مسلم رحمہ اللہ نے مجالد بن سعید سے اصول میں کوئی روایت نہیں لی۔ صحیح مسلم میں مجالد کی روایت متابعت میں (دوسرے راوی کے ساتھ ملا کر) ہے۔

### تنبیہ نمبر ①:

ابوسعید، عبد اللہ بن سعید، الشَّحْج، کندي (م: 257 ھ) کہتے ہیں:

ذَكَرَ رَجُلٌ عُثْمَانَ عِنْدَ مُجَالِدِ بْنِ سَعِيدٍ، فَقَالَ: مُجَالِدُ بْنُ سَعِيدٍ لَغْلَامُهُ: جُرَّهَ وَأَطْرَحَهُ فِي الْبُئْرِ.

”مجالد بن سعید کے پاس ایک آدمی نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا، تو وہ اپنے غلام سے کہنے لگا: اس کو پھینچ کر کنویں میں پھینک دو۔“ (الضعفاء الكبير للعقيلي: 234/4)

اس کی سند ”انقطاع“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، کیونکہ ابو سعید 257 ھ میں فوت ہوئے، جبکہ مجالد بن سعید 144 ھ میں فوت ہو گئے تھے۔ دونوں کا لقاء و سماع صرف ثابت ہی نہیں، بلکہ ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

هَذِهِ حِكَايَةٌ مُرْسَلَةٌ. ”یہ مرسل (منقطع) حکایت ہے۔“

(تاریخ الإسلام: 977/3، بتحقيق بشار)

امام عبد الرحمن بن مہدی کہتے ہیں:

”یحییٰ بن سعید اور ابو اسامہ کی مجالد سے بیان کردہ حدیث کچھ بھی نہیں، کیونکہ انہوں نے مجالد کے حافظے کی خرابی کے بعد اس سے بیان کیا ہے۔ البتہ شعبہ، حماد بن زید اور ہشیم کی حدیث صحیح ہے، کیونکہ وہ مجالد کا حافظہ خراب ہونے سے پہلے اس سے بیان کرتے ہیں۔“

(الجرح والتعديل: 361/8)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد آخری عمر میں حافظے کا بگاڑ ہے۔

**الحاصل:** مجالد بن سعید، کوئی راوی جمہور محدثین کے نزدیک ”ضعیف“ ہے۔



## قارئین کے سوالات

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

**سوال ① :** اگر کوئی رات کو وتر پڑھے بغیر سو گیا ہو اور جب نیند سے بیدار ہو

تو فجر طلوع ہو چکی ہو۔ وہ کیا کرے؟

**جواب :** فجر طلوع ہونے کے بعد ہی وتر ادا کر لیے جائیں، جیسا کہ سیدنا ابوسعید

خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ نَامَ عَنْ وَتْرِهِ، أَوْ نَسِيَهُ، فَلْيُصَلِّهِ إِذَا ذَكَرَهُ».

”جو شخص اپنے وتر سے سو جائے یا بھول جائے، تو جب (بیدار ہو یا جب) یاد آئے،

اسے ادا کر لے۔“

(سنن أبي داود: 1431، سنن الدار قطنی: 22/2، ح: 2621، المستدرک علی الصحیحین

للحاکم: 302/1، السنن الکبریٰ للبیہقی: 480/2، وسندہ صحیح)

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ حافظ

ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

حافظ نووی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ”صحیح“ کہا ہے۔ (خلاصۃ الأحکام: 1905)

**سوال ② :** بعض لوگ ماہِ رجب میں اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ اس کی شرعی

حیثیت کیا ہے؟

**جواب :** رجب کو زکوٰۃ کا مہینہ قرار دینا جائز نہیں، جیسا کہ علامہ ابنِ رجب رحمہ اللہ

(736-795ھ) فرماتے ہیں:

وَأَمَّا الزَّكَاةُ فَقَدْ اِعْتَادَ أَهْلُ هَذِهِ الْبِلَادِ إِخْرَاجَ الزَّكَاةِ فِي شَهْرِ رَجَبٍ، وَلَا أَصْلَ لِدُذَلِكَ فِي السُّنَّةِ، وَلَا عُرِفَ عَنْ أَحَدٍ مِنَ السَّلَفِ.

”زکوٰۃ کے بارے میں ان علاقوں کے لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ رجب کے مہینے میں زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ اس طریقہ کار کی کوئی دلیل سنت نبوی میں نہیں، نہ اسلاف امت میں سے کسی سے یہ منقول ہے۔“ (لطائف المعارف، ص: 120)

**سوال (۳):** ممنوعہ اوقات میں کوئی نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

**جواب:** تحیۃ المسجد، تحیۃ الوضوء، نماز طواف، اور نماز کسوف ایسی نمازیں ہیں، جو ایک سبب کے تحت ادا کی جاتی ہیں، ان نمازوں کی ادائیگی ممنوعہ اوقات میں جائز ہے۔ سبھی نمازیں نہی کے عمومی حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ مثال کے طور پر مسجد میں داخل ہونا تحیۃ المسجد کا سبب ہے، یعنی یہ سبھی نماز ہے، لہذا اسے ممنوع وقتوں میں بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ خطبہ جمعہ کے آغاز سے پہلے جتنی مرضی نفل نماز پڑھیں، لیکن جب امام خطبہ شروع کر دے، تو نماز ختم کر کے خطبہ سماعت کرنے کا حکم ہے۔ لیکن دوران خطبہ آنے والا شخص مسجد میں داخل ہونے پر اس ممنوع وقت میں بھی دو رکعتیں ادا کر کے بیٹھے گا، جیسا کہ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَقَدْ خَرَجَ الْإِمَامُ، فَلْيُصَلِّ رَكَعَتَيْنِ».

”جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن (مسجد میں) آئے اور امام (خطبہ کے لیے) نکل آیا ہو، تو وہ دو رکعتیں پڑھے (پھر خطبہ سننے بیٹھے)۔“

(صحیح البخاری: 1166، صحیح مسلم: 875)

شارح مسلم، حافظ نووی رحمہ اللہ ان احادیث کے عموم کے متعلق لکھتے ہیں:

وَالْمُسْتَنْبَطُ مِنْ هَذِهِ الْأَحَادِيثِ أَنَّ تَحِيَّةَ الْمَسْجِدِ لَا تُتْرَكُ فِي أَوْقَاتِ النَّهْيِ عَنِ الصَّلَاةِ، وَأَنَّهَا ذَاتُ سَبَبٍ، تُبَاحُ فِي كُلِّ وَقْتٍ، وَيُلْحَقُ بِهَا كُلُّ ذَوَاتِ الْأَسْبَابِ، كَقَضَاءِ الْفَائِتَةِ .

”ان احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ تحیۃ المسجد کو نماز کے ممنوعہ اوقات میں بھی نہیں چھوڑا جائے گا۔ یہ سبھی نماز ہے، جو ہر وقت جائز ہے۔ یہی حال باقی تمام سببی نمازوں کا ہے، جیسا کہ (عذر شرعی کے باعث) فوت ہو جانے والی نماز کی قضائی۔“

(شرح صحیح مسلم: 164/6)

❀ فقیر امت، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِبِلَالٍ، عِنْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ: «يَا بِلَالُ! حَدِّثْنِي بِأَرْجَى عَمَلٍ عَمَلْتَهُ فِي الْإِسْلَامِ، فَإِنِّي سَمِعْتُ دَفَّ نَعْلِكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ»، قَالَ: مَا عَمَلْتُ عَمَلًا أَرْجَى عِنْدِي أَنِّي لَمْ أَتَطَهَّرْ طَهُورًا، فِي سَاعَةِ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ، إِلَّا صَلَّيْتُ بِذَلِكَ الطَّهُورِ مَا كُتِبَ لِي أَنْ أَصَلِّيَ .

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر کے وقت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: بلال! مجھے وہ عمل بتائیے کہ اسلام لانے کے بعد جس کے سبب آپ کو رحمت الہی کی سب سے زیادہ امید ہو۔ میں نے جنت میں اپنے آگے آپ کے جوتوں کی چاپ سنی ہے۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے رحمت الہی کی سب سے زیادہ امید اس عمل سے ہے کہ میں نے دن یا رات، جس بھی وقت میں وضو کیا ہے، اس کے ساتھ جتنی مقدر میں تھی، اتنی نماز ضرور ادا کی ہے۔“

(صحیح البخاری: 1149، صحیح مسلم: 2458)

حافظ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے فوائد ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَفِيهِ فَضِيلَةُ الصَّلَاةِ عَقِبَ الْوُضُوءِ، وَأَنَّهَا سُنَّةٌ، وَأَنَّهَا تَبَاحٌ فِي أَوْقَاتِ النَّهْيِ؛ عِنْدَ طُلُوعِ الشَّمْسِ، وَاسْتِوَائِهَا، وَغُرُوبِهَا، وَبَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَالْعَصْرِ، لِأَنَّهَا ذَاتُ سَبَبٍ، وَهَذَا مَذْهَبُنَا.

”اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وضو کے بعد نماز (تحیۃ الوضو) کی ادائیگی فضیلت والا عمل ہے، یہ سنت نبوی ہے اور ممنوعہ اوقات میں، مثلاً طلوع آفتاب، زوال آفتاب، غروب آفتاب اور فجر و عصر کی نماز کے بعد بھی پڑھی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ سببی نماز ہے۔ یہی ہمارا مذہب ہے۔“ (شرح صحیح مسلم: 13/16)

✽ سیدنا ابوقادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ، فَلْيَرْكَعْ رَكَعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ».

”جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو، تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں ادا کرے۔“

(صحیح البخاری: 444، صحیح مسلم: 714)

✽ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! [أَوْ] يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ! إِنْ وَلَّيْتُمْ مِّنْ هَذَا الْأَمْرِ شَيْئًا، فَلَا تَمْنَعُوا أَحَدًا طَافَ بِهَذَا الْبَيْتِ، وَصَلَّى أَيْ سَاعَةً شَاءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ.

”اے بنو عبد المطلب (یا فرمایا: اے بنو عبد مناف! اگر تمہیں اس معاملے (بیت اللہ کے انتظام) میں سے کچھ سوچ دیا جائے، تو کسی کو اس کا طواف کرنے اور دن یا رات کے کسی بھی وقت میں نماز پڑھنے سے منع نہ کرنا۔“

(مسند الحمیدی: 561، سنن النسائی: 852، 2924، وسندہ صحیح، المعجم الكبير

للطبرانی: 128/11، ح: 11359، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے (1280، 2747) ”صحیح“ کہا ہے۔



✽ کسوف و خسوف کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«فَإِذَا رَأَيْتُمْ ذَٰلِكَ، فَادْعُوا اللَّهَ، وَكَبِّرُوا، وَصَلُّوا، وَتَصَدَّقُوا».

”جب تم یہ معاملہ دیکھو، تو اللہ سے دُعا کرو، اس کی کبریائی بیان کرو، نماز پڑھو اور

صدقہ کرو۔“ (صحیح البخاری: 1044، صحیح مسلم: 901)

ان تمام احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سببی نمازیں اوقاتِ ممنوعہ میں بھی ادا کی جا

سکتی ہیں۔

**سوال (۴):** کیا جنبی مرد اور حائضہ عورت میت کو غسل دے سکتے ہیں؟

**جواب:** آدمی حالتِ جنابت اور عورت حالتِ حیض میں میت کو غسل دے سکتے

ہیں، کیونکہ وہ دونوں نجس نہیں ہوتے، جیسا کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ جنبی تھے تو نبی کریم ﷺ نے

ان سے فرمایا: «إِنَّ الْمُسْلِمَ لَيْسَ بِنَجَسٍ».

”مسلمان نجس نہیں ہوتا۔“ (صحیح مسلم: 372، مسند أبي عوانة: 777، واللفظ له)

ایک دن نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: عائشہ!

مجھے کپڑا تو پکڑا دیں۔ سیدہ نے عرض کی: میں حائضہ ہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ حَيْضَتَكَ لَيْسَتْ فِي يَدِكَ».

”آپ کا حیض آپ کے ہاتھ میں تو نہیں ہے۔“ (صحیح مسلم: 299)

ثابت ہوا کہ جنبی اور حائضہ کا بدن نجس نہیں، بلکہ پاک ہوتا ہے۔ غسلِ میت سے

مقصود میت کی صفائی ستھرائی ہے۔ وہ جنبی اور حائضہ سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

امام، ابراہیم بن یزید، نخعی، تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

میری والدہ نے مجھے کبیر تابعی، علقمہ بن قیس رحمہ اللہ کے پاس بھیجا، تاکہ میں ان سے یہ

مسئلہ دریافت کروں: فَلَمْ يَرِ بِهِ بَأْسًا .  
 ”انہوں نے اس میں کوئی حرج خیال نہیں کیا۔“

(مصنّف ابن أبي شيبة: 237/3، وسندہ صحیح)

**تنبیہ:** امام حسن بصری اور امام ابن سیرین رحمہما جنبی اور حائضہ کا میت کو غسل

دینا مکروہ خیال کرتے تھے۔ (مصنّف ابن أبي شيبة: 248/3، وسندہ صحیح)

یہ امام حسن بصری اور امام ابن سیرین کا ذاتی اجتہاد ہے، جس پر کوئی دلیل نہیں۔  
 کراہت کے ثبوت پر شرعی دلیل درکار ہوتی ہے، لہذا یہ بات قابل التفات نہیں۔

واللّٰهُ اَعْلَمُ بالصواب!

**سوال ۵:** کیا میت نجس ہوتی ہے؟

**جواب:** مؤمن زندہ ہو یا میت، دونوں حالتوں میں نجس اور پلید نہیں ہوتا، جیسا کہ:

سید الفقہاء والمحدّثین، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں جنبی تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے بعد غسل کے لیے چلا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کہاں تھے؟ میں نے عرض کیا: میں جنبی تھا، اس لیے غسل کرنے چلا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«سُبْحَانَ اللَّهِ! إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجَسُ». «سبحان اللہ! مؤمن نجس نہیں ہوتا۔»

(صحیح البخاری: 285، صحیح مسلم: 371)

سیدنا سعد بن ابوقاص رضی اللہ عنہ نے سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو غسل دیا، تو فرمایا:

«وَلَوْ كَانَ نَجَسًا مَا غَسَلْتُهُ». «اگر یہ نجس ہوتے، تو میں انہیں غسل نہ دیتا۔»

(مصنّف ابن أبي شيبة: 267/3، وسندہ صحیح)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

لَا تَنْجَسُوا مِيتَكُمْ . ”اپنے مردوں کو پلید نہ کہو۔“

(مصنف ابن أبي شيبة: 266/3، وسنده صحيح)

نیز فرماتے ہیں: لَيْسَ عَلَيْكُمْ فِي غُسْلِ مِيتِكُمْ غُسْلٌ إِذَا غَسَلْتُمُوهُ، إِنَّ مِيتَكُمْ لَمَوْمِنٌ طَاهِرٌ وَلَيْسَ بِنَجَسٍ، فَحَسْبُكُمْ أَنْ تَغْسِلُوا أَيْدِيَكُمْ .

”تمہیں اپنی میتوں کو غسل دینے پر غسل نہیں کرنا پڑے گا، کیونکہ تمہاری میت مؤمن اور پاک ہوتی ہے، نجس نہیں ہوتی۔ تمہیں اپنے ہاتھ دھونا ہی کافی ہوگا۔“

(السنن الكبرى للبيهقي: 316/1، وسنده حسن)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ”صحیح“ کہا ہے۔ (تغليق التعليق: 461/2)

امام ابراہیم نخعی تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كَانُوا يَقُولُونَ: إِنْ كَانَ صَاحِبُكُمْ نَجَسًا، فَاغْتَسِلُوا مِنْهُ .

”صحابہ کرام فرمایا کرتے تھے کہ اگر تمہاری میت پلید ہے، تو اسے غسل دے کر خود بھی غسل کر لو (یعنی میت کو غسل دینے سے غسل فرض نہیں ہوتا)۔“

(مصنف ابن أبي شيبة: 267/3، وسنده صحيح)

**سوال ۶:** حالتِ قیام میں دونوں پاؤں کے درمیان چار انگلی کے فاصلہ کی کیا

حقیقت ہے؟

**جواب:** حالتِ قیام میں دونوں پاؤں کے درمیان چار انگلی کا فاصلہ رکھنا بدعت

ہے، شریعتِ اسلامیہ میں اس پر کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ دین سازی کی مذموم کوشش ہے۔

اصل بات یہ تھی کہ ہمارے رسول اکرم ﷺ نے باجماعت نماز میں صفوں کی دُستی

کے حوالے سے بہت تاکید فرمائی ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

أَقِيَمَتِ الصَّلَاةُ فَأَقْبَلَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: «أَقِيْمُوا صُفُوفَكُمْ، وَتَرَاصُّوا».

”نماز کی اقامت ہو گئی تھی، تو رسول اللہ ﷺ نے ہماری طرف توجہ کی اور ارشاد فرمایا:

اپنی صفوں کو درست کرو اور آپس میں گتہ متھ ہو جاؤ۔“ (صحیح البخاری: 719)

نبی اکرم ﷺ کی اس تعلیم کا جو مقصد صحابہ کرام نے سمجھا اور اسے اپنایا، وہ راوی حدیث، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ تھا:

وَكَانَ أَحَدُنَا يُلْزِقُ مَنْكِبَهُ بِمَنْكِبِ صَاحِبِهِ، وَقَدَمَهُ بِقَدَمِهِ.

”(آپ ﷺ کا یہ فرمان سن کر) ہم میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے کندھے سے

کندھا اور ٹخنے سے ٹخنا چپکا دیتا تھا۔“ (صحیح البخاری: 725)

نبی اکرم ﷺ کی اس تعلیم اور صحابہ کرام کے اس فہم و عمل کی پیروی تب ہی ممکن ہے، جب صف میں کھڑا ہر نمازی اپنے کندھوں کے برابر پاؤں کو کھولے، لیکن اگر ایک نمازی اپنے دونوں پاؤں کا درمیانی فاصلہ چار انگلی کے برابر رکھے گا، تو ساتھ والے کے پاؤں کے ساتھ پاؤں ملانا ممکن ہی نہیں رہے گا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جس طریقے سے سنت نبوی اور عمل صحابہ پر عمل ممکن نہیں، اسی کو مسنون قرار دے دیا گیا ہے۔

اس بارے میں فقہ حنفی کی معتبر ترین کتابوں میں لکھا ہے:

وَيُسَنُّ تَقْرِيجُ الْقَدَمَيْنِ فِي الْقِيَامِ قَدْرَ أَرْبَعِ أَصَابِعَ.

”حالتِ قیام میں دونوں قدموں میں چار انگلی کا فاصلہ رکھنا مسنون ہے۔“

(مراقی الفلاح مع حاشیة الطحطاوی، ص: 262، رد المحتار علی الدر المختار:

444/1، الفتاویٰ الہندیۃ المعروف بہ فتاویٰ عالمگیری: 73/1، نور الإيضاح، ص: 56، تبیین

الحقائق شرح کنز الدقائق: 114/1، إمداد الأحكام: 466/1، طبعة دارالعلوم کراتشی)

**الحاصل :**

یہ کہنا کہ حالتِ قیام میں مردوں اور عورتوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ دونوں قدموں کے درمیان بقدر چار انگشت فاصلہ رکھیں، بے بنیاد بات ہے۔ یہ فتویٰ نبی اکرم ﷺ کی صحیح احادیث، صحابہ کرام کے اجماعی تعامل اور فہم سلف کی مخالفت پر مبنی ہے۔

**سوال ④ :** کیا عورت چھوٹے بچے کو غسل دے سکتی ہے؟

**جواب :** عورت چھوٹے بچے کی میت کو غسل دے سکتی ہے، اس کی دلیل اجماع

امت ہے، جیسا کہ امام ابن منذر رحمہ اللہ (242-319ھ) فرماتے ہیں:

أَجْمَعَ كُلُّ مَنْ نَحْفَظُ عَنْهُ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ عَلَى أَنَّ الْمَرْأَةَ تَغْسِلُ الصَّبِيَّ الصَّغِيرَ .  
 ”جتنے بھی اہل علم ہمیں یاد ہیں، ان سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت چھوٹے بچے کو غسل دے سکتی ہے۔“

(الأوسط في السنن والإجماع والاختلاف: 338/5)

جب یہی مسئلہ امام محمد بن سیرین تابعی رحمہ اللہ سے پوچھا، تو انہوں نے فرمایا:

”لَا أَعْلَمُ بِهِ بَأْسًا .“  
 ”مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کوئی حرج ہو۔“

(مصنف ابن أبي شيبة: 251/3، وسنده صحيح)

**سوال ⑧ :** امام بھول جائے تو اسے لقمہ دینا کیسا ہے؟

**جواب :** امام کے بھولنے پر اسے لقمہ دینا جائز ہے، جیسا کہ:

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ وَسَلَّمَ

صَلَّى صَلَاةً، فَقَرَأَ فِيهَا، فَلَبَسَ عَلَيْهِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ: لِأَبِي: «صَلَّيْتَ

مَعَنَا؟» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَمَا مَنَعَكَ؟» .  
 ”نبی اکرم ﷺ نے ایک

نماز پڑھائی۔ آپ ﷺ اس میں قراءت کرتے ہوئے بھول گئے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے، تو سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا آپ نے ہمارے ساتھ نماز ادا کی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: پھر (لقمہ دینے سے) کس چیز نے منع کر دیا؟“

(سنن أبی داؤد: 907، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان (2242) اور حافظ نووی رحمہ اللہ (المجموع: 241/4) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

امام طبرانی رحمہ اللہ کی معجم کبیر (13216) اور مسند شامیین (771) میں بسند ”حسن“ یہ الفاظ بھی آتے ہیں: فَمَا مَنَعَكَ أَنْ تَفْتَحَ عَلَيَّ؟  
”مجھے لقمہ دینے سے آپ کو کس چیز نے روکا تھا؟“

ایک روایت یوں آتی ہے: «وَلَا تَفْتَحْ عَلَى الْإِمَامِ». ”امام کو لقمہ نہ دو۔“  
(مسند الإمام أحمد: 146/1، ح: 1244)

لیکن اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

- ① ابواسحاق سبیعی ”مدلس“ ہیں اور بصیغہ ”عن“ روایت کر رہے ہیں۔
  - ② حارث بن عبد اللہ اعمور جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“ ہے۔
- ✽ عامر بن سعد بکلی تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

كُنْتُ قَاعِدًا بِمَكَّةَ، فَإِذَا رَجُلٌ عِنْدَ الْمَقَامِ طَيِّبُ الرِّيْحِ يُصَلِّي، وَإِذَا رَجُلٌ قَاعِدٌ خَلْفَهُ يَلْقَنُهُ، فَإِذَا هُوَ عُثْمَانُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ.

”میں مکہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک عمدہ خوشبو والا شخص مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے بیٹھا ہوا ایک شخص اسے لقمہ دے رہا تھا۔ یہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔“

(السنن الكبرى للبيهقي: 212/3، وسندہ صحيح)

جلیل القدر تابعی، امام ثابت بن ابی شیبہؒ بیان کرتے ہیں:



كَانَ أَنَسٌ إِذَا قَامَ يُصَلِّي، قَامَ خَلْفَهُ غُلَامٌ مَعَهُ مُصْحَفٌ، فَإِذَا تَعَايَا فِي شَيْءٍ فَتَحَ عَلَيْهِ .  
”سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے، تو آپ کے پیچھے ایک غلام قرآن پاک لے کر کھڑا ہوتا۔ جب آپ کسی آیت میں بھولتے، تو غلام آپ کو لقمہ دے دیتا۔“ (السنن الکبریٰ للبیہقی: 212/3، وسندہ صحیح)

**سوال ۹:** بچوں کی صف کہاں ہونی چاہیے؟

**جواب:** سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ میں تمہیں نبی ﷺ کی نماز سکھاتا ہوں۔ انہوں نے اپنی قوم کو جو نماز پڑھائی، اس کی صف بندی یوں ہوئی تھی:

فَصَفَّ الرِّجَالَ فِي أَدْنَى الصَّفِّ، وَصَفَّ الْوِلْدَانَ خَلْفَهُمْ، وَصَفَّ النِّسَاءَ خَلْفَ الْوِلْدَانِ .  
”انہوں نے مردوں کو سب سے پہلی صف میں کھڑا کیا، بچوں کو ان کے پیچھے اور عورتوں کو بچوں کے پیچھے۔“

(مسند الإمام أحمد: 343/5، وسندہ حسن)

**سوال ۱۰:** حدیث میں وارد الفاظ «فِيهَا وَنِعْمَتٌ» کا کیا معنی ہے؟

**جواب:** حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (773-852ھ) لکھتے ہیں:

حَكَى الْأَزْهَرِيُّ أَنَّ قَوْلَهُ: «فِيهَا وَنِعْمَتٌ» مَعْنَاهُ: فَإِلَّا السُّنَّةَ أَخَذَ، وَنِعْمَتِ السُّنَّةِ، قَالَهُ الْأَصْمَعِيُّ، وَحَكَاهُ الْخَطَّابِيُّ أَيْضًا .

”ازہری نے بیان کیا کہ حدیث کے ان الفاظ کا معنی یہ ہے کہ اس شخص نے سنت پر

عمل کیا اور یہ سنت بہت عمدہ ہے۔ اس معنی کو اصمعی نے بیان کیا اور اسے خطابي نے بھی نقل کیا ہے۔“ (التلخیص الحبیر: 67/2، تحت الحدیث: 655)

**سوال ۱۱:** سیدنا عبداللہ بن مسعود کا قول [أَخْرَوْهُنَّ حَيْثُ أَخَّرَهُنَّ اللَّهُ] بلحاظ سند کیسا ہے؟

**جواب:** سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منسوب یہ قول بلحاظ سند ”ضعیف“ ہے۔

یہ معجم کبیر طبرانی (9/295، ح: 9484، 9/296، ح: 9485) میں ذکر ہوا ہے۔ اس کی سند میں (سلیمان بن مہران) اعمش اور (ابراہیم بن یزید) نخعی راوی دونوں ”مذلس“ ہیں اور بصیغہ ”عن“ روایت کر رہے ہیں۔ یہ مسلم اصول ہے کہ ”ثقة مذلس“ صحیح بخاری و مسلم کے علاوہ ”عن“ سے روایت کرے تو وہ ”ضعیف“ ہوتی ہے، تا وقتیکہ سماع کی تصریح مل جائے۔

**سوال ۱۲:** شرعی حدود کا نفاذ کون کرے گا؟

**جواب:** شرعی حدود کا نفاذ خلیفہ یا مسلمان حکمران کا کام ہے، عوام کو حدود نافذ

کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر یہ کام عوام اپنے ہاتھ میں لے لے، تو فساد فی الارض ہے اور اس کے بہت بھیاں تک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مشہور مفسر، علامہ قرطبی رحمہ اللہ، سورہ نور کی آیت نمبر ۵ کے تحت لکھتے ہیں:

لَا خِلَافَ أَنَّ الْمُخَاطَبَ بِهَذَا الْأَمْرِ الْإِمَامُ، وَمَنْ نَابَ مَنَابَةً.

”یہ اتفاقی بات ہے کہ اس حکم (شرعی حدود کے نفاذ) کا مخاطب خلیفہ اور اس کے قائم

مقام شخص (مسلمان حکمران) ہے۔“ (تفسیر القرطبی: 12/161)

نیز فرماتے ہیں: اِنْفَقَ اِثْمَةُ الْفَتَوَى عَلَى اَنَّهُ لَا يَجُوزُ لِاحِدٍ اَنْ يَقْتَصَّ



مِنْ أَحَدٍ حَقَّهُ دُونَ السُّلْطَانِ، وَلَيْسَ لِلنَّاسِ أَنْ يَقْتَصَّ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ .  
 ”تمام مفتیان ائمہ دین اس بات پر متفق ہیں کہ حکمران کو چھوڑ کر از خود کوئی کسی سے  
 اپنا قصاص نہیں لے سکتا۔ اسی طرح لوگوں کا ایک دوسرے سے قصاص لینا بھی جائز نہیں۔“  
 (تفسیر القرطبی: 256/2)

مشہور فلسفی، علامہ ابن رشد، قرطبی لکھتے ہیں:

وَأَمَّا مَنْ يُقِيمُ هَذَا الْحَدَّ، فَاتَّقُوا عَلَى أَنَّ الْإِمَامَ يُقِيمُهُ، وَكَذَلِكَ الْأَمْرُ  
 فِي سَائِرِ الْحُدُودِ .  
 ”رہا یہ مسئلہ کہ اس (شراب کی) حد کو کون قائم کرے؟ تو  
 مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حکمران ہی اس حد کو نافذ کر سکتا ہے۔ باقی شرعی حدود کا  
 بھی یہی معاملہ ہے۔“ (بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد: 233/2)

مصلحت کا یہی تقاضا ہے اور انسانیت کا اسی میں دفاع ہے کہ امام یا اس کا نائب ہی  
 حدود اللہ کا نفاذ کرے۔ نبی کریم ﷺ حدود کو نافذ فرمایا کرتے تھے، آپ ﷺ کے بعد خلفاء  
 راشدین کا یہی طریقہ رہا ہے۔ اس دور میں کسی اور کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں تھی۔

**سوال (۱۳):** اگر لڑکا بے نماز ہو، تو اس سے اپنی بیٹی کا رشتہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

**جواب:** رشتوں کے لین دین میں دین کو بنیاد بنانا چاہیے۔ اگر بیٹی صالحہ ہے، تو  
 اس کا شوہر بھی نیک و صالح ہونا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں دینی حوالے سے مناسبت  
 ضروری ہے۔ نماز چھوڑنا کفر ہے۔ بے نماز خیر سے محروم ہوتا ہے، لہذا اس سے ہرگز اپنی بیٹی  
 کا نکاح نہیں کرنا چاہیے، ورنہ اس کے بُرے نتائج کے منتظر رہیں۔

**سوال (۱۴):** بچوں کی شادی کب کرنی چاہیے؟

**جواب:** اسلامی معاشرے کی اصلاح و فلاح اور مسلمانوں کی خیر و بھلائی اسی میں

ہے کہ اولاد، خواہ بیٹا ہو یا بیٹی، جب بالغ ہو جائے، تو مناسب رشتہ ملتے ہی اس کی شادی کر دی جائے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بیان کرتی ہیں:

«تَخَيَّرُوا لِنُطْفِئُكُمْ، فَأَنْكِحُوا الْكَفَاءَ، وَتَزَوَّجُوا إِلَيْهِمْ».

”تم اپنی اولادوں کے لیے مناسب رشتوں کا انتخاب کرو، مناسب مردوں سے اپنی بیٹیوں کا نکاح کرو اور مناسب عورتوں سے اپنے بیٹوں کی شادی کرو۔“

(النفقة على العيال لابن أبي الدنيا: 130، تاريخ دمشق لابن عساكر: 84/15، وسنده حسن)

مناسبت کس چیز کا نام ہے؟ اس بارے میں محدث العصر، ناصر الدین، علامہ البانی رحمہ اللہ (م: 1420ھ) فرماتے ہیں:

وَلَكِنْ يَجِبُ أَنْ نَعْلَمَ أَنَّ الْكَفَاةَ إِنَّمَا هِيَ فِي الدِّينِ وَالْخُلُقِ فَقَطْ.

”یہ جاننا ضروری ہے کہ لڑکی اور لڑکے کی باہمی مناسبت صرف دین اور اخلاق میں

ہوتی ہے۔“ (سلسلة الأحاديث الصحيحة: 57/3، ح: 1067)

بد قسمتی سے لوگ دنیا کی خاطر آخرت کو برباد کر رہے ہیں۔ انہیں اولاد کی پرواہ نہیں، نوجوان نسل تباہ ہو گئی ہے۔ وہ مغربی تہذیب کی دلدادہ بن چکی ہے اور اسلام سے بیگانہ ہے۔ اگر بچوں کی بروقت شادی کر دی جائے، تو ان کو صحت و عافیت والی لمبی عمر نصیب ہو سکتی ہے اور یقیناً دین و دنیا کی بھلائیاں ان کا مقدر بنیں گی۔

**سوال (۱۵):** حرام خوری کی کیا سزا ہے؟

**جواب:** اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور مؤمن بندوں کو حلال اور طیب رزق

کھانے کا حکم فرمایا ہے۔ حرام خوری کبیرہ گناہ ہے۔ حرام خور کی دعا قبول نہیں ہوتی، نیز حرام خوری کا فرقہ موں کا شیوہ اور باعث لعنت کام ہے، جیسا کہ:

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:  
 «قَاتَلَ اللَّهُ الْيَهُودَ، إِنَّ اللَّهَ لَمَّا حَرَّمَ شُحُومَهَا جَمَلُوهُ، ثُمَّ بَاعُوهُ،  
 فَأَكَلُوا ثَمَنَهُ»۔  
 ”اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت فرمائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر  
 حرام جانوروں کی چربی حرام کی، تو انہوں نے اسے پگھلا کر بیچا اور اس کی قیمت کھانا شروع  
 کر دی۔“ (صحیح البخاری: 2236، صحیح مسلم: 1207)

رسول کریم ﷺ نے سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:  
 «يَا كَعْبُ بْنُ عُجْرَةَ! إِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ، النَّارُ  
 أَوْلَىٰ بِهِ»۔  
 ”اے کعب بن عجرہ! جو گوشت حرام سے پروان چڑھا ہو، یقیناً وہ جنت  
 میں داخل نہیں ہوگا۔ جہنم ہی اس کو زیادہ مناسب ہے۔“

(مسند الإمام أحمد: 321/3، وسنده حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (4514) نے ”صحیح“ اور امام حاکم رحمہ اللہ (422/4)  
 نے ”صحیح الاسناد“ کہا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

یہ حدیث سنن ترمذی (614، وسنده حسن) میں ان الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے:  
 «يَا كَعْبُ بْنُ عُجْرَةَ! إِنَّهُ لَا يَرَبُّو لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ، إِلَّا كَانَتْ النَّارُ  
 أَوْلَىٰ بِهِ»۔  
 ”اے کعب بن عجرہ! جو گوشت حرام سے پلا ہو، آگ ہی اس کی مستحق ہوگی۔“  
 اس حدیث کو امام ترمذی نے ”حسن“ قرار دیا ہے۔

**سوال (۱۶):** نماز کے بعد پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دعا پڑھنا کیسا ہے؟

**جواب:** نماز کے بعد پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دعا کرنا بدعت اور بے اصل عمل ہے،

اگرچہ اس کے بارے میں درج ذیل سخت ”ضعیف“ اور غیر ثابت روایت بھی وارد ہے:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز سے سلام پھیرنے کے بعد اپنا دایاں ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ کر یہ دعا پڑھتے تھے:

بِسْمِ اللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ، أَذْهَبَ عَنِّي الْهَمَّ وَالْحُزْنَ.  
 ”اس اللہ کے نام کے ساتھ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو رحمن و رحیم ہے۔ اے اللہ! میرے سارے دکھ درد و اور فرما دے۔“

(عمل اليوم والليلة لابن السني: 113، حلية الأولياء لأبي نعيم الأصفهاني: 301/2)

یہ جھوٹی سند ہے، کیونکہ اس میں سلام طویل راوی ”متروک“ ہے۔

(تقريب التهذيب لابن حجر: 2702)

دوسرا راوی زید غمی جمہور کے نزدیک ”ضعیف“ ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”يُضْعِفُ عِنْدَ الْجُمُهورِ“. یہ راوی جمہور محدثین کرام کے نزدیک

ضعیف ہے۔“ (نتائج الأفكار: 253)

حافظ بیہمی فرماتے ہیں: وَضَعَفَهُ الْجُمُهورُ.

”یہ راوی جمہور محدثین کرام کے فیصلے کے مطابق ضعیف ہے۔“

(مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: 110/10)

اس روایت کی ایک اور سند بھی ہے۔ (المعجم الأوسط للطبراني: 3178، الدعاء

للطبراني: 658، الكامل لابن عدي: 2084-2085/6، تاريخ بغداد للخطيب: 480/12)

لیکن اس میں کثیر بن سلیم، ابوسلمہ، مدینی راوی بھی سخت ”ضعیف“ ہے، اس روایت

سے ملتی جلتی ایک روایت تاریخ اسلم واسطی (161 ص) میں یوں آتی ہے:

جب نبی کریم ﷺ نماز سے سلام پھیرتے، تو اپنا دایاں ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ کر یوں

دعا فرماتے تھے: بِسْمِ اللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ،

الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، اللَّهُمَّ اذْهَبْ عَنِّي الْهَمَّ وَالْحُزْنَ.

”اس اللہ کے نام کے ساتھ، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو غیب و حاضر کو جاننے والا

اور رحمن و رحیم ہے۔ اے اللہ! غم اور پریشانی کو مجھ سے دُور فرما دے۔“

اس کی سند بھی سخت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

① عنبسہ بن عبد الواسطی کے حالاتِ زندگی نہیں مل سکے۔

② عمرو بن قیس تابعی ہیں اور وہ بلا واسطہ نبی کریم ﷺ سے بیان کر رہے ہیں،

لہذا یہ روایت ”مرسل“ ہونے کی وجہ سے بھی ”ضعیف“ ہے۔

اس روایت جیسی ایک اور روایت امام ابو نعیم اصبہانی کی اخبار اصفہان (2/104) میں

بھی آتی ہے۔ اس کی سند بھی موضوع (من گھڑت) ہے، کیونکہ اس میں داؤد بن مہر راوی

”متروک و کذاب“ ہے۔ نیز عباس بن رزین اسلمی کا بھی کوئی اتا پتا نہیں۔ یوں یہ روایت

اپنی جمیع سندوں کے ساتھ سخت ”ضعیف“ ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نماز کے بعد پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دُعا کرنا کسی صحیح حدیث سے

ثابت نہیں۔ دین صحیح حدیثوں کا نام ہے، لہذا یہ عمل بدعت ہے۔

**سوال (۱۷):** سیگی لگانے پر اُجرت لینا کیسا ہے؟

**جواب:** سیگی لگانے پر اُجرت لینا جائز ہے، جیسا کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ

سے سیگی لگانے کی اُجرت لینے کے بارے میں سوال ہوا، تو انہوں نے فرمایا:

اِخْتَجَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، حَجَمَهُ أَبُو طَيْبَةَ، وَأَعْطَاهُ

صَاعَيْنِ مِنْ طَعَامٍ، وَكَلَّمَ مَوَالِيَهُ، فَوَضَعُوا مِنْ خَرَا جِهِ، وَقَالَ: «إِنَّ أَمْثَلَ

مَا تَدَاوَيْتُمْ بِهِ الْحِجَامَةُ». ”رسول اللہ ﷺ نے سیگی لگوائی۔ آپ ﷺ کو

ابوطیبہ نے سیگی لگائی تھی۔ آپ ﷺ نے اسے اناج کے دو صاع (4200 گرام) عطا فرمائے، نیز اس کے مالکوں سے بات کی، تو انہوں نے ابوطیبہ کے خراج (واجب الادا مال) میں کچھ تخفیف کر دی۔ آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ سیگی سب سے بہترین علاج ہے۔“  
(صحیح البخاری: 2102، صحیح مسلم: 1577)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

حَجَمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَبْدَ لَبْنِي بَيَاضَةَ، فَأَعْطَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجْرَهُ، وَكَلَّمَ سَيِّدَهُ فَخَفَّفَ عَنْهُ مِنْ ضَرَبَتِهِ، وَلَوْ كَانَ سُحْتًا لَمْ يُعْطِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

”نبی کریم ﷺ کو بنو بیاضہ کے ایک غلام نے سیگی لگائی۔ آپ ﷺ نے اسے اجرت عطا فرمائی، نیز اس کے مالک سے بات کی، تو اس نے غلام کے ٹکس میں کمی کر دی۔ اگر یہ اجرت حرام ہوتی، تو نبی اکرم ﷺ اسے ہرگز نہ دیتے۔“ (صحیح مسلم: 1202)

ایک روایت میں ہے: وَلَوْ كَانَ حَرَامًا لَمْ يُعْطِهِ.

”اگر سیگی لگانے کی اجرت حرام ہوتی، تو آپ ﷺ اسے نہ دیتے۔“

(صحیح البخاری: 2103)

سنن ابوداؤد کی روایت (3423) میں الفاظ یہ ہیں:

وَلَوْ عَلِمَهُ حَبِيشًا لَمْ يُعْطِهِ.

”اگر آپ ﷺ اسے سمجھتے ہوتے تو اسے اجرت عطا نہ فرماتے۔“

**تنبیہ ①:** سیدنا حمیصہ بن مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے

سیگی لگانے کی اجرت کے بارے میں پوچھا، تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا۔ وہ بار

بار پوچھتے رہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا:  
«اعْلِفْهُ نَاضِحَكَ، أَوْ أَطْعِمْهُ رَقِيقَكَ».

”اس سے اپنے جانور کو چارہ دے یا اپنے غلام کو کھانا کھلا دے۔“

(مسند الحمیدی: 902، مسند الإمام أحمد: 43615، سنن أبي داود: 3422، سنن

الترمذی: 1277، سنن ابن ماجه: 2166، وسنده صحيح)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ”حسن صحیح“ اور امام ابن جارود رحمہ اللہ (583) نے  
”صحیح“ قرار دیا ہے۔

امام ابن حبان رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

وَلَوْ كَانَ كَسْبُ الْحَجَّامِ مِنْهُيَّا عَنْهُ، لَمْ يَأْمُرْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
إِطْعَامَ الْمَرْءِ رَقِيقَهُ مِنْهُ، إِذَا الرَّقِيقُ مُتَعَبِّدُونَ، وَمِنَ الْمُحَالِ أَنْ يَأْمُرَ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُسْلِمَ بِإِطْعَامِ رَقِيقِهِ حَرَامًا.

”اگر سیئگی لگانے والے کی کمائی ممنوع ہوتی، تو آپ ﷺ اس شخص کو اس کمائی سے  
اپنے غلاموں کو کھانا کھلانے کا حکم نہ دیتے، کیونکہ غلام بھی مکلف ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ نبی  
اکرم ﷺ کسی مسلمان کو یہ حکم فرمائیں کہ وہ اپنے غلاموں کو حرام کا مال کھلائے۔“

(صحیح ابن حبان: 559/1، تحت الحديث: 5154)

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَقَدْ رَخَّصَ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ  
أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَغَيْرِهِمْ فِي كَسْبِ الْحَجَّامِ، وَهُوَ  
قَوْلُ الشَّافِعِيِّ.

”صحابہ کرام اور دیگر اہل علم میں سے بعض نے سیئگی لگانے

والے کو اجرت لینے کی اجازت دی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی فتویٰ ہے۔“

(سنن الترمذی، تحت الحديث: 1278)

امام اندلس، حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ (368-463ھ) فرماتے ہیں:

فَهَذَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ نَزَهُهُمْ عَنْ أَكْلِهِ، وَلَوْ كَانَ حَرَامًا لَمْ يَأْمُرْهُمْ أَنْ يُطْعِمُوهُ رَقِيقَهُمْ، لِأَنَّهُمْ مُتَعَبِدُونَ فِيهِمْ كَمَا تَعَبَدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ.

”یہ حدیث بتاتی ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا کہ سیگی کی کمائی کھانے سے بچنا بہتر ہے۔ اگر یہ حرام ہوتی تو آپ ﷺ انہیں یہ حکم نہ دیتے کہ وہ یہ کمائی اپنے غلاموں کو کھلا دیں، کیونکہ وہ جس طرح اپنے بارے میں مکلف ہیں، اسی طرح غلاموں کے بارے میں مکلف ہیں۔“ (التمہید لما فی المؤطا من المعانی والأسانید: 225/2)

**تنبیہ ۲:** سیدنا ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک غلام خریدا، جو سیگی لگانا جانتا

تھا۔ انہوں نے اس کی سینگیاں توڑنے کا حکم دیا۔ جب اس بارے میں پوچھا گیا، تو فرمایا:

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ ثَمَنِ الدَّمِّ.  
”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے خون کی قیمت لینے سے منع فرمایا ہے۔“

(صحیح البخاری: 2238)

شارح صحیح بخاری، علامہ ابن بطال رحمہ اللہ، (م: 449) فرماتے ہیں:

وَأِنَّمَا فَعَلَ ذَلِكَ عَلَى سَبِيلِ التَّوَرُّعِ وَالتَّنْزُّهِ.

”انہوں نے یہ کام ورع و تقویٰ کی بنا پر کیا تھا۔“ (شرح صحیح البخاری: 220/6)

**تنبیہ ۳:** سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے

رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«شَرُّ الْكَسْبِ مَهْرُ الْبَغِيِّ، وَثَمَنُ الْكَلْبِ، وَكَسْبُ الْحَجَّامِ».

”فاحشہ کی روزی، کتے کی قیمت اور سیگی لگانے والے کی کمائی، بدترین کمائی ہے۔“

(صحیح مسلم: 1568)



ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: كَسْبُ الْحَجَّامِ خَبِيثٌ.

”سینگی لگانے والے کی کمائی خبیث (گھٹیا) ہوتی ہے۔“ (صحیح مسلم: 1568)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مِنَ السُّحْتِ كَسْبُ الْحَجَّامِ، وَتَمَنُّ الْكَلْبِ، وَمَهْرُ الْبَغِيِّ».

”سینگی لگانے والے کی کمائی گھٹیا، کتے کی قیمت اور فاحشہ کی روزی حرام ہے۔“

(مستخرج أبي عوانة: 5288، شرح مشكل الآثار: 81/12، ح: 4661، وسنده صحيح)

اکثر اہل علم کے مطابق سینگی کے بارے میں یہ بیان کراہتِ تنزیہی پر محمول ہے، کیونکہ خود نبی اکرم ﷺ نے سینگی لگوانے کی اجرت ادا کی اور صحابی سے فرمایا کہ یہ کمائی اپنے غلاموں کو کھلا دیا اس سے اپنے جانوروں کو چارہ ڈال دو۔ رہی کتے کی قیمت اور زانیہ کی روزی، تو یہ دونوں حرام ہیں۔ اگرچہ ان سب چیزوں کا ایک دوسرے پر عطف ڈالا گیا ہے، لیکن امام ابن عبد البر رحمہ اللہ (368-463ھ) فرماتے ہیں: قَدْ يُعْطَفُ الشَّيْءُ عَلَى الشَّيْءِ وَحُكْمُهُ مُخْتَلِفٌ. ”کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز کا دوسری پر

عطف کیا جاتا ہے، لیکن دونوں کا حکم مختلف ہوتا ہے۔“ (التمہید: 227/2)

امام، سلیمان بن طرخان، تیمی، تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

قُلْتُ لِعَكْرِمَةَ: لِمَ كُرِهَ كَسْبُ الْحَجَّامِ؟ قَالَ: لَا يُكْرَهُ.

”میں نے امام عکرمہ تابعی رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ سینگی لگانے والے کی کمائی کیوں مکروہ

ہے؟ انہوں نے فرمایا: مکروہ نہیں ہے۔“ (مصنف ابن أبي شيبة: 263/6، وسنده صحيح)

کوفہ میں سینگی لگانے والے زید، ابواسامہ بیان کرتے ہیں:

سَأَلْتُ سَالِمًا (ابْنَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ) وَالْقَاسِمَ (ابْنَ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي

بُكَرِ الصِّدِّيقِ) فِي كَسْبِ الْحَجَّامِ، فَلَمْ يَرِ يَا بِهِ بَأْسًا .

”میں نے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیٹے امام سالم رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے امام قاسم رضی اللہ عنہ سے سیکنگی لگانے والے کی کمائی کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے اس میں کوئی حرج خیال نہیں کیا۔“ (مصنّف ابن أبي شيبة: 263/6، 264، وسنده صحيح)

الحاصل پچھنا یا سیکنگی لگانا اور اس پر اُجرت لینا دینا جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

**سوال ۱۸):** کیا نبی اکرم ﷺ کے والدین کو دوبارہ زندہ کیا گیا تھا؟

**جواب :** نبی اکرم ﷺ کے والدین کا دوبارہ زندہ ہونا ثابت نہیں۔ اس کے

متعلق ایک جھوٹی روایت پیش کی جاتی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے منسوب ہے کہ:

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزَلَ إِلَى الْحَجُونِ كَنِيًّا حَزِينًا، فَأَقَامَ بِهِ مَا شَاءَ رَبُّهُ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ رَجَعَ مَسْرُورًا، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، نَزَلْتَ إِلَى الْحَجُونِ كَنِيًّا حَزِينًا، فَأَقَمْتَ بِهِ مَا شَاءَ اللَّهُ، ثُمَّ رَجَعْتَ مَسْرُورًا، قَالَ: «سَأَلْتُ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ، فَأَحْيَا لِي أُمِّي، فَأَمَنْتُ بِهَا، ثُمَّ رَدَّهَا» .

”رسول اللہ ﷺ غم اور پریشانی کی حالت میں مقامِ حجّون کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں جتنی دیر اللہ نے چاہا، قیام فرمایا، پھر خوش و خرم واپس پلٹے۔ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا معاملہ ہے کہ آپ مقامِ حجّون کی طرف غم و پریشانی کی حالت میں تشریف لے گئے تھے، پھر جتنی دیر اللہ نے چاہا آپ نے قیام فرمایا، پھر آپ خوش و خرم لوٹ آئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے دُعا کی۔ اس نے میرے لیے میری والدہ کو زندہ کر دیا، وہ مجھ پر ایمان لے آئیں، پھر اللہ نے انہیں فوت



کر دیا۔“ (ناسخ الحديث ومنسوخه لابن شاهين : 656، السابق واللاحق للخطيب : 283/1،

284، الموضوعات لابن الجوزي : 283/1، اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة

للسيوطي : 244/1، الأباطيل والمناكير والصحاح والمشاهير للجورقاني : 207)

یہ روایت جھوٹی ہے، کیونکہ :

① اس کے مرکزی راوی ابو غزیہ، محمد بن یحییٰ، زہری کے بارے میں :

۱۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : يَضَعُ .

”یہ حدیثیں گھڑا تھا۔“ (الضعفاء والمتروكون : 482)

۲۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں : وَالْمَتَّهِمُ بِهِ هُوَ .

”اس حدیث کو اسی نے گھڑا ہے۔“ (لسان الميزان : 91/4)

اس کے بارے میں ادنیٰ کلمہ تو شیع بھی ثابت نہیں۔

② اس کے ایک راوی محمد بن حسن بن زیاد، ابو بکر، نقاش کے بارے میں :

۱۔ حافظ ابو بکر برقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : كُلُّ حَدِيثِهِ مُنْكَرٌ .

”اس کی بیان کردہ ساری حدیثیں منکر ہیں۔“ (تاریخ بغداد للخطيب : 205/2)

۲۔ خود خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : وَفِي أَحَادِيثِهِ مَنَاقِيرٌ بِأَسَانِيدَ

مَشْهُورَةٍ . ”اس کی بیان کردہ احادیث مشہور سندوں کے ساتھ منکر روایات ہیں۔“

(تاریخ بغداد : 202/2)

۳۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : الَّذِي وَضَحَ لِي أَنَّ هَذَا

الرَّجُلَ مَعَ جَلَالَتِهِ وَنُبْلِهِ مَتْرُوكٌ، لَيْسَ بِثِقَةٍ .

”جو بات مجھ پر واضح ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ شخص اپنی جلالت و شوکت کے باوجود

متروک ہے، لقمہ نہیں۔“ (تاریخ الإسلام: 36/8، بتحقیق الدكتور بشار)

\* حافظ، مقرئ، ابو عمرو، عثمان بن سعید بن عثمان، دانی رحمہ اللہ (م: 444ھ) کا اُس کی شہادت کو مقبول قرار دینا صحیح نہیں۔

✽ امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی سند میں ابو العلاء، محمد بن علی، قاضی کو حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (میزان الاعتدال: 654/3)

اس سند کے دوسرے راوی ابو طالب، عمر بن ربیع، خثاب کے بارے میں حافظ ذہبی فرماتے ہیں: إِنَّهُ كَذَّابٌ. ”یہ کذاب ہے۔“ (میزان الاعتدال: 196/3)

اس سند کے تیسرے راوی علی بن احمد، کعمی [ابو القاسم، علی بن ایوب، کعمی] کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بَصَرِيٌّ مُتَّهَمٌ.

”یہ بصرہ کا رہنے والا راوی ہے، اس پر حدیث گھڑنے کا الزام ہے۔“

(لسان المیزان: 192/4)

اس کا چوتھا راوی احمد بن یحییٰ ”مجهول“ ہے۔

یوں یہ روایت من گھڑت اور خود ساختہ ہے۔

اب اس روایت کے بارے میں ائمہ دین اور محدثین کرام کے تبصرے ملاحظہ فرمائیں:

① اس روایت کو امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ”منکر و باطل“ قرار دیا ہے۔

(لسان المیزان لابن حجر: 91/4)

② حافظ ابن الجوزی اپنے استاذ ابو فضل ناصر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

هَذَا حَدِيثٌ مَوْضُوعٌ. ”یہ حدیث من گھڑت ہے۔“ (الموضوعات: 284/1)

③ خود حافظ ابن الجوزی فرماتے ہیں:

هَذَا حَدِيثٌ مَوْضُوعٌ بِلَا شَكٍّ، وَالَّذِي وَضَعَهُ قَلِيلُ الْفَهْمِ، عَدِيمٌ

الْعِلْمُ، إِذْ لَوْ كَانَ لَهُ عِلْمٌ لَعَلِمَ أَنَّ مَنْ مَاتَ كَافِرًا لَا يَنْفَعُهُ أَنْ يُؤْمِنَ بَعْدَ  
الرَّجْعَةِ، لَا بَلْ لَوْ آمَنَ عِنْدَ الْمَعَايِنَةِ لَمْ يَنْتَفِعْ، وَيَكْفِي فِي رَدِّ هَذَا  
الْحَدِيثِ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ﴾، وَقَوْلُهُ فِي الصَّحِيحِ:  
اسْتَأْذَنْتُ رَبِّي أَنْ أَسْتَغْفِرَ لِأَبِي، فَلَمْ يَأْذَنْ.

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حدیث من گھڑت ہے۔ جس شخص نے اسے گھڑا ہے، وہ  
کم عقل اور علم سے کورا تھا۔ اگر اس کے پاس علم ہوتا، تو اسے ضرور معلوم ہوتا کہ جو شخص کفر  
کی حالت میں فوت ہو جائے، اس کو دنیا میں دوبارہ لوٹائے جانے کے بعد ایمان کوئی فائدہ  
نہیں دے گا، بلکہ اگر وہ ملک الموت کو دیکھنے کے وقت بھی ایمان لے آئے، تو اس کے لیے  
مفید نہیں۔ اس من گھڑت حدیث کے رد میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہی کافی ہے: ﴿فَيَمُتْ  
وَهُوَ كَافِرٌ﴾ (البقرة 2: 217) (جو کفر کی حالت میں مر جائیں [وہ ہمیشہ کے جہنمی ہیں])۔  
اسی طرح صحیح مسلم (976) میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: میں نے اپنے رب سے اپنے  
والد کے لیے دُعائے مغفرت کی اجازت طلب کی، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اجازت نہیں دی۔“  
(الموضوعات: 284/1)

③ حافظ سیہلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بِسْنَدٍ فِيهِ مَجْهُولُونَ.

”یہ ایسی سند سے مروی ہے، جس میں کئی مجہول راوی موجود ہیں۔“

(الروض الأنف: 187/2)

⑤ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حَدِيثٌ مُنْكَرٌ.

”یہ منکر حدیث ہے۔“ (لسان المیزان لابن حجر: 305/4)

⑥ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فَإِنَّ هَذَا الْحَدِيثَ كَذِبٌ،

لَمَّا صَحَّ مِنْ أَنَّهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ اسْتَأْذَنَ رَبَّهُ فِي الْإِسْتِغْفَارِ لَهَا، فَلَمْ يَأْذُنْ لَهُ (صحیح مسلم: 976)۔  
 ”یہ جھوٹی حدیث ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے

ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے رب سے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی اجازت چاہی، تو اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی [صحیح مسلم: 976]۔“ (میزان الاعتدال: 684/2)

④ حافظ سیوطی نے اس کی سند کو ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (الحاوی للفتاوی: 230/2)  
 نیز لکھا ہے: هَذَا الْحَدِيثُ ضَعِيفٌ بِاتِّفَاقِ الْمُحَدِّثِينَ .

”اس حدیث کے ضعیف ہونے پر محدثین کرام کا اتفاق ہے۔“ (ایضاً)

**فائدہ مهمہ :** حافظ ابن دحیہ کلبی (544-633ھ) کہتے ہیں :

إِنَّ الْحَدِيثَ فِي إِيمَانِ أُمِّهِ وَأَبِيهِ مَوْضُوعٌ، يَرُدُّهُ الْقُرْآنُ الْعَظِيمُ وَالْإِجْمَاعُ، قَالَ اللَّهُ الْعَظِيمُ: ﴿وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ (النساء 18: 4)، فَمَنْ مَاتَ كَافِرًا لَمْ يَنْفَعُهُ الْإِيمَانُ بَعْدَ الرَّجْعَةِ، بَلْ لَوْ آمَنَ عِنْدَ الْمُعَايَنَةِ لَمْ يَنْتَفِعْ، فَكَيْفَ بَعْدَ الْإِعَادَةِ ؟

”رسول اللہ ﷺ کے والدین کے (دوبارہ زندہ ہو کر) ایمان لانے والی روایت من گھڑت ہے۔ قرآن کریم اور اجماع امت اس کا رد کرتے ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے : ﴿وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ (النساء 4: 18) (اور [ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی] جو کفر کی حالت میں فوت ہوتے ہیں)۔ چنانچہ جو بھی شخص کفر کی حالت میں فوت ہو جاتا ہے، اسے مرنے کے بعد لوٹائے جانے پر ایمان لانا فائدہ نہیں دیتا، بلکہ اگر وہ ملک الموت کو دیکھنے کے بعد ایمان لائے، تو بھی اس کو کوئی فائدہ نہیں، چہ جائیکہ دوبارہ زندہ ہو کر ایمان لایا جائے۔“ (التذکرۃ بأحوال الموتی وأمور الآخرة للقرطبی، ص: 140)

حافظ ابن دحیہ کا رد کرتے ہوئے علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لَيْسَ إِحْيَاءُ هُمَا وَإِيمَانُهُمَا بِمُتَمَتِّعٍ عَقْلًا وَشَرْعًا.

”ان کا دوبارہ زندہ ہو کر ایمان لانا عقلی اور شرعی اعتبار سے ناممکن نہیں ہے۔“

(التذکرۃ، ص: 141)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے سنی مفسر، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَهَذَا كُلُّهُ مُتَوَقَّفٌ عَلَى صِحَّةِ الْحَدِيثِ، فَإِذَا صَحَّ فَلَا مَانِعَ مِنْهُ.

”یہ ساری بحث تو حدیث کی صحت پر موقوف ہے۔ اگر اس بارے میں مروی حدیث

صحیح ثابت ہو جائے، تو پھر واقعی یہ ممکن ہوگا (لیکن یہ روایت ہی من گھڑت ہے)۔“

(تفسیر ابن کثیر: 4/195)

الحاصل یہ جھوٹی روایت ہے، نیز قرآن کریم، صحیح احادیث اور اجماع امت کے بھی

خلاف ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے والدین کا دوبارہ زندہ ہونا قطعاً ثابت نہیں۔

**سوال ۱۸:** کیا حائضہ عورت قرآن کریم کی تلاوت سن سکتی ہے؟

**جواب:** جی ہاں! سن سکتی ہے، البتہ خود تلاوت نہیں کر سکتی۔

**سوال ۱۹:** کیا فتح مکہ کے موقع پر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے کعبہ کی چھت پر اذان

کہنا ثابت ہے؟

**جواب:** فتح مکہ کے موقع پر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے کعبہ کی چھت پر اذان کہنا

ثابت نہیں۔ اس بارے میں مروی روایات کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے منسوب ہے کہ:

أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِإِلَاءٍ، يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ، فَأَذَّنَ عَلَى

الْكَعْبَةِ . ”رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ والے دن سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا، تو

انہوں نے کعبہ کے اوپر اذان کہی۔“ (آتحاف المہرۃ لابن حجر: 4606)

**تبصرہ:** یہ جھوٹی روایت ہے، اس کو یحییٰ بن ہاشم، سمسار، کوفی راوی نے

گھڑا ہے۔ یہ ”کذاب“ اور ”وضاع“ ہے۔

② سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب روایت ہے کہ:

أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِإِلَاقَةٍ، فَرَقِيَ عَلَى ظَهْرِ الْكَعْبَةِ، فَاذَّنَ بِالصَّلَاةِ . ”رسول اللہ ﷺ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا، تو انہوں نے

کعبہ کی چھت پر چڑھ کر نماز کے لیے اذان کہی۔“

(مصنّف ابن أبي شيبة: 405/7، ح: 36919، أخبار مكة للفاكهي: 185)

**تبصرہ:** اس کی سند موسیٰ بن عبیدہ راوی کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔ یہ

راوی جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“ ہے۔

③ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک روایت یوں ہے:

وَأَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِإِلَاقَةٍ، فَاذَّنَ يَوْمَ الْفَتْحِ، فَوْقَ الْكَعْبَةِ . ”رسول اللہ ﷺ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا، تو انہوں نے فتح مکہ

والے دن کعبہ کی چھت پر اذان کہی۔“ (جامع معمر بن راشد: 19464)

**تبصرہ:** ابو قلابہ تابعی رضی اللہ عنہ کی سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ملاقات تک

نہیں ہوئی۔ یوں یہ روایت ”منقطع“ ہے۔

یہی روایت أحادیث إسماعیل بن جعفر (ح: 477 مختصراً) میں بیان ہوئی، تو اس

میں ابو قلابہ نے نَبَتْ (مجھے خبر دی گئی) کا لفظ بولا ہے۔ خبر دینے والا کون تھا؟ کچھ معلوم نہیں۔



④ ایک روایت یہ ہے:

جَاءَتِ الظُّهْرُ يَوْمَ الْفَتْحِ، فَأَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَلَّا أَنْ يُؤَدَّنَ بِالظُّهْرِ، فَوْقَ ظَهْرِ الْكُعْبَةِ .

”فتح مکہ والے دن جب ظہر کا وقت ہوا، تو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو کعبہ کی چھت پر ظہر کی نماز کے لیے اذان کہنے کا حکم فرمایا۔“ (أخبار مکه للأزرقي، ص: 274/1)

**تبصرہ:** یہ سخت ترین ”ضعیف“ روایت ہے۔ ایک تو محمد بن عمر واقدی

جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“ اور ”متروک“ راوی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے ”اشیاء“ نامعلوم ہیں۔

⑤ جویریہ بن اسماء ضعیفی کا بیان ہے:

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِهِنْدٍ يَوْمَ الْفَتْحِ : «كَيْفَ تَرَيْنَ الْإِسْلَامَ ؟» قَالَتْ : بِأَبِي وَأُمِّي ، مَا أَحْسَنَهُ لَوْ لَا ثَلَاثُ خِصَالٍ ؛ التَّجْبِيَةُ ، وَالْخِمَارُ ، وَزَقُوْهُ هَذَا الْعَبْدِ الْأَسْوَدِ فَوْقَ الْكُعْبَةِ ، فَقَالَ : «أَمَّا قَوْلُكَ : التَّجْبِيَةُ ، فَلَا صَلَاةَ إِلَّا بِرُكُوعٍ ، وَأَمَّا زَقُوْهُ هَذَا الْعَبْدِ الْأَسْوَدِ فَوْقَ الْكُعْبَةِ ، فَنَعَمْ عَبْدُ اللَّهِ هُوَ ، وَأَمَّا الْخِمَارُ ، فَأَيُّ شَيْءٍ أَسْتَرْتُ مِنَ الْخِمَارِ .

”نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ والے دن (سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی) سیدہ ہند رضی اللہ عنہا سے پوچھا: بتاؤ کہ اسلام کو کیسا پایا؟ وہ کہنے لگیں: میرے ماں باپ آپ پر قربان! بہت اچھا پایا، لیکن یہ تین باتیں نہ ہوتیں تو اور اچھا ہوتا؛ (رکوع میں) گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کا عمل، دوپٹہ اور کعبے کی چھت پر اس سیاہ غلام کا چیخنا (اذان کہنا)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: گھٹنوں پر

ہاتھ رکھنا تو اس لیے ضروری ہے کہ رکوع کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔ رہی بات اس غلام کی کعبہ کی چھت پر چڑھنے کی، تو یہ اللہ کا بندہ بہت اچھا ہے اور دوپٹے سے زیادہ پردے والی کون سی چیز ہے؟“ (تاریخ دمشق لابن عساکر: 182/70، 183)

**تبصرہ:** اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ جویرہ بن اسماء تبع تابعی ہیں اور بلا واسطہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کر رہے ہیں۔ یوں یہ روایت ”معصل“، یعنی سخت منقطع ہے۔

① ابن ابوملیکہ تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِإِلَاقَةٍ، يَوْمَ الْفَتْحِ، فَأَذَّنَ فَوْقَ الْكُعْبَةِ. ”رسول اللہ ﷺ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو فتح مکہ کے دن حکم فرمایا، تو انہوں نے کعبہ کی چھت پر اذان کہی۔“ (الطبقات الكبرى لابن سعد: 177/3، دلائل النبوة للبيهقي: 79/5، تاریخ دمشق لابن عساکر: 466/10)

**تبصرہ:** اس کی سند ”مرسل“ ہونے کی بنا پر ”ضعیف“ ہے۔ تابعی بلا واسطہ رسول اکرم ﷺ سے روایت کر رہے ہیں۔

④ عروہ بن زبیر تابعی رحمہ اللہ سے منسوب روایت ہے کہ:

إِنَّ بِلَالًا أَذَّنَ، يَوْمَ الْفَتْحِ، فَوْقَ الْكُعْبَةِ. ”سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے دن کعبہ کی چھت پر اذان کہی۔“

(مصنف ابن أبي شيبة: 407/7، ح: 36926)

**تبصرہ:** اس قول کی سند ابو خالد احمر کی ”تدليس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، نیز عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے سماع و لقاء کا مسئلہ بھی ہے۔

⑤ سعید بن مسیب تابعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ:

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْكُعْبَةَ، فَلَمْ يَزَلْ فِيهَا، حَتَّى حَضَرَتِ الظُّهْرُ، فَقَالَ: «يَا بِلَالُ! قُمْ، فَأَذِّنْ فَوْقَ الْكُعْبَةِ بِالصَّلَاةِ». ”رسول اللہ ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے، تو ظہر کے وقت تک اس میں رہے۔ پھر فرمایا: بلال! کھڑے ہو جائیے اور کعبہ کی چھت پر نماز کے لیے اذان کہیے۔“

(المغازي للواقدي: 737/2، دلائل النبوة للبيهقي: 328/4)

**تبصرہ:** اس کی سند سخت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ محمد بن عمر واقدی راوی جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“ اور ”متروک“ ہے۔ نیز سعید بن مسیب تابعی رحمہ اللہ بلا واسطہ نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں، یوں یہ روایت ”مرسل“ ہونے کی وجہ سے بھی ”ضعیف“ ہے۔

⑨ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے بعض لوگ بیان کرتے ہیں: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا دَخَلَ مَكَّةَ، أَمَرَ بِبِلَالٍ، فَعَلَا عَلَى الْكُعْبَةِ عَلَى ظَهْرِهَا، فَأَذَّنَ بِالصَّلَاةِ عَلَيْهَا. ”رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، تو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا۔ وہ کعبہ کی چھت پر چڑھے اور نماز کے لیے اذان کہی۔“ (السيرة النبوية لابن كثير: 575/3)

**تبصرہ:** اس روایت کو بیان کرنے والے بعض آل جبیر بن مطعم نامعلوم اور ”مجهول“ لوگ ہیں۔ نامعلوم لوگوں کی بیان کردہ باتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ امام ابو حاتم، محمد، ابن حبان رحمہم اللہ (م: 354ھ) نے کیا خوب فرمایا ہے:

وَالْإِعْتِبَارُ بِالْأَثَرِ بِرِوَايَةِ الْعُدُولِ وَالثِّقَاتِ، دُونَ الضُّعَفَاءِ وَالْمَجَاهِيلِ. ”ان آثار کا اعتبار کیا جائے گا، جو عادل اور ثقہ راویوں کے بیان کردہ ہوں۔ کمزور اور

مجهول راویوں کی بیان کردہ روایات کا کوئی اعتبار نہیں۔“ (الثقات: 278/8)

⑩ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے کہ:

فَرَّقِي بِلَالًا عَلَى ظَهْرِ الْكَعْبَةِ. ”بلال رضی اللہ عنہ کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے۔“

(أخبار مكة للفاكهي، ص: 186)

## تبصرہ:

یہ سخت ترین ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

① محمد بن عبدالعزیز بن عمر زہری راوی ”ضعیف، متروک، منکر الحدیث“ ہے۔

② احمد بن محمد بن عبدالعزیز ”مجهول“ ہے۔

③ ابن شہاب زہری ”مذلس“ ہیں۔

④ امام فاکھی رحمہ اللہ کے استاذ عبداللہ بن ابوسلمہ کی توثیق نہیں مل سکی۔

الحاصل اس مفہوم کی ساری روایات ”ضعیف“ ہیں۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا کعبہ کی چھت پر اذان کہنا کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

**سوال ۲۰:** کیا نماز جمعہ کے لیے چالیس یا پچاس افراد ضروری ہیں؟

**جواب:** نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے چالیس یا پچاس افراد ضروری نہیں، جن

روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے، ان کا تحقیقی جائزہ پیش خدمت ہے:

① سیدنا ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الْجُمُعَةُ عَلَى الْخَمْسِينَ رَجُلًا، وَلَيْسَ عَلَى دُونَ الْخَمْسِينَ جُمُعَةٌ».

”نماز جمعہ پچاس افراد پر فرض ہوتا ہے، پچاس سے کم افراد پر جمعہ فرض نہیں۔“

(سنن الدارقطني: 1580، الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي: 2/135، 136، ت: 335،

المعجم الكبير للطبراني: 244/8)

**تبصرہ :** یہ روایت سخت ترین ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس کا راوی جعفر بن

زبیر سخت ”ضعیف“ ہے۔ اس کے بارے میں امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

مَتْرُوكٌ . ”یہ متروک راوی ہے۔“ (سنن الدارقطني : 1580)

② سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک روایت یوں ہے :

عَلَى الْخَمْسِينَ جُمُعَةً . ”(کم از کم) پچاس آدمیوں پر جمعہ فرض ہے۔“

(سنن الدارقطني : 1581)

اس روایت کو بیان کرنے والا بھی وہی جعفر بن زبیر ہے، جس کا حال پچھلی روایت کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

الرُّوْيُ فِي هَذَا الْبَابِ حَدِيثٌ فِي الْخَمْسِينَ، لَا يَصَحُّ إِسْنَادُهُ . ”اس بارے میں پچاس آدمیوں والی ایک

حدیث مروی ہے۔ اس کی سند صحیح نہیں۔“ (السنن الكبرى للبيهقي : 179/3)

③ سیدنا جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے کہ :

مَضَتِ السَّنَةُ أَنَّ فِي كُلِّ ثَلَاثَةِ إِمَامًا، أَوْ فِي كُلِّ أَرْبَعِينَ فَمَا فَوْقَ ذَلِكَ جُمُعَةً، وَأَصْحَى وَفَطَرًا، وَذَلِكَ أَنَّهُمْ جَمَاعَةٌ .

”یہ سنت رائج رہی ہے کہ تین آدمیوں میں ایک امام ہوتا ہے یا ہر چالیس اور اس سے زیادہ لوگوں پر جمعہ وعیدین مشروع ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (کم از کم) اتنے لوگ

ہی جماعت کہلاتے ہیں۔“ (سنن الدارقطني : 1579، السنن الكبرى للبيهقي : 177/3)

**تبصرہ :** اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ عبد العزیز بن عبد الرحمن قریشی

راوی غیر ثقہ اور غیر معتبر ہے۔ اس کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

اَضْرَبَ عَلَىٰ أَحَادِيثِهِ، هِيَ كَذِبٌ، أَوْ قَالَ: مَوْضُوعَةٌ.

”اس کی بیان کردہ احادیث کو چھوڑ دو۔ وہ جھوٹی ہیں [یا فرمایا]، وہ من گھڑت ہیں۔“

(العلل بروایة عبد الله بن أحمد: 5419)

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے اپنی کتاب الضعفاء والمتروکون (350) میں ذکر کیا ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَهُوَ ضَعِيفٌ. ”یہ ضعیف راوی ہے۔“

(السنن الكبرى للبيهقي: 177/3)

نیز فرماتے ہیں: وَهَذَا حَدِيثٌ ضَعِيفٌ، لَا يَنْبَغِي أَنْ يُحْتَجَّ بِهِ.

”یہ حدیث ضعیف ہے۔ اسے دلیل بنانا جائز نہیں۔“ (معرفۃ السنن والآثار: 468/2)

④ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک جھوٹی روایت ہے کہ:

إِذَا بَلَغَ أَرْبَعِينَ رَجُلًا، فَعَلَيْهِمُ الْجُمُعَةُ.

”جب تعداد چالیس مردوں تک پہنچ جائے، تو ان پر جمعہ فرض ہو جاتا ہے۔“

(التلخیص الحبیر: 623)

**تبصرہ:** اس کو ذکر کرنے کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَلَا أَصْلَ لَهُ. ”یہ بے سرو پا روایت ہے۔“ (أَيْضًا)

⑤ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے منسوب روایت میں ہے:

لَا جُمُعَةٌ إِلَّا بِأَرْبَعِينَ. ”چالیس سے کم افراد پر جمعہ نہیں ہے۔“

(التلخیص الحبیر: 624)

اس کے بارے میں بھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بے سند روایت ہے۔

**فائدہ ①:** نبی اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل سیدنا اسعد بن



زُرارہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے نواحی علاقے میں جمعہ پڑھایا، وہ چالیس لوگ تھے۔

(سنن أبی داؤد: 1069، سنن ابن ماجہ: 1082، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن جبارود (291)، امام ابن خزمیہ (1724) اور امام ابن حبان (7013) رحمہم اللہ نے ”صحیح“ قرار دیا ہے، جبکہ امام حاکم رحمہ اللہ (281/1) نے اسے امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط پر ”صحیح“ کہا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

”اس کی سند حسن ہے۔“ (التلخیص الحبیر: 625)

اس حدیث کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ چالیس سے کم افراد جمعہ ادا نہیں کر سکتے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اشارہ فرمایا ہے۔ (ایضاً)

**فائدہ ۲:** ام عبد اللہ دوسیمہ رضی اللہ عنہا سے منسوب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الْجُمُعَةُ وَاجِبَةٌ عَلَى كُلِّ قَرْيَةٍ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيهَا إِلَّا أَرْبَعَةٌ».

”جمعہ کی ادائیگی ہر بستی پر فرض ہے، اگرچہ اس میں چار ہی آدمی ہوں۔“

(سنن الدارقطنی: 1592، السنن الکبریٰ للبیہقی: 179/3، مجمع الزوائد: 841/2)

اس روایت کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

① معاویہ بن یحییٰ مدنی راوی جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“ ہے۔

② معاویہ بن سعید تحبی کی سوائے امام ابن حبان رحمہ اللہ کے کسی نے توثیق نہیں

کی، لہذا ”مجهول الحال“ ہے۔

اس کی متابعت سنن دارقطنی (1593) میں ولید بن محمد موقری نے کی ہے۔ اس حدیث

کو درج کرنے کے بعد امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ولید ”متروک“ راوی ہے۔

## فائدہ (۳):

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ قول منسوب ہے:

أَوَّلُ مَنْ قَدِمَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ الْمَدِينَةَ مُصْعَبُ بْنُ عُمَيْرٍ، وَهُوَ أَوَّلُ مَنْ جَمَعَ بِهَا يَوْمَ جُمُعِهِمْ، قَبْلَ أَنْ يَقْدَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَصَلَّى بِهِمْ. ”سب سے پہلے جو مہاجرین مدینہ منورہ میں تشریف لائے، ان میں سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہی وہ پہلے شخص تھے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل جمعہ کے دن وہاں جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔“

(المعجم الكبير للطبراني 2/267، ح: 733، المعجم الأوسط للطبراني: 6294)

یہ روایت بھی ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

① صالح بن ابوالاخضر راوی جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“ ہے۔

حافظ بیہقی لکھتے ہیں: وَقَدْ ضَعَّفَهُ الْجُمُهورُ.

”اسے جمہور محدثین کرام نے ضعیف قرار دیا ہے۔“ (مجمع الزوائد: 150/2)

حافظ بوسیری لکھتے ہیں: لَيِّنَهُ الْجُمُهورُ.

”اسے جمہور محدثین کرام نے کمزور قرار دیا ہے۔“ (مصابح الزجاجة: 395)

② اس کی سند میں امام زہری کی ”تدلیس“ بھی موجود ہے۔

اس حدیث سے بھی کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جمعہ کے لیے افراد کی کوئی تعداد معین ہو، جس سے کم افراد جمعہ ادا نہ کر سکتے ہوں۔

اس سلسلے میں تمام اختلاف کرنے والوں کے سارے دلائل کو دیکھ کر حتمی فیصلہ کرتے

ہوئے علامہ، محمد بن علی، شوکانی رحمۃ اللہ علیہ (1173-1250ھ) فرماتے ہیں:

وَلَيْسَ عَلَى شَيْءٍ مِّنْهَا دَلِيلٌ يُسْتَدَلُّ بِهِ قَطُّ، إِلَّا قَوْلُ مَنْ قَالَ: إِنَّهَا



تَنْعَقِدُ جَمَاعَةُ الْجُمُعَةِ بِمَا تَنْعَقِدُ بِهِ سَائِرُ الْجَمَاعَاتِ .

”ان میں سے کسی بھی موقف پر کوئی قابل استدلال دلیل نہیں، البتہ یہ موقف دلائل سے مزین ہے کہ نماز جمعہ کی جماعت اتنے افراد کی موجودگی میں ہو جائے گی، جتنے افراد کی موجودگی میں باقی نمازوں کی جماعت ہو جاتی ہے۔ (السیل الجرار، ص: 182)

علامہ ابو عبد الرحمن، محمد ناصر الدین، البانی رحمۃ اللہ علیہ (1332-1420ھ) فرماتے ہیں:

هَذَا هُوَ الصَّوَابُ، إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى .

”یہی بات درست ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!“ (سلسلة الأحادیث الضعيفة: 1204)

**سوال (۲۱):** قرآن مجید کو بوسہ دینا کیسا ہے؟

**جواب:** جائز نہیں، کیونکہ قرآن وحدیث میں اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ سلف صالحین میں سے بھی کسی سے یہ عمل منقول نہیں، جیسا کہ شیخ الاسلام، ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الْقِيَامُ لِلْمُصْحَفِ وَتَقْيِيلُهُ؛ لَا نَعْلَمُ فِيهِ شَيْئًا مَّأْثُورًا عَنِ السَّلَفِ .

”قرآن کریم کے لیے قیام اور اس کو چومنے کے بارے میں سلف سے منقول کوئی روایت ہمارے علم میں نہیں۔“ (الفتاویٰ الكبرى: 49/1، مجموع الفتاویٰ: 65/23)

بعض لوگ حجر اسود کے بوسے پر قرآن مجید کے بوسے کو قیاس کرتے ہیں، لیکن ان کا یہ قیاس فاسد ہے، کیونکہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

لَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَكَ مَا قَبَّلْتُكَ .

”اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا، تو کبھی تجھے

بوسہ نہ دیتا۔“ (صحیح البخاری: 1610، صحیح مسلم: 1270)

ثابت ہوا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بوسہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں دیا تھا، نیز یہ بھی

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا کسی تعظیمی عمل کو سرانجام نہ دینا یا اس کی تعلیم نہ دینا اس کے غیر شرعی اور ناجائز ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔

علامہ ابو ولید، سلیمان بن خلف، باجی رحمہ اللہ (403-474ھ) لکھتے ہیں:

وَقَوْلُهُ: وَلَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْبَلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ، تَبَيَّنُ بَأَنَّ تَقْبِيلَهُ وَتَعْظِيمَهُ لَيْسَ لِذَاتِهِ، وَلَا لِمَعْنَى فِيهِ، وَإِنَّمَا هُوَ، لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَرَعَ ذَلِكَ طَاعَةً لِلَّهِ تَعَالَى .

”سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان کہ (اے حجر اسود!) اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا، تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا، واضح کرتا ہے کہ حجر اسود کا بوسہ اور اس کی تعظیم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے نہیں کی تھی، نہ ہی حجر اسود میں کوئی ذاتی کمال تھا، بلکہ یہ اس لیے کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مشروع کیا تھا۔“

(المنتقى شرح المؤطا: 287/2)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حجر اسود کو بوسہ دینے والی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَكَبَّ عَلَى الرُّكْنِ، فَقَالَ: إِنِّي لَأَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ، وَلَوْ لَمْ أَرِ حَبِيبِي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَكَ وَاسْتَلَمَكَ، مَا اسْتَلَمْتُكَ وَلَا قَبَّلْتُكَ، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ .

”سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حجر اسود پر جھکے اور فرمایا: میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، اگر میں نے اپنے محبوب ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے اور چومتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا، تو میں بھی تجھے نہ بوسہ دیتا نہ چومتا۔ تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ اسوۂ حسنہ ہیں۔“

(مسند الإمام أحمد: 1/21، وسنده حسن)

نبی اکرم ﷺ یا کسی صحابی یا تابعی سے حجر اسود کے علاوہ کسی بھی چیز کو تعظیماً بوسہ دینا قطعاً ثابت نہیں۔ قرآن کریم کو حجر اسود پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ قیاس جائز ہوتا، تو اسلاف امت اور محدثین کرام ایسا ضرور کرتے۔

صحابی رسول، سیدنا یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

طُفْتُ مَعَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، فَلَمَّا كُنْتُ عِنْدَ الرُّكْنِ الَّذِي يَلِي الْبَابَ مِمَّا يَلِي الْحَجَرَ، أَخَذْتُ بِيَدِهِ لِيَسْتَلِمَ، فَقَالَ: أَمَا طُفْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قُلْتُ: بَلَى، قَالَ: فَهَلْ رَأَيْتَهُ يَسْتَلِمُهُ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَانْفُذْ عَنْكَ، فَإِنَّ لَكَ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةً حَسَنَةً.

”میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ جب میں دروازے کے پاس حجر اسود کے ساتھ والے کونے تک پہنچا، تو میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ لیا تاکہ وہ اس کونے کو بوسہ دیں۔ وہ فرمانے لگے: کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ طواف کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، تو انہوں نے فرمایا: کیا آپ ﷺ کو اس کونے کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا: اسے چھوڑو، تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں اسوہ حسنہ ہے۔“ (مسند الإمام أحمد: 253، وسندہ حسن)

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

إِنَّهُ طَافَ مَعَ مُعَاوِيَةَ بِالْبَيْتِ، فَجَعَلَ مُعَاوِيَةُ يَسْتَلِمُ الْأَرْكَانَ كُلَّهَا، فَقَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ: لِمَ تَسْتَلِمُ هَذَيْنِ الرُّكْنَيْنِ؟ وَلَمْ يَكُنْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَلِمُهُمَا، فَقَالَ مُعَاوِيَةُ: لَيْسَ شَيْءٌ مِّنَ الْبَيْتِ مَهْجُورًا، فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾، فَقَالَ مُعَاوِيَةُ: صَدَقْتَ.

”انہوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کیا، تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سارے کونوں کو چومنے لگے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا: آپ ان دونوں کونوں کو کیوں چوم رہے ہیں؟ حالانکہ رسول اللہ ﷺ تو انہیں نہیں چوما کرتے تھے۔ اس پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: بیت اللہ کی کوئی چیز بھی چھوڑنے والی نہیں۔ یہ سن کر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں ہی اسوۂ حسنہ ہے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: آپ نے سچ فرمایا ہے۔“ (مسند الإمام أحمد 1/217، وسندہ حسن)

ثابت ہوا کہ حجر اسود پر کسی چیز کو قیاس کرتے ہوئے اسے تعظیماً بوسہ دینا جائز نہیں۔ صرف انہی چیزوں کو بطور تعظیم چوما جاسکتا ہے، جن کی مشروعیت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ شیخ الاسلام، ابو العباس، احمد بن عبد الحلیم، ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

وَكُلُّ مَنْ أَلْحَقَ مَنْصُوصًا بِمَنْصُوصٍ يُخَالِفُ حُكْمَهُ، فَقِيَاسُهُ فَاسِدٌ، وَكُلُّ مَنْ سَوَّى بَيْنَ شَيْئَيْنِ، أَوْ فَرَّقَ بَيْنَ الْاَوْصَافِ الْمُعْتَبَرَةِ فِي حُكْمِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ، فَقِيَاسُهُ فَاسِدٌ.

”جس نے بھی ایک منصوص چیز کو دوسری ایسی منصوص چیز کے ساتھ ملا دیا، جس کا حکم مختلف تھا، اس کا قیاس فاسد ہے۔ اسی طرح جس نے بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات میں بیان کردہ اوصاف کو مد نظر رکھے بغیر دو مختلف چیزوں کا حکم ایک کر دیا یا دو ایک حکم والی چیزوں کا حکم مختلف کر دیا، اس کا قیاس بھی فاسد ہے۔“ (مجموع الفتاویٰ: 287/9، 288)

علامہ، ابو عبد اللہ، محمد بن محمد بن محمد، ابن الحاج، مالکی رحمۃ اللہ علیہ (م: 737ھ) لکھتے ہیں:

وَلِأَجْلِ ذَلِكَ كَرِهَ عُلَمَاؤُنَا رَحْمَةُ اللَّهِ عَلَيْهِمُ التَّمَسُّحَ بِجِدَارِ الْكَعْبَةِ، أَوْ بِجُدْرَانِ الْمَسْجِدِ، أَوْ بِالْمُصْحَفِ، إِلَى غَيْرِ ذَلِكَ مِمَّا يُتَبَرَّكُ بِهِ، سَدًّا

لَهَذَا الْبَابِ، وَلِمُخَالَفَةِ السُّنَّةِ، لِأَنَّ صِفَةَ التَّعْظِيمِ مَوْقُوفَةٌ عَلَيْهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكُلُّ مَا عَظَّمَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعُظَّمُهُ وَنَتَّبِعُهُ فِيهِ، فَتَعْظِيمُ الْمُصْحَفِ قِرَائَتُهُ، وَالْعَمَلُ بِمَا فِيهِ، لَا تَقْبِيلُهُ وَلَا الْقِيَامُ إِلَيْهِ، كَمَا يَفْعَلُ بَعْضُهُمْ فِي هَذَا الزَّمَانِ، وَكَذَلِكَ الْمَسْجِدُ تَعْظِيمُهُ الصَّلَاةُ فِيهِ، لَا التَّمَسُّحُ بِجُذْرَانِهِ.

”اسی لیے ہمارے علماء کرام رحمہ اللہ نے کعبہ کی دیوار، مسجد کی دیواروں یا مصحف کے ساتھ اپنا جسم لگانے اور اس طرح کے دیگر کاموں کو مکروہ قرار دیا ہے، جو تبرک کی نیت سے کیے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد جہاں اس (غیر شرعی تبرک کے) دروازے کو بند کرنا ہے، وہاں سنت کی مخالفت (سے بچنا) بھی ہے، کیونکہ تعظیم کا طریقہ رسول اللہ ﷺ پر موقوف ہے۔ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے (جس طرح) قابل تعظیم قرار دیا ہے، ہم بھی آپ ﷺ کے طریقے کے مطابق اس کی تعظیم کریں گے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی (شرعی) تعظیم اس کی تلاوت اور اس کے احکامات پر عمل کرنے سے ہوگی، نہ کہ اس کے لیے قیام کر کے اور اس کو چوم کر، جیسا کہ موجودہ دور کے بعض لوگ کرتے ہیں۔ اسی طرح مسجد کی (شرعی) تعظیم اس میں نماز پڑھنا ہے، نہ کہ اس کی دیواروں کے ساتھ اپنا جسم رگڑنا۔“ (المدخل 1: 263)

بعض لوگ قرآن مجید کو بوسہ دینا سیدنا عمر، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما، سیدنا عمر بن عبدالعزیز اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن ایسا ہرگز ثابت نہیں، مدعی پر دلیل لازم ہے۔

باقی صحابی رسول سیدنا عکرمہ بن ابوجہل رضی اللہ عنہ کے متعلق مسند دارمی میں جو روایت آتی ہے، وہ ”منقطع“ ہونے کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔ ابن ابوملیکہ کی سیدنا عکرمہ رضی اللہ عنہ سے



ملاقات نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت میں بوسے کا ذکر نہیں، بلکہ قرآن کریم کو چہرے پر رکھنے کا ذکر ہے۔

الحاصل قرآن کریم کو بوسہ دینا یا اسے چہرے پر رکھنا بے اصل اور بدعت ہے۔ نہ قرآن و سنت میں اس کی کوئی دلیل ہے، نہ اسلاف امت نے ایسا کیا۔ ہر بھلائی سلف صالحین کی پیروی میں اور ہر شر سلف صالحین کی مخالفت میں ہے۔

**سوال (۲۲):** سجدہ شکر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

**جواب:** کسی مصیبت کے ٹل جانے، کسی بیماری سے شفا حاصل ہونے، کسی خوش خبری کے ملنے یا کسی بڑی نعمت کے نصیب ہونے پر سجدہ شکر کرنا مشروع و مستحب ہے، جیسا کہ:

سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، جو کہ غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور اس بنا پر ان سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے تھے، وہ بیان کرتے ہیں:

سَمِعْتُ صَوْتَ صَارِحٍ، أَوْفَى عَلَى جَبَلٍ سَلْعٍ، بِأَعْلَى صَوْتِهِ: يَا كَعْبُ ابْنَ مَالِكٍ! أَبْشِرْ، قَالَ: فَخَرَرْتُ سَاجِدًا، وَعَرَفْتُ أَنَّ قَدْ جَاءَ فَرَجٌ، وَأَذَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَوْبَةِ اللَّهِ عَلَيْنَا، حِينَ صَلَّى صَلَاةَ الْفَجْرِ، فَذَهَبَ النَّاسُ يُبَشِّرُونَنَا.

”میں نے جبل سلع پر چڑھ کر منادی کرنے والے شخص کو سنا، وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا: اے کعب بن مالک! خوش ہو جاؤ (کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی ہے)۔ میں سجدہ (شکر) میں گر گیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ خوش حالی آ گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھ کر اعلان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری توبہ قبول کر لی ہے۔ پھر لوگ ہمیں خوش

خبری دینے کے لیے آنے لگے۔“ (صحیح البخاری: 4418، صحیح مسلم: 2769)

سیدنا ابو بکرہ رضی اللہ عنہ، رسول اکرم ﷺ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

إِنَّهُ كَانَ إِذَا جَاءَهُ أَمْرٌ سُرُورٍ، أَوْ بُشْرَ بِهِ، خَرَّ سَاجِدًا، شَاكِرًا لِلَّهِ.

”بلاشبہ جب آپ ﷺ کے پاس کوئی خوشی والا معاملہ آتا یا آپ ﷺ کو خوش خبری دی جاتی، تو آپ ﷺ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدے میں گر جاتے۔“

(سنن أبي داود: 2774، سنن الترمذي: 1578، وقال: حسن، سنن ابن ماجه: 1394، وسنده حسن)

اس حدیث کا راوی بکار بن عبدالعزیز جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ثقة“ ہے۔

امام ابو عیسیٰ، محمد بن عیسیٰ، ترمذی رحمہ اللہ (209-279 ھ) اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

وَالْعَمَلُ عَلَى هَذَا عِنْدَ أَكْثَرِ أَهْلِ الْعِلْمِ، رَأَوْا سَجْدَةَ الشُّكْرِ.

”اکثر اہل علم کا اس حدیث پر عمل ہے۔ وہ سجدہ شکر کو مشروع سمجھتے ہیں۔“

احادیث مبارکہ، فعل صحابی اور اکثر اسلاف امت کے خلاف امام ابو حنیفہ کا موقف

بھی سنتے چلیں:

وَسَجْدَةُ الشُّكْرِ لَا عِبْرَةَ لَهَا عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى، وَهِيَ مَكْرُوهَةٌ عِنْدَهُ، لَا يُثَابُ عَلَيْهَا، وَتَرَكُوهَا أَوْلَى، وَقَالَ أَبُو يُوسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمَا اللَّهُ تَعَالَى: هِيَ قُرْبَةٌ، يُثَابُ عَلَيْهَا.

”امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سجدہ شکر کا کوئی اعتبار نہیں۔ ان کے نزدیک یہ سجدہ

مکروہ ہے، اس پر کوئی ثواب نہیں ملتا، بلکہ اس کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ اس کے برعکس امام

ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ نیکی کا کام ہے، اس پر ثواب ملتا ہے۔“

(الفتاویٰ الہندیۃ، المعروف بہ فتاویٰ عالمگیری: 1/135، 136، طبع دار الفکر، بیروت)

احناف مقلدین اس مسئلہ میں اپنے امام کے مذہب کے خلاف ابو یوسف اور محمد بن

حسن شیبانی کے مذہب کے مطابق فتویٰ دیتے ہوئے سجدہ شکر کو مشروع و مستحب قرار دیتے

ہیں اور یہی ان کے ہاں مفتی پہ قول ہے۔

اس کے باوجود جناب حسین احمد، مدنی، دیوبندی صاحب نے یہ لکھ رکھا ہے:

”ہم جیسے لوگوں کو نہ اختیار ہے اور نہ ہماری اس قدر سمجھ ہے کہ امام کے قول کو رد کریں۔“

(تقریر ترمذی، ص: 71)

**سوال (۲۳):** کیا فرض نماز کی آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ کسی اور

سورت کی قراءت بھی کی جاسکتی ہے؟

**جواب:** فرض نماز کی آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ بھی قراءت کی

جاسکتی ہے، جیسا کہ:

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقْرَأُ فِي صَلَاةِ الظُّهْرِ، فِي الرُّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ، فِي كُلِّ رُكْعَةٍ قَدْرَ ثَلَاثِينَ آيَةً، وَفِي الْأَخْرَيَيْنِ قَدْرَ خَمْسَ عَشْرَةِ آيَةً.

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سے ہر رکعت میں تقریباً تیس آیات کی

تلاوت فرماتے اور آخری دو رکعتوں میں تقریباً پندرہ آیات کی۔“ (صحیح مسلم: 452)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ فرض نماز کی آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ بھی کچھ پڑھنا سنت و مستحب ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نمازِ مغرب کی امامت کی، تو تیسری رکعت میں

آیت کریمہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا...﴾ (آل عمران 8) کی تلاوت فرمائی۔

(الموطأ للإمام مالك: 25، وسندہ صحیح)



نافع رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

كَانَ إِذَا صَلَّى وَحْدَهُ، يَقْرَأُ فِي الْأَرْبَعِ جَمِيعاً، فِي كُلِّ رَكْعَةٍ، بِأَمِّ الْقُرْآنِ وَسُورَةٍ مِّنَ الْقُرْآنِ، وَكَانَ يَقْرَأُ أحياناً بِالسُّورَتَيْنِ وَالثَّلَاثِ فِي الرُّكْعَةِ الْوَاحِدَةِ مِنْ صَلَاةِ الْفَرِيضَةِ، وَيَقْرَأُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ مِنَ الْمَغْرِبِ، كَذَلِكَ، بِأَمِّ الْقُرْآنِ وَسُورَةٍ سُورَةٍ.

”آپ رضی اللہ عنہ جب اکیلے نماز ادا کرتے، تو چاروں رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور قرآن کریم کی کوئی سورت پڑھتے۔ کبھی فرض نماز کی ایک رکعت میں دو دو، تین تین سورتیں بھی پڑھ لیتے تھے۔ مغرب کی دونوں رکعتوں میں اسی طرح سورہ فاتحہ اور ایک ایک سورت کی تلاوت فرماتے تھے۔“ (الموطأ للإمام مالک: 26، وسندہ صحیح)

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ فرض نماز کی آخری دو رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پر اکتفا کرنا بھی مسنون ہے۔ (صحیح مسلم: 451)

**سوال (۴۲):** جمعہ کی رات نمازِ عشاء کی پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری میں سورہ منافقون کی قراءت کرنا کیسا ہے؟

**جواب:** جمعہ کی رات نمازِ عشاء میں کوئی مخصوص قراءت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی طرف یہ روایت منسوب ہے کہ:

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي صَلَاةِ الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ، لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ، سُورَةَ الْجُمُعَةِ وَالْمُنَافِقِينَ.

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی رات عشاء کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون کی قراءت

فرماتے تھے۔“ (صحیح ابن حبان: 1841، السنن الكبرى للبيهقي: 201/3)

اس روایت کی سند سخت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس کے راوی سعید بن سماک بن حرب کو امام ابو حاتم رازی رحمہ اللہ نے ”متروک الحدیث“ قرار دیا ہے۔ (الجرح والتعديل: 32/4)

دوسری علت یہ ہے کہ سماک بن حرب اگرچہ ”ثقة“ ہیں، لیکن آخری عمر میں ان کا حافظہ بگڑ گیا تھا۔ سعید بن سماک ان لوگوں میں سے نہیں، جنہوں نے سماک بن حرب سے ان کے حافظے کی خرابی سے پہلے روایات سنی تھیں۔

ناصر السنة، علامہ البانی رحمہ اللہ اس حدیث کو ”ضعیف“ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

فَلَا يَثْبُتُ بِهِ الْإِسْتِحْبَابُ فَضْلًا عَنِ السُّنَنِ، بَلْ إِنَّ التَّرَامَ ذَلِكَ مِنَ الْبِدْعِ، وَهُوَ مَا يَفْعَلُهُ كَثِيرٌ مِّنْ أَيْمَةِ الْمَسَاجِدِ فِي دِمَشْقَ وَغَيْرِهَا، مِنَ الْبُلْدَانِ السُّورِيَّةِ، وَلَكِنَّهُمْ جَمَعُوا بَيْنَ الْبِدْعَةِ وَإِرْضَاءِ النَّاسِ، فَقَدْ تَرَكُوا قِرَاءَةَ ﴿الْمُنَافِقُونَ﴾ أَصْلًا وَالتَّرَمُّوا قِرَاءَةَ الشَّطْرِ الثَّانِي مِنَ ﴿الْجُمُعَةِ﴾ فِي الرَّكَعَتَيْنِ، تَخْفِيفًا عَنِ النَّاسِ، زَعَمُوا!

”اس حدیث سے تو استحباب بھی ثابت نہیں ہوتا، چہ جائیکہ سنت ہونا ثابت ہو۔ بلکہ اس پر پابندی کرنا بدعت ہوگا۔ دمشق اور شام کے دیگر علاقوں میں بہت سے ائمہ مساجد ایسا کرتے ہیں۔ انہوں نے تو بدعت اور لوگوں کی خوش نودی دونوں چیزوں کو جمع کیا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے خیال میں لوگوں پر تخفیف کرنے کے لیے سورہ منافقون کی تلاوت بالکل ترک کر دی ہے اور دونوں رکعتوں میں سورہ جمعہ کے آخری رکوع کی تلاوت کرتے ہیں۔“

(سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة، وأثرها السيء في الأمة: 2/35، ح: 559)





## سیدہ ام کلثوم بنت علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہا کا

### سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نکاح

ابن الحسن محمدی

خلیفۃ المسلمین، دامادِ رسولِ امین، سیدنا مولیٰ علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطنِ پاک سے ہونے والی اپنی بیٹی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح امیر المومنین، خلیفہ راشد، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کیا۔ یہ بات تواتر اور اجماع کی حد تک ثابت ہے۔ اہل سنت اور شیعہ اس میں متفق ہیں، بلکہ شیعہ محدثین اور فقہاء نے اس نکاح کا تذکرہ اپنی کتب میں کیا ہے، جیسا کہ:

شیعہ مؤرخ، احمد بن یعقوب نے 17 ہجری میں خلافتِ فاروقی کے احوال میں لکھا ہے:

وَفِي هَذِهِ السَّنَةِ خَطَبَ عُمَرُ إِلَى عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أُمَّ كُلْثُومٍ بِنْتِ عَلِيٍّ، وَأُمُّهَا فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ، فَقَالَ عَلِيٌّ: إِنَّهَا صَغِيرَةٌ، فَقَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ يَقُولُ: «كُلُّ نَسَبٍ وَسَبَبٍ يَنْقَطِعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، إِلَّا سَبَبِي وَنَسَبِي وَصِهْرِي، فَأَرَدْتُ أَنْ يَكُونَ لِي سَبَبٌ وَصِهْرٌ بِرَسُولِ اللَّهِ، فَتَزَوَّجَهَا وَأَمَّهَرَهَا عَشْرَةَ آلَافٍ دِينَارٍ.

”اسی سال سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف ان کی بیٹی ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کے لئے پیغامِ نکاح بھیجا۔ یاد رہے کہ یہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی لختِ جگر تھیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ام کلثوم ابھی عمر میں چھوٹی ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (میں یہ رشتہ صرف اس لیے طلب کر رہا ہوں کہ) میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: روزِ قیامت تمام نسب اور سبب

منقطع ہو جائیں گے، سوائے میرے تعلق، نسب اور سسرالی رشتہ کے۔ اب میری یہ خواہش ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق اور سسرالی رشتہ ہو۔ اس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ دس ہزار دینار حق مہر کے عوض اپنی صاحبزادی کی شادی کر دی۔“

(تاریخ اليعقوبي: 2/ 149، 150)

محمد بن جعفر کلینی نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک روایت ذکر کی ہے۔ آپ سے اس عورت کی عدت کے بارے میں پوچھا گیا، جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو کہ وہ عدت کہاں گزارے؟ اپنے خاوند کے گھریا جہاں چاہے گزار سکتی ہے؟ اس پر امام صاحب نے فرمایا: جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے، پھر فرمایا:

إِنَّ عَلِيًّا لَمَّا مَاتَ عُمَرُ أَتَى أُمَّ كُلْثُومَ، فَأَخَذَ بِيَدِهَا، فَانْطَلَقَ بِهَا إِلَى بَيْتِهِ .  
”جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے، تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام کر اسے

اپنے گھر لے گئے۔“ (الکافی فی الفروع، کتاب الطلاق، 6/ 115، 116)

طوسی شیعہ نے امام باقر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ذکر کی ہے:

مَاتَتْ أُمُّ كُلْثُومَ بِنْتُ عَلِيٍّ وَابْنُهَا زَيْدُ بْنُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِي سَاعَةٍ وَاحِدَةٍ، لَا يُدْرَى أَيُّهُمَا هَلَكَ قَبْلُ، فَلَمْ يُورِثْ أَحَدُهُمَا مِنَ الْآخِرَةِ، وَصَلِّيَ عَلَيْهِمَا جَمِيعًا .

”سیدہ ام کلثوم بنت علی اور ان کے بیٹے زید بن عمر بن خطاب بالکل ایک ہی وقت میں فوت ہوئے، یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ دونوں میں سے پہلے کون فوت ہوا، نہ دونوں میں سے کوئی دوسرے کا وارث بنا۔ دونوں کی نماز جنازہ بھی اکٹھی ادا کی گئی۔“

(تہذیب الأحکام، کتاب المیراث: 9/ 262)

حسین کریمین رضی اللہ عنہما کی سگی بہن، سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

سے نکاح کو درج ذیل شیعہ علماء نے بھی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے:

سید مرتضیٰ ”علم الہدیٰ“ (الشافی، ص: 166)، فخر شیعہ، ابن شہر آشوب (مناقب آل  
أبی طالب: 162/3، طبعة ممبئی، الهند)، شیعہ عالم اربلی (كشف الغمّة في معرفة  
الأئمّة، ص: 10، طبع ایران، القديم)، ابن ابوالحرید (شرح نهج البلاغة: 124/3)،  
مقدس اردبیلی (حديقة الشيعة، ص: 277، طبعة طهران)، قاضی نور اللہ شوشتری ملقب  
بہ الشہید الثالث (مجالس المؤمنین، ص: 76، طبعة ایران، القديم) وغیرہ۔

اس نکاح سے فقہائے شیعہ نے ہاشمیہ عورت کے غیر ہاشمی مرد کے ساتھ نکاح کے  
جواز کا استدلال کیا ہے۔

شیعہ فقیہ حلی (م: 672ھ) نے لکھا ہے:

وَيَجُوزُ إِنْكَاحُ الْحُرَّةِ الْعَبْدِ، وَالْعَرَبِيَّةِ الْعَجَمِيَّةِ، وَالْهَاشِمِيَّةِ غَيْرِ الْهَاشِمِيِّ .  
”آزاد عورت کا غلام مرد کے ساتھ، عربی عورت کا عجمی مرد کے ساتھ اور ہاشمی عورت کا  
غیر ہاشمی مرد کے ساتھ نکاح جائز ہے۔“

(شرائع الإسلام في مسائل الحلال والحرام، كتاب النكاح: 467/2)

اس کتاب کے شارح العالمی ملقب بہ الشہید الثانی نے لکھا ہے:

وَزَوْجَ النَّبِيِّ ابْنَتَهُ عُثْمَانَ، وَزَوْجَ ابْنَتِهِ زَيْنَبَ بِأَبِي الْعَاصِ بْنِ الرَّبِيعِ،  
وَلَيْسَا مِنْ بَنِي هَاشِمٍ، وَكَذَلِكَ زَوْجَ عَلِيٍّ ابْنَتَهُ أُمَّ كُلْثُومٍ مِّنْ عُمَرَ، وَتَزَوَّجَ  
عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرِو بْنِ عُثْمَانَ فَاطِمَةَ بِنْتَ الْحُسَيْنِ، وَتَزَوَّجَ مُضْعَبُ بْنُ  
الزُّبَيْرِ أُخْتَهَا سَكِينَةَ، وَكُلُّهُمْ مِّنْ غَيْرِ بَنِي هَاشِمٍ .

”نبی کریم ﷺ نے اپنی ایک بیٹی کا نکاح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا، اپنی دوسری

بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح سیدنا ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا۔ یہ دونوں بنو ہاشم کے آدمی نہیں تھے۔ اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کی شادی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کی، ایسے ہی سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عثمان کی شادی سیدہ فاطمہ بنت حسین سے اور سیدنا مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شادی ان (فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہا) کی بہن سکیکنہ سے ہوئی۔ یہ سب غیر ہاشمی تھے۔“ (مسالك الأفهام شرح شرائع الإسلام، باب لواحق العقد: 410/7)

مشہور معزلی شیعہ، ابن ابوالحدید نے ایک روایت ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے:

إِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَجَّهَ إِلَى مَلِكِ الرُّومِ بَرِيدًا، فَاشْتَرَتْ أُمُّ كَلْثُومٍ امْرَأَةً عُمَرَ طَبِيبًا بِدَنَانِيرَ، وَجَعَلَتْهُ فِي قَارُورَتَيْنِ، وَأَهْدَتْهُمَا إِلَى امْرَأَةِ مَلِكِ الرُّومِ، فَارْجَعَ الْبَرِيدُ إِلَيْهَا، وَمَعَهُ مِلْءُ الْقَارُورَتَيْنِ جَوَاهِرَ، فَدَخَلَ عَلَيْهَا عُمَرُ، وَقَدْ صُبَّتِ الْجَوَاهِرُ فِي حِجْرِهَا، فَقَالَ: مَنْ أَيْنَ لَكَ هَذَا؟ فَأَخْبَرَتْهُ، فَقَبَضَ عَلَيْهِ وَقَالَ: هَذَا لِلْمُسْلِمِينَ، قَالَتْ: كَيْفَ، وَهُوَ عَوَظٌ هَدَيْتِي؟ قَالَ: بَيْنِي وَبَيْنَكَ أَبُوكَ، فَقَالَ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لَكَ مِنْهُ بِقِيمَةِ دِينَارِكَ، وَالْبَاقِي لِلْمُسْلِمِينَ جُمْلَةً، لِأَنَّ بَرِيدَ الْمُسْلِمِينَ حَمَلَهُ.

”سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے قاصد کو رومی بادشاہ کی طرف بھیجا، آپ کی زوجہ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے کچھ دینار کی خوشبو خریدی اور اسے دو بوتلوں میں بند کر کے رومی بادشاہ کی بیوی کو تحفہ بھیجا۔ جب قاصد واپس آیا، تو وہ جواہرات کی بھری دو بوتلیں لایا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، تو ان کی گود میں جواہرات پڑے تھے۔ آپ نے پوچھا: یہ جواہرات کہاں سے آئے ہیں؟ انہوں نے بتایا، تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وہ جواہرات ان سے لے لئے اور فرمایا: یہ مسلمانوں کے ہیں۔ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو میرے بھیجے ہوئے ہدیے کے عوض میں آئے ہیں۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے اور آپ کے درمیان آپ کے والد فیصلہ کریں گے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیٹی تیرے دیناروں کی قیمت کے برابر جواہرات تجھے ملیں گے، باقی تمام مسلمانوں کے حصے میں آئیں گے، کیونکہ قاصد مسلمانوں ہی کا تھا۔“

(شرح نہج البلاغۃ: 4/575، طبعۃ بیروت، 1375ھ)

ہم نے یہ حوالہ جات معروف اہل حدیث عالم، شہید اسلام، علامہ احسان الہی ظہیر رضی اللہ عنہ کی مایہ ناز کتاب [الشیعۃ وأهل البيت] (ص: 106... 109) سے لیے ہیں۔

اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ جب شیعہ نے یہ بات تسلیم کر لی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کیا تھا، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تینوں خلفائے راشدین کے درمیان بے حد محبت اور گہرا تعلق تھا، وہ ایک دوسرے کے احترام میں رشتے ناٹے تک قائم کرتے تھے اور ایک دوسرے کے حقوق کے پاسبان اور پاسدار تھے۔۔۔ تو شیعہ نے امام ابو عبد اللہ جعفر بن محمد صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر کے ایک قول گھڑ لیا۔ وہ یہ ہے:

”یہ رشتہ ہم سے چھین لیا گیا تھا۔“

إِنَّ ذَلِكَ فَرَجٌ غَضِبْنَاهُ.

(الکافی فی الفروع: 2/141، طبعۃ الہند)

شیعہ اصول حدیث کے مطابق یہ قول ”صحیح“ ہے، البتہ اہل سنت کے اصول حدیث کی رو سے یہ قول جھوٹا اور مردود ہے، کیونکہ:

- ① علی بن ابراہیم بن ہاشم ابو الحسن قمی
- ② اس کا باپ ابراہیم بن ہاشم ابن الخلیل ابو اسحاق قمی
- ③ محمد بن ابو عمیر



④ ہشام بن سالم

⑤ حماد بن عثمان

⑥ ابو الحسن زرارہ بن امین الشیبانی

یہ سب کے سب ”مجہول“ ہیں۔

ان اشخاص کی توثیق نہیں مل سکی، ان میں سے بعض کے تو حالات زندگی ہی کا پتہ نہیں چل سکا۔ یہ نامعلوم جھوٹوں کی کارستانی ہے۔  
شیعہ عالم مقدس اردبیلی نے لکھا ہے:

إِنَّ عَلِيًّا لَّمْ يَكُنْ يُرِيدُ أَنْ يُزَوِّجَ ابْنَتَهُ أُمَّ كُلْثُومٍ مِّنْ عُمَرَ، وَلَكِنَّهُ خَافَ مِنْهُ، فَوَكَّلَ عَمَّهُ عَبَّاسًا لِّيزَوِّجَهَا مِنْهُ.

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کریں، مگر ڈر کی وجہ سے انہوں نے یہ کام کیا، چنانچہ اپنے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیں۔“ (حديقة الشيعة، ص: 277)  
کیا ایسے لوگ اہل بیت اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خیر خواہ ہو سکتے ہیں؟ ایک جھوٹی کہانی گھڑ کر یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ (معاذ اللہ) سیدنا علی رضی اللہ عنہ نہایت بزدل تھے اور اپنے حقوق کے حصول میں اس قدر چشم پوشی سے کام لیتے تھے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان سے ان کی عزت و عصمت تک چھین لی، مگر انہوں نے پوری زندگی زبان تک نہیں کھولی۔ ایسی رسوائی والی باتوں سے ہم اللہ رب العزت کی پناہ میں آتے ہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس قسم کی باتوں سے بہت بلند تھے۔ جس دل میں ذرہ برابر ایمان ہو، وہ مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی طرف یہ رسوا کن بات منسوب نہیں کر سکتا۔ ایک دن آنے والا ہے جس دن اللہ رب العزت ایسے جھوٹوں کو اپنی گرفت میں لے گا، پھر کوئی ان کو چھڑا نہیں سکے گا۔



## کتب اہل سنت اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح

اس حوالے سے اہل سنت کی کتب سے بھی دلائل ملاحظہ ہوں:

① سیدنا ثعلبہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

إِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَسَمَ مُرُوطًا بَيْنَ نِسَاءٍ مِّنْ نِّسَاءِ الْمَدِينَةِ، فَبَقِيَ مَرُطٌ جَيِّدٌ، فَقَالَ لَهُ بَعْضُ مَنْ عِنْدَهُ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! أَعْطِ هَذَا ابْنَةَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّتِي عِنْدَكَ، يُرِيدُونَ أُمَّ كَلْثُومَ بِنْتِ عَلِيٍّ، فَقَالَ عُمَرُ: أُمُّ سَلِيطٍ أَحَقُّ، وَأُمُّ سَلِيطٍ مِّنْ نِّسَاءِ الْأَنْصَارِ، مِمَّنْ بَايَعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ عُمَرُ: فَإِنَّهَا كَانَتْ تَزْفِرُ لَنَا الْقُرْبَ يَوْمَ أُحُدٍ.

”سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی عورتوں میں چادریں تقسیم کیں، تو ایک عمدہ چادر بچ گئی۔ آپ کے پاس بیٹھے لوگوں میں سے کسی نے کہا: امیر المؤمنین! آپ یہ چادر رسول اللہ ﷺ کی نواسی کو عنایت کر دیجئے جو کہ آپ رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ اس شخص کی مراد سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا تھیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (میری بیوی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے مقابلہ میں) بی بی ام سلیط رضی اللہ عنہا اس چادر کی زیادہ مستحق ہیں۔ وہ انصاری عورت تھیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی ہوئی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ عورت غزوہ اُحُد کے دن پانی کی مشکیں اپنی کمر پر لاد کر ہمارے پاس لاتی تھی۔“ (صحیح البخاری: 2725)

② نافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ ابْنَ عُمَرَ صَلَّى عَلَى تِسْعِ جَنَائِزَ جَمِيعًا، فَجَعَلَ الرِّجَالَ يُلُونَ الْإِمَامَ، وَالنِّسَاءَ يَلِينَ الْقَبْلَةَ، فَصَفَّهِنَّ صَفًّا وَاحِدًا، وَوُضِعَتْ جَنَازَةُ أُمِّ



كُلْثُومُ بِنْتُ عَلِيٍّ امْرَأَةُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، وَابْنِ لَهَا، يُقَالُ لَهُ زَيْدٌ، وَضِعَا جَمِيعًا، وَالْإِمَامُ يَوْمَيْدُ سَعِيدُ بْنُ الْعَاصِ، وَفِي النَّاسِ ابْنُ عُمَرَ، وَأَبُو هُرَيْرَةَ، وَأَبُو سَعِيدٍ، وَأَبُو قَتَادَةَ، فَوَضِعَ الْغُلَامُ مِمَّا يَلِي الْإِمَامَ.

”سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نو میتوں پر اکٹھی نماز جنازہ ادا کی۔ انہوں نے مردوں کو امام اور عورتوں کو قبلہ کی جانب رکھا۔ ان سب کی ایک صف بنا دی، جبکہ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا، جو کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ تھیں انہیں اور ان کے زید نامی بیٹے، دونوں کو اکٹھا رکھا۔ اس روز سیدنا سعید بن عاص رضی اللہ عنہ امام تھے، جبکہ جنازہ پڑھنے والوں میں سیدنا عبداللہ بن عمر، سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا ابوسعید خدری اور سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ بچے کو امام کی جانب رکھا گیا۔“ (سنن النسائي: 1980، سنن الدارقطني: 79/2، السنن الكبرى للبيهقي: 33/4، وسنده صحيح)

اس حدیث کو امام ابن الجارود رحمہ اللہ (545) نے صحیح کہا ہے۔  
اس کی سند کو حافظ نووی رحمہ اللہ (المجموع شرح المہذب: 224/5) نے ”حسن“، جبکہ حافظ ابن ملقن رحمہ اللہ (البدر المنير: 385/5) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (التلخيص الحبير: 146/2) نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

③ امام شعبی رحمہ اللہ، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بیان کرتے ہیں:  
إِنَّهُ صَلَّى عَلَى أَخِيهِ، وَأُمِّهِ أُمِّ كُلْثُومِ بِنْتِ عَلِيٍّ، فَجَعَلَ الْغُلَامَ مِمَّا يَلِي الْإِمَامَ، وَالْمَرْأَةَ فَوْقَ ذَلِكَ.

”سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے بھائی اور اپنی والدہ سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کی نماز جنازہ پڑھائی، انہوں نے بچے کو امام کی جانب رکھا اور عورت کو اوپر والی جانب۔“

(مسند علي ابن الجعد: 574، وسنده صحيح)



④ امام شعی رحمہ اللہ ہی بیان کرتے ہیں:

صَلَّى ابْنُ عُمَرَ عَلَى زَيْدِ بْنِ عُمَرَ، وَأُمِّهِ أُمِّ كَلْثُومِ بِنْتِ عَلِيٍّ، فَجَعَلَ الرَّجُلَ مِمَّا يَلِي الْإِمَامَ، وَالْمَرْأَةَ مِنْ خَلْفِهِ، فَصَلَّى عَلَيْهِمَا أَرْبَعًا، وَخَلَفَهُ ابْنُ الْحَنْفِيَّةِ، وَالْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ، وَابْنُ عَبَّاسٍ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ.

”سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے بھائی زید بن عمر اور اپنی والدہ سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ پڑھائی۔ انہوں نے بچے کو امام کی جانب رکھا اور عورت کو اس کے پیچھے رکھا، چار تکبیروں کے ساتھ ان کی نماز جنازہ ادا کی۔ ان کی اقتدا میں محمد بن حنفیہ، سیدنا حسین بن علی اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے نماز جنازہ ادا کی۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی: 38/4، وسندہ صحیح)

⑤ عمار بن ابوعمار، مولیٰ بنو ہاشم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

شَهِدْتُهُمْ يَوْمَئِذٍ، وَصَلَّى عَلَيْهِمَا سَعِيدُ بْنُ الْعَاصِ، وَكَانَ أَمِيرَ النَّاسِ يَوْمَئِذٍ، وَخَلَفَهُ ثَمَانُونَ مِنْ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

”میں سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور ان کے بیٹے زید بن عمر بن خطاب کی نماز جنازہ میں شریک تھا۔ سیدنا سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کی نماز جنازہ ادا کی۔ وہ ان دنوں گورنر تھے۔ ان کے پیچھے اسی صحابہ کرام موجود تھے۔“

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 340/8، وسندہ حسن)

شرح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان روایات کے مابین یوں جمع و تطبیق کی ہے:

فَيُحْمَلُ عَلَى أَنَّ ابْنَ عُمَرَ أَمَّ بِهِمْ حَقِيقَةً بِإِذْنِ سَعِيدِ بْنِ الْعَاصِ، وَيُحْمَلُ قَوْلُهُ: إِنَّ الْإِمَامَ كَانَ سَعِيدَ بْنَ الْعَاصِ، يَعْنِي الْأَمِيرَ، جَمْعًا بَيْنَ



الرَّوَايَتَيْنِ، أَوْ أَنَّ نِسْبَةَ ذَلِكَ لِابْنِ عُمَرَ لِكَوْنِهِ أَشَارَ بِتَرْتِيبِ وَضْعِ تِلْكَ الْجَنَائِزِ، عَلَى الْجَنَازَةِ فِي الصَّلَاةِ.

”درحقیقت سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سیدنا سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کی اجازت سے نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ حدیث میں یہ جو مذکور ہے کہ سیدنا سعید بن عاص رضی اللہ عنہ ان کے امام تھے، تو اس سے مراد امارت ہے۔ یوں ان روایات کے درمیان جمع کی صورت بنتی ہے، یا پھر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے جنازہ پڑھانے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے نماز جنازہ کے لئے چار پایوں کو ترتیب میں رکھنے کا اشارہ فرمایا تھا۔“ (التلخیص الحبیبر: 146/2)



## ماہنامہ السنۃ کی اشاعت کے پانچ سال

ہمارے لیے یہ بات باعث مسرت ہے کہ ماہنامہ السنۃ، جہلم کی اشاعت کے پانچ سال مکمل ہو گئے ہیں۔ الحمد للہ! انتہائی کٹھن حالات کے باوجود ان پانچ سالوں میں ایک بھی شمارہ اشاعت سے محروم نہیں رہا۔

البتہ اس موقع پر ہم قارئین کرام سے گزشتہ کچھ شماروں کی تاخیر سے اشاعت پر معذرت بھی کرتے ہیں اور یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ ماہنامہ السنۃ کو سہ ماہی یا ششماہی نہیں کیا جا رہا۔ نامساعد حالات کی بنا پر جو تاخیر ہو رہی ہے، اسے جلد ہی ختم کر دیا جائے گا اور عنقریب آپ کا محبوب و مرغوب رسالہ ہر ماہ باقاعدگی سے آپ کو ملنا شروع ہو جائے گا۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس سلسلے میں کم از کم دعاؤں کا تعاون ہی جاری رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عمل پر استقامت عطا فرمائے اور علم کا یہ مینار ہمیشہ جگمگاتا رہے۔





## نکاحِ متعہ تا قیامت حرام ہے

غلامِ مصطفیٰ ظہیر امن پوری

ہمارے پیارے رسول، محمد ﷺ کی لائی ہوئی شریعت ایک مکمل اور کامل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں تا قیامت تبدیلی کی گنجائش نہیں، کیونکہ انسانیت کے مختلف ادوار اور مختلف حالات میں جو قوانین متغیر رہے تھے، اسلام نے ان کو مستقل کر دیا ہے۔ نزولِ وحی کے زمانے سے لے کر قیامت تک کے لیے ایک ٹھوس دستورِ زندگی عطا فرما دیا گیا۔ یہ کمال ہی کا تقاضا تھا کہ صرف افراد کو نہیں، بلکہ معاشرے کو بھی مد نظر رکھ کر قوانین مرتب کر دیے گئے۔ جن کاموں سے معاشرے میں خرابی واقع ہوتی تھی، ان کو بدرجہ حرام کر دیا گیا۔ شراب کی مثال لے لیں کہ کس طرح غیر محسوس انداز سے مسلمان معاشرے کو اس سے پاک کیا گیا۔ پہلے نمازوں کے اوقات میں نشہ نہ کرنے کا حکم فرما کر مسلمانوں سے اس کی لت ختم کی، پھر اس کے فوائد کی نسبت اس کی خرابیوں کے زیادہ ہونے کا بتا کر اس سے عمومی نفرت کا رجحان پیدا کیا اور آخر میں اسے مستقل طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔

نکاحِ متعہ بھی انہی چیزوں میں سے ہے، جنہیں اسلام نے اصلاحِ معاشرہ کی خاطر ابدی طور پر حرام قرار دے دیا ہے۔ جیسے شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عہدِ رسالت میں شراب پی جاتی رہی، اسی طرح تدریجی حکمتِ عملی کے تحت عہدِ نبوی میں نکاحِ متعہ بھی ایک وقت تک جائز رہا، لیکن پھر اسے قیامت تک کے لیے حرام قرار دے دیا گیا اور اس کی جگہ شرعی نکاح ہی کو حتمی اور لازمی اصول بنا دیا گیا۔

اب جس طرح کسی مسلمان کا شراب کی حرمت سے پہلے تک کے عہدِ رسالت میں صحابہ کرام کے شراب پینے کے واقعات کو دلیل بنا کر شراب کو حلال قرار دینا جائز نہیں، اسی

طرح کسی مسلمان کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ حرمتِ متعہ سے پہلے پیش آنے والے عہدِ نبوی کے واقعات کو دلیل بناتے ہوئے اب بھی نکاحِ متعہ کے جواز پر اصرار کرے۔

نکاحِ متعہ کے فرد اور معاشرے پر نہایت مضر اثرات تھے، جن کی بنا پر اسے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا گیا۔ اس کے مقابلے میں شرعی نکاح کو رائج کیا گیا، جو مفاسد سے بالکل خالی اور فرد و معاشرے کے لیے بے شمار فوائد کا حامل ہے۔

شرعی نکاح کا اہم مقصد عفت و عصمت کا تحفظ ہے، جو کہ نکاحِ متعہ سے حاصل نہیں ہوتا، نیز نکاحِ شرعی میں اہم جزو دوام و استمرار ہے، جو کہ متعہ میں نہیں پایا جاتا۔ نکاحِ شرعی کا اہم فائدہ محبت و موڈت اور سکون ہے، جو کہ نکاحِ متعہ میں ناپید ہے۔ نکاحِ شرعی میں بیک وقت ایک سے زائد بیویوں کا تصور تو ہے، لیکن ایک سے زائد خاوندوں کا تصور قطعاً نہیں، جبکہ نکاحِ متعہ میں ایک سے زائد خاوندوں کا تصور واضح طور پر پایا جاتا ہے۔ ایک عورت کے لیے نکاحِ متعہ کے ذریعے ایک ہی دن میں بیسیوں افراد سے منہ کالا کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔

نکاحِ متعہ کے ذریعے معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے اور انسانوں میں بہیمانہ رویے پروان چڑھتے ہیں۔ ایک عورت جب نکاحِ متعہ کے ذریعے کئی مردوں سے تعلق رکھتی ہے، تو کیا معلوم اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ کس کا ہے؟ ایسے بچے عام طور پر خونخوار درندے ہی بنتے ہیں، پر امن شہری نہیں بن پاتے۔ نکاحِ متعہ میں ولی (باپ، بھائی) کے حقوق بھی پامال ہوتے ہیں۔ عصمت جو انسانیت کا جوہر ہے، ختم ہو جاتی ہے اور ماحول میں آوارگی پھیلتی ہے۔

شیخ الاسلام، ابو العباس، احمد بن عبد الحلیم، ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (661-728ھ) فرماتے ہیں:

وَالنِّكَاحُ الْمُبِيحُ هُوَ النِّكَاحُ الْمَعْرُوفُ عِنْدَ الْمُسْلِمِينَ، وَهُوَ النِّكَاحُ

الَّذِي جَعَلَ اللَّهُ فِيهِ بَيْنَ الزَّوْجَيْنِ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً.

”جائز نکاح وہی ہے، جو مسلمانوں کے ہاں معروف ہے۔ یہی وہ نکاح ہے، جسے اللہ

تعالیٰ نے زوجین میں مودت و رحمت کا باعث بنایا ہے۔“ (مجموع الفتاویٰ: 92/32، 93)

نکاحِ متعہ کی بے شمار قباحتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے شادی شدہ

خواتین بھی بدکاری کی راہ اختیار کر لیتی ہیں، جیسا کہ:

❁ شیعہ کے شیخ الطائفہ، ابو جعفر، محمد بن حسن، طوسی (م: 460ھ) نے لکھا ہے:

وَلَيْسَ عَلَى الرَّجُلِ أَنْ يَسْأَلَهَا؛ هَلْ لَهَا زَوْجٌ أَمْ لَا.

”نکاحِ متعہ کرنے والے مرد کے لیے عورت سے یہ پوچھنا ضروری نہیں کہ اس کا کوئی

خاوند ہے یا نہیں۔“ (النهاية، ص: 490)

ان قباحتوں کے باوجود نکاحِ متعہ شیعہ مذہب کا بنیادی جزو ہے، جیسا کہ:

❁ شیعہ فقیہ، محمد بن حسن، الحر العاملي (م: 1104ھ) نے لکھا ہے:

إِنَّ إِبَاحَةَ الْمُتَعَةِ مِنْ ضَرُورِيَّاتِ مَذْهَبِ الْإِسْلَامِيَّةِ.

”نکاحِ متعہ کا جائز قرار دینا امامی شیعوں کی مذہبی ضرورت ہے۔“

(وسائل الشيعة: 245/7)

## نکاحِ متعہ اور اجماعِ امت

امتِ مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں نکاحِ متعہ تا قیامت حرام

ہو چکا ہے، جیسا کہ:

❁ امام ابو عیید، قاسم بن سلام رضی اللہ عنہ (150-224ھ) فرماتے ہیں:

فَالْمُسْلِمُونَ الْيَوْمَ مُجْمِعُونَ عَلَى هَذَا الْقَوْلِ: إِنَّ مُتَعَةَ النِّسَاءِ قَدْ

نَسِخَتْ بِالتَّحْرِيمِ، ثُمَّ نَسَخَهَا الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ ---، وَلَا نَعْلَمُ أَحَدًا مِّنَ الصَّحَابَةِ كَانَ يَتَرَخَّصُ فِيهَا، إِلَّا مَا كَانَ مِنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، فَإِنَّهُ كَانَ ذَلِكَ مَعْرُوفًا مِّنْ رَّأْيِهِ، ثُمَّ بَلَّغْنَا أَنَّهُ رَجَعَ عَنْهُ.

”آج مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورتوں سے نکاح متعہ کو منسوخ کر کے حرام کر دیا گیا ہے۔ کتاب و سنت نے اسے منسوخ کیا ہے۔ کوئی ایک بھی ایسے صحابی معلوم نہیں ہوئے، جو نکاح متعہ کی رخصت دیتے ہوں، سوائے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کہ اس کے جواز پر ان کا مشہور فتویٰ تھا۔ پھر ہم تک یہ بات بھی پہنچ گئی کہ (حق معلوم ہونے پر) انہوں نے اپنے اس فتوے سے رجوع فرما لیا تھا۔“ (الناسخ والمنسوخ، ص: 80)

امام ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں:

وَأَمَّا قَوْلُ أَهْلِ الْعِلْمِ الْيَوْمَ جَمِيعًا، مِّنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ، وَأَهْلِ الْحِجَازِ، وَأَهْلِ الشَّامِ، وَأَصْحَابِ الْأَثَرِ، وَأَصْحَابِ الرَّأْيِ، وَغَيْرِهِمْ، أَنَّهُ لَا رُخْصَةَ فِيهَا لِمُضْطَرٍّ وَلَا لِعَافٍ، وَأَنَّهَا مَنْسُوخَةٌ حَرَامٌ، عَلَى مَا ذَكَرْنَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابِهِ.

”اس دور میں اہل عراق، اہل حجاز اور اہل شام، نیز اصحاب الحدیث و اصحاب الرائے وغیرہ سب اہل علم کا اتفاقی فتویٰ یہی ہے کہ کسی کو کوئی مجبوری ہو یا نہ ہو، نکاح متعہ کی اجازت نہیں، نیز یہ منسوخ اور حرام ہے، جیسا کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت کر دیا ہے۔“ (الناسخ والمنسوخ، ص: 82)

✽ حافظ، ابو محمد، حسین بن مسعود، بغوی رضی اللہ عنہ (م: 516ھ) فرماتے ہیں:

اتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى تَحْرِيمِ نِكَاحِ الْمُتْعَةِ، وَهُوَ كَالِإِجْمَاعِ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ.





”علماء کرام کا نکاحِ متعہ کو حرام قرار دینے پر اتفاق ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک اجماع ہی ہے۔“

(شرح السنّة: 100/9)

✽ حافظ، عبد الرحمن بن علی، ابن الجوزی رحمہ اللہ (508-579ھ) فرماتے ہیں:

فَقَدْ وَقَعَ الْإِتِّفَاقُ عَلَى النَّسْخِ . ”نکاحِ متعہ کے منسوخ ہونے پر

مسلمانوں کا اجماع ہے۔“ (کشف المشکل من حدیث الصحیحین: 146/1)

✽ مشہور مفسر، ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی رحمہ اللہ (600-671ھ) فرماتے ہیں:

فَانْعَقَدَ الْإِجْمَاعُ عَلَى تَحْرِيمِهَا . ”نکاحِ متعہ کو حرام قرار دینے پر

مسلمانوں کا اجماع ہو گیا ہے۔“ (تفسیر القرطبی: 133/5)

✽ امام، ابو جعفر، احمد بن محمد بن سلامہ، طحاوی رحمہ اللہ (238-321ھ) فرماتے ہیں:

فَهَذَا عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَدْ نَهَى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ، بِحَضْرَةِ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمْ يُنْكَرْ ذَلِكَ عَلَيْهِ مِنْهُمْ مُنْكَرٌ، وَفِي هَذَا دَلِيلٌ عَلَى مُتَابَعَتِهِمْ لَهُ عَلَى مَا نَهَى عَنْهُ مِنْ ذَلِكَ، وَفِي إِجْمَاعِهِمْ عَلَى النَّهْيِ فِي ذَلِكَ عَنْهَا دَلِيلٌ عَلَى نَسْخِهَا، وَحُجَّةٌ.

”سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ کے صحابہ کرام کی موجودگی میں عورتوں سے متعہ کرنے سے منع فرمایا۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سب صحابہ کرام متعہ سے منع کرنے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہمناو تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ اجماع متعہ کے منسوخ ہونے کی دلیل و برہان ہے۔“

(شرح معانی الآثار: 26/3)

نکاحِ متعہ اور قرآن کریم

✽ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ \* إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ \* فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ﴾ (المؤمنون 23 : 5-7، المعارج 70 : 29-31)

”اور وہ لوگ (مؤمن ہیں)، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور اپنی لونڈیوں کے۔ ایسے لوگ ملامت نہیں کیے جائیں گے۔ لیکن جو لوگ اس کے علاوہ کچھ تلاش کریں، وہ زیادتی کے مرتکب ہیں۔“

معلوم ہوا کہ بیوی اور لونڈی کے علاوہ کسی سے جنسی تعلق رکھنا جائز نہیں۔ جس عورت سے متعہ کیا جاتا ہے، وہ مرد کی نہ بیوی ہوتی ہے نہ لونڈی، لہذا متعہ حرام ہے۔

ام المؤمنین، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابن ابوملیکہ رحمہ اللہ نے متعہ کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے ارشاد فرمایا: **بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللَّهِ، قَالَ: وَقَرَأْتُ هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ﴾ \* --- .**

”میرے اور تمہارے مابین اللہ کی کتاب سے فیصلہ ہوگا۔ انہوں نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ﴾ \* ([مؤمن وہ ہیں،] جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں)۔“ (الناسخ والمنسوخ للقاسم بن سلام : 131، مسند

الحارث [بغية الباحث]: 479، السنن الكبرى للبيهقي : 206/7، 207، وسنده صحيح)

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ عَلَىٰ شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ .

”یہ حدیث امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ کی شرط پر صحیح ہے۔“ (المستدرک : 305/2، 393)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں ان کی موافقت کی ہے۔



✽ فرمانِ الہی ہے:

﴿وَلَيْسَتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ

فَضْلِهِ﴾ (النور 24: 33)

”اور جو لوگ نکاح (کے لیے مالی استطاعت) نہیں پاتے، وہ اپنی عزت کی حفاظت کریں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے۔“

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں الکلیا الہراسی کے نام سے معروف، مفسر و فقیہ، علامہ، ابوالحسن، علی بن محمد، طبری رحمہ اللہ (450-504ھ) فرماتے ہیں:

أَمْرُهُمُ بِالتَّعَفُّفِ عِنْدَ تَعَذُّرِ النِّكَاحِ عَمَّا حَرَّمَهُ اللَّهُ تَعَالَى، وَذَلِكَ عَلَى الْوُجُوبِ، وَفِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ إِبَاحَةَ الْإِسْتِمْتَاعِ مَوْقُوفَةٌ عَلَى النِّكَاحِ، وَلِذَلِكَ يُحَرِّمُ مَا عَدَاهُ، وَلَا يُفْهِمُ مِنْهُ التَّحْرِيمُ بِمِلْكِ الْيَمِينِ، لِأَنَّ مَنْ لَا يَقْدِرُ عَلَى النِّكَاحِ لِعَدَمِ الْمَالِ لَا يَقْدِرُ عَلَى شِرَاءِ الْجَارِيَةِ غَالِبًا، وَفِيهِ دَلِيلٌ عَلَى بُطْلَانِ نِكَاحِ الْمُتْعَةِ، وَدَلِيلٌ عَلَى تَحْرِيمِ الْإِسْتِمْنَاءِ.

”اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نکاح نہ ہو سکنے کی صورت میں جنسی تسکین کے حرام ذرائع سے منع فرمایا۔ یہ ممانعت وجوبی ہے۔ یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ جنسی تسکین کا جواز نکاح پر موقوف ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے باقی سارے ذرائع کو حرام قرار دے دیا ہے۔ یاد رہے کہ اس آیت سے لونڈیوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ (ان کا ذکر تو اس لیے نہیں کیا گیا کہ) جو شخص مال نہ ہونے کی وجہ سے نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا، وہ عموماً لونڈی خریدنے پر بھی قادر نہیں ہوتا۔ یہ آیت نکاحِ متعہ کی حرمت پر بھی دلیل ہے اور اس سے مشت زنی کا حرام ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔“ (أحكام القرآن: 4/313، 314)

**تنبیہ :** بعض لوگ قرآن کریم سے متعہ کے جواز کا استدلال کرنے کی

ناکام سعی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۴۴ پیش کرتے ہیں۔

فرمانِ الہی ہے :

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً﴾

”جن عورتوں سے تم فائدہ اٹھاؤ، ان کو ان کے حق مہر ضروری طور پر ادا کرو۔“

مشہور مفسر، علامہ قرطبی رحمہ اللہ، ابنِ کثیر منداد بصری (م: 390ھ) سے نقل کرتے ہیں :

وَلَا يَجُوزُ أَنْ تُحْمَلَ الْآيَةُ عَلَى جَوَازِ الْمُتْعَةِ، لِأَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ نِكَاحِ الْمُتْعَةِ وَحَرَّمَهُ، وَلِأَنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ : ﴿فَإِنْ كَحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ﴾، وَمَعْلُومٌ أَنَّ النِّكَاحَ بِإِذْنِ الْأَهْلِينَ هُوَ النِّكَاحُ الشَّرْعِيُّ، بِوَلِيِّيٍّ وَشَاهِدَيْنِ، وَنِكَاحُ الْمُتْعَةِ لَيْسَ كَذَلِكَ .

”اس آیتِ کریمہ سے متعہ کا جواز کشید کرنا جائز نہیں، کیونکہ ایک تو رسول اللہ ﷺ نے نکاحِ متعہ سے منع فرما دیا ہے اور اسے حرام قرار دے دیا ہے، دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے (اس سے اگلی آیت میں) ارشاد فرمایا : ﴿فَإِنْ كَحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ﴾ (تم ان عورتوں سے ان کے گھروالوں کی اجازت سے نکاح کرو) اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ عورت کے گھروالوں کی اجازت، یعنی ولی اور دو گواہوں کی موجودگی میں جو نکاح ہوتا ہے، وہ نکاحِ شرعی ہی ہوتا ہے، نکاحِ متعہ کی صورت یہ نہیں ہوتی۔“

(تفسیر القرطبی: 5/129، 130)

معلوم ہوا کہ قرآن کریم سے نکاحِ متعہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا، بلکہ صرف نکاحِ شرعی کا

اثبات ہوتا ہے۔

## نکاحِ متعہ اور احادیثِ رسول ﷺ

نکاحِ متعہ پہلی دفعہ غزوہ خیبر میں منع ہوا تھا، پھر فتح مکہ کے موقع پر تین دن تک اس کی اجازت دی گئی، پھر قیامت تک کے لیے حرام کر دیا گیا۔  
غزوہ خیبر کے موقع پر ممانعت کی حدیث ملاحظہ فرمائیں:

**حدیث نمبر ①:** سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بتایا:

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْمُتْعَةِ، وَعَنْ لُحُومِ الْحُمْرِ الْأَهْلِيَّةِ زَمَنْ خَيْبَرَ. ”غزوہ خیبر کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے نکاحِ متعہ اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرمادیا تھا۔“

(صحیح البخاری: 5115، صحیح مسلم: 30/1407)

ایک روایت کے مطابق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں:

نَهَى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ، وَعَنْ أَكْلِ لُحُومِ الْحُمْرِ الْإِنْسِيَّةِ. ”آپ ﷺ نے غزوہ خیبر کے دن عورتوں سے نکاحِ متعہ کرنے اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمادیا تھا۔“

(صحیح البخاری: 606/2، ح: 4216، صحیح مسلم: 452/1، ح: 1407)

صحیح مسلم کی ایک روایت (1407/31) یوں ہے:

إِنَّهُ سَمِعَ ابْنَ عَبَّاسٍ يُلَيِّنُ فِي مُتْعَةِ النِّسَاءِ، فَقَالَ: مَهْلًا يَا ابْنَ عَبَّاسٍ! فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْهَا يَوْمَ خَيْبَرَ، وَعَنْ لُحُومِ الْحُمْرِ الْإِنْسِيَّةِ. ”سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو عورتوں سے متعہ

کرنے کے بارے میں نرم بات کرتے سنا، تو فرمایا: ابن عباس! اس فتوے سے رُک جاؤ،



کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ خیبر کے دن نکاحِ متعہ اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا۔“

صحیح مسلم کی دوسری روایت (1407/32) میں یہ الفاظ ہیں:

نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ، وَعَنْ أَكْلِ لَحُومِ الْحُمُرِ الْإِنْسِيَّةِ.

”رسول اللہ ﷺ نے غزوہ خیبر کے دن عورتوں سے نکاحِ متعہ کرنے اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا۔“

### حدیث علی رضی اللہ عنہ اور علماء حدیث:

اس حدیث کی صحت کے بارے میں اہل علم کی آراء ملاحظہ فرمائیں:

① امام، ابو جعفر، احمد بن محمد، نحاس (م: 338ھ) فرماتے ہیں:

وَلَا اخْتِلَافَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ فِي صِحَّةِ الْإِسْنَادِ عَنْ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، وَاسْتِقَامَةِ طَرِيقِهِ بِرَوَايَتِهِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحْرِيمَ الْمُتْعَةِ.

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ تک بیان کی گئی سند اور رسول اللہ ﷺ سے ان کے متعہ کی تحریم نقل

کرنے کی صحت میں علماء کرام کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔“ (الناسخ والمنسوخ، ص: 322)

② معروف محدث و مفسر، حافظ، ابو محمد، حسین بن مسعود، بغوی رحمہ اللہ (م: 516ھ)

فرماتے ہیں:

هَذَا حَدِيثٌ مُتَّفَقٌ عَلَى صِحَّتِهِ.

”اس حدیث کی صحت پر تمام اہل

علم کا اتفاق ہے۔“ (شرح السنة: 99/9، ح: 2292)

③ حافظ، ابو الفرج، عبد الرحمن بن علی، ابن الجوزی (508-597ھ) فرماتے ہیں:

إِنَّهُ مُتَّفَقٌ عَلَى صِحَّتِهِ . ”بلاشبہ اس کی صحت پر اہل علم کا اتفاق ہے۔“

(إعلام العالم بعد رسوخه بناسخ الحديث ومنسوخه، ص: 343)

④ حافظ، ابو الفضل، عبد الرحیم بن حسین، عراقی رحمہ اللہ (725-806ھ) فرماتے ہیں:

وَهُوَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . ”اس کی صحت پر اتفاق ہے۔“ (شرح البقرة والتذكرة: 2/66)

⑤ حافظ، ابو الحسن، علی بن محمد بن عبد الصمد، سخاوی رحمہ اللہ (558-643ھ) بھی

فرماتے ہیں:

وَهُوَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . ”یہ حدیث متفق علیہ ہے۔“ (فتح المغیث: 3/350)

⑥ امیر المؤمنین فی الحدیث، امام، ابو عبد اللہ، محمد بن اسماعیل، بخاری رحمہ اللہ

(194-256ھ) فرماتے ہیں:

وَبَيَّنَهُ عَلِيُّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ مَنْسُوخٌ .

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے بیان کیا ہے کہ متعہ منسوخ ہو گیا ہے۔“

(صحيح البخاري، تحت الحديث: 5119)

## ایک شبہ اور اس کا ازالہ :

اس حدیث میں یوم خیبر کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ متعہ غزوہ خیبر کے موقع پر حرام ہوا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اس حدیث میں یوم خیبر کے الفاظ راوی کا وہم ہیں، کیونکہ امام زہری رحمہ اللہ کے تمام شاگرد یوم خیبر کے الفاظ بیان کرنے میں متفق ہیں۔

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیٹے سالم رحمہ اللہ بیان

کرتے ہیں: إِنَّ رَجُلًا سَأَلَ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ عَنِ الْمُتْعَةِ، فَقَالَ :

حَرَامٌ، قَالَ : فَإِنَّ فَلَانًا يَقُولُ فِيهَا، فَقَالَ : وَاللَّهِ ! لَقَدْ عَلِمَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَرَّمَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ، وَمَا كُنَّا مُسَافِحِينَ.

”ایک آدمی نے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے متعہ کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے فرمایا: یہ حرام ہے۔ اس نے کہا: فلاں شخص اس کے جواز کا قائل ہے، تو فرمایا: اللہ کی قسم! یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ غزوہ خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ نے اسے حرام قرار دے دیا تھا۔ ہم زنا کار نہیں۔“ (الموطأ لابن وهب: 249، صحيح أبي عوانة: 29/3، شرح معاني الآثار للطحاوي: 25/3، السنن الكبرى للبيهقي: 207/7، وسنده صحيح)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ”قوی“ قرار دیا ہے۔ (التلخیص الحبير: 155/3)

**تنبیہ ①:** علامہ، ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ (691-751ھ) لکھتے ہیں:

”خیبر کے زمانہ میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس زمانہ میں متعہ حرام ہو، کیونکہ خیبر میں ساری کی ساری عورتیں یہودی تھیں، ان سے متعہ ممکن نہیں تھا، اس لیے کہ اس وقت اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہی نہیں تھا، تو ان سے متعہ کیسے صحیح تھا؟ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح سورۃ المائدہ کی آیت ﴿الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ﴾ کے نزول کے بعد جائز ہوا۔ یہ سورت بالکل آخری سورتوں میں سے ہے۔“ (دیکھیں زاد المعاد: 460/3)

اس کے جواب میں شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لَمْ يَقَعْ فِي الْحَدِيثِ التَّصْرِيحُ بِأَنَّهُمْ اسْتَمْتَعُوا فِي خَيْبَرَ، وَإِنَّمَا فِيهِ مُجَرَّدُ النَّهْيِ، فَيُؤْخَذُ مِنْهُ أَنَّ التَّمَتُّعَ مِنَ النِّسَاءِ كَانَ حَلَالًا.

”حدیث میں یہ صراحت تو نہیں ملتی کہ صحابہ کرام نے غزوہ خیبر کے موقع پر فی الواقع متعہ کیا تھا۔ اس حدیث میں تو صرف ممانعت کا ذکر ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس دور میں متعہ حلال تھا۔“ (فتح الباری: 171/9)



نیز فرماتے ہیں: **يُمْكِنُ أَنْ يُجَابَ بِأَنَّ يَهُودَ خَيْبَرَ كَانُوا يُصَاهِرُونَ الْأَوْسَ وَالْخَزْرَجَ قَبْلَ الْإِسْلَامِ، فَيَجُوزُ أَنْ يَكُونَ هُنَاكَ مِنْ نِسَائِهِمْ مَنْ وَقَعَ التَّمَتُّعُ بِهِنَّ، فَلَا يَنْهَضُ الْإِسْتِدْلَالُ بِمَا قَالَ.**

”اس کا یہ جواب بھی ہو سکتا ہے کہ خیبر کے یہود اسلام سے قبل اوس و خزرج سے سرالی رشتے رکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ ان کی عورتوں سے متعہ ہوا ہو، لہذا ابن قیم رحمہ اللہ کے بیان کردہ احتمال سے استدلال درست نہیں۔“ (فتح الباری: 170/9)

**تنبیہ ②:** سنن نسائی کی ایک روایت (3369) میں یوم خیبر کی بجائے یوم حنین کے الفاظ ہیں۔

یوم حنین کے الفاظ وہم پر مبنی ہیں، انہیں بیان کرنے میں عبد الوہاب ثقفی منفرد ہے۔ باقی سارے راوی یوم خیبر ہی بیان کرتے ہیں۔

ان الفاظ کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

**وَالظَّاهِرُ أَنَّهُ تَصْحِيفٌ مِّنْ خَيْبَرَ.**

”ظاہر ہے کہ یہ خیبر سے تصحیف (پڑھنے میں غلطی) ہوئی ہے۔“ (التلخیص الحیبر: 155/3)

اب فتح مکہ کے موقع پر ہونے والی ابدی حرمت ملاحظہ فرمائیں:

**حدیث نمبر ②:** سیدنا سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

**«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنِّي قَدْ كُنْتُ أَذْنُتُ لَكُمْ فِي الْإِسْتِمْتَاعِ مِنَ النِّسَاءِ، وَإِنَّ اللَّهَ قَدْ حَرَّمَ ذَلِكَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ مِنْهُنَّ**

شَيْءٌ فَلْيُخَلِّ سَبِيلَهُ، وَلَا تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا» .

”لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے نکاح متعہ کرنے کی اجازت دی تھی، لیکن اب اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔ جس کے پاس نکاح متعہ والی کوئی عورت ہو، وہ اس کا راستہ چھوڑ دے اور جو تم نے ان کو دے دیا، اس میں سے کوئی چیز واپس نہ لو۔“  
(صحیح مسلم: 21/1406)

ایک روایت (صحیح مسلم: 1406) میں یہ الفاظ بھی ہیں:

رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَائِمًا بَيْنَ الرُّكْنِ وَالْبَابِ، وَهُوَ يَقُولُ . ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ حجر اسود اور دروازے کے درمیان کھڑے ہوئے یہ فرما رہے تھے۔“

دوسری روایت (صحیح مسلم: 22/1406) میں ہے:

أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمُتْعَةِ عَامَ الْفَتْحِ، حِينَ دَخَلْنَا مَكَّةَ، ثُمَّ لَمْ نَخْرُجْ مِنْهَا حَتَّى نَهَانَا عَنْهَا . ”رسول اکرم ﷺ نے ہمیں فتح مکہ والے سال مکہ میں داخل ہوتے ہوئے متعہ کی اجازت دی، پھر ہم نکلے نہیں تھے کہ آپ ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرما دیا۔“

تیسری روایت (صحیح مسلم: 25/1406) کے الفاظ یوں ہیں:

نَهَى يَوْمَ الْفَتْحِ عَنِ مُتْعَةِ النِّسَاءِ .

”آپ ﷺ نے ہمیں عورتوں سے متعہ کرنے سے منع فرما دیا۔“

چوتھی روایت میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے:

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْمُتْعَةِ، وَقَالَ: «أَلَا إِنَّهَا

حَرَامٌ مِّنْ يَّوْمِكُمْ هَذَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ كَانَ أَعْطَى شَيْئًا فَلَا يَأْخُذْهُ». ”بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ نے متعہ سے منع کیا اور ارشاد فرمایا: خبردار! یہ آج کے دن سے قیامت تک کے لیے حرام ہو گیا ہے۔ جس نے (کسی عورت کو متعہ کے عوض) کوئی چیز دی ہو، وہ واپس نہ لے۔“ (صحیح مسلم: 28/1406)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع پر نکاح متعہ حرام کیا گیا، پھر بہت ہی محدود عرصے، تقریباً تین دن، کے لیے فتح مکہ کے موقع پر اس کی اجازت دی گئی اور اس کے بعد فتح مکہ والے دن اسے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا گیا۔

متعہ کی حرمت کے حوالے سے دیگر روایات کا جائزہ

### متعہ کی حرمت اور غزوہ اوطاس!

سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

رَخَّصَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ أُوطَاسٍ فِي الْمُتْعَةِ ثَلَاثًا، ثُمَّ نَهَى عَنْهَا.

”رسول اللہ ﷺ نے اوطاس والے سال متعہ کی تین دن اجازت دی، پھر اس سے

منع فرما دیا۔“ (صحیح مسلم: 18/1405)

ظاہری طور پر ان دونوں احادیث میں قیامت تک متعہ حرام ہونے کا موقع الگ الگ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ دونوں احادیث ایک ہی بات کو بیان کر رہی ہیں۔

ان میں جمع و تطبیق کرتے ہوئے امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَعَامَ أُوطَاسٍ وَعَامَ الْفَتْحِ وَاحِدٌ، فَأُوطَاسٌ وَإِنْ كَانَتْ بَعْدَ الْفَتْحِ، فَكَانَتْ فِي عَامِ الْفَتْحِ بَعْدَهُ بَيَسِيرٍ، فَمَا نَهَى عَنْهُ؛ لَا فَرْقَ بَيْنَ أَنْ يُنْسَبَ إِلَى

عَامَ أَحَدِهِمَا أَوْ إِلَى الْآخِرِ، وَفِي رِوَايَةٍ سَبْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ مَا دَلَّ عَلَى أَنَّ الْإِذْنَ فِيهِ كَانَ ثَلَاثًا، ثُمَّ وَقَعَ التَّحْرِيمُ، كَمَا هُوَ فِي رِوَايَةِ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ، فَرِوَايَتُهُمَا تَرْجِعُ إِلَى وَقْتٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ إِنْ كَانَ الْإِذْنُ فِي رِوَايَةِ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ بَعْدَ الْفَتْحِ فِي غَزْوَةِ أُوطَاسٍ، فَقَدْ نُقِلَ نَهْيُهُ عَنْهَا بَعْدَ الْإِذْنِ فِيهَا، وَلَمْ يَثْبُتِ الْإِذْنُ فِيهَا بَعْدَ غَزْوَةِ أُوطَاسٍ، فَبَقِيَ تَحْرِيمُهَا إِلَى الْآبَدِ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ!

”غزوہ اوطاس اور فتح مکہ کا سال ایک ہی ہے۔ اوطاس کا واقعہ اگرچہ بعد میں وقوع پذیر ہوا، لیکن یہ اسی سال فتح مکہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ہوا تھا۔ لہذا اس ممانعت کو غزوہ اوطاس کے سال کی طرف منسوب کر لیں یا فتح مکہ کے سال کی طرف، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سیدنا سبرہ بن معبد رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تین دن تک متعہ کی اجازت دی گئی تھی، پھر حرمت نازل ہو گئی۔ یہی بات سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ یوں دونوں روایات ایک ہی وقت بتا رہی ہیں۔ اگر سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی روایت میں واقعہ فتح مکہ کے بعد غزوہ اوطاس ہی میں متعہ کی اجازت بیان ہوئی ہو، تو بھی اس اجازت کے بعد متعہ سے ممانعت مروی ہے اور اس کے بعد اس کی اجازت بالکل مروی نہیں، لہذا اس طرح بھی متعہ کی ابدی حرمت باقی ہے۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی: 204/7)

یعنی فتح مکہ اور غزوہ اوطاس ایک ہی سال میں ہوئے، لہذا کسی نے اسے فتح مکہ کی طرف منسوب کیا اور کسی نے غزوہ اوطاس کی طرف۔ یہ واقعہ ایک ہی ہے اور دراصل فتح مکہ کے موقع پر ہی متعہ کی ابدی حرمت کا اعلان فرما دیا گیا تھا۔

### ایک اشکال اور اس کا ازالہ :

یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ جب متعہ غزوہ خیبر میں حرام

ہونے کے بعد فتح مکہ کے موقع پر تین دن کے لیے دوبارہ جائز ہوا تھا اور پھر ابدی طور پر حرام ہوا تھا، تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو چاہیے تھا کہ وہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو متعہ کے حوالے سے فتح مکہ والی حرمت ہی ذکر کرتے، نہ کہ غزوہ خیبر والی، جو بعد میں منسوخ بھی ہو گئی تھی؟ اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَأَمَّا أَنْ يَكُونَ الْإِدْنُ الَّذِي وَقَعَ عَامَ الْفَتْحِ لَمْ يَبْلُغْ عَلَيْهِ، لِقِصْرِ مُدَّةِ الْإِدْنِ، وَهُوَ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ.

”ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جو اجازت دی گئی تھی، وہ بہت مختصر عرصے، یعنی صرف تین دن کے لیے دی گئی تھی، اس لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع نہ پہنچ سکی ہوگی۔“ (فتح الباری فی شرح صحیح البخاری: 171/9)

نیز فرماتے ہیں:

يُمْكِنُ الْإِنْفِصَالُ عَنْ ذَلِكَ بِأَنَّ عَلَيْهِ لَمْ تَبْلُغْهُ الرُّخْصَةُ فِيهَا يَوْمَ الْفَتْحِ، لَوْفُوعِ النَّهْيِ عَنْهَا عَنْ قُرْبٍ.

”اس اشکال سے بچنے کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو فتح مکہ کے دن متعہ کے بارے میں اجازت معلوم نہ ہو سکی، کیونکہ فوراً ہی تو دوبارہ متعہ سے منع فرما دیا گیا تھا۔“ (فتح الباری: 169/9)

## متعہ کی حرمت اور حجة الوداع!

گزشتہ صفحات میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ نکاح متعہ کی حرمت ایک بار غزوہ خیبر کے موقع پر ہوئی، پھر فتح مکہ کے سال تین دن کے لیے اس کی رخصت دی گئی، پھر رسول اللہ ﷺ نے قیامت تک کے لیے اسے حرام فرما دیا۔ اس حقیقت کے برعکس کچھ روایات میں حجة الوداع کا تذکرہ ملتا ہے، اس بارے میں تحقیق ملاحظہ فرمائیں:

سیدنا سبرہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک روایت یوں ہے:

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ، يَنْهَى عَنْ نِكَاحِ الْمُتَعَةِ. ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے موقع پر

نکاح متعہ سے منع فرماتے ہوئے سنا۔“ (مسند الإمام أحمد: 404/3، سنن أبي داود: 2072)

یہ روایت ”شاذ“ (ضعیف) ہے۔ اسماعیل بن امیہ راوی نے اسے بیان کرنے میں امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت، جن میں معمر بن راشد، صالح بن کیسان، سفیان بن عیینہ، عمرو بن حارث شامل ہیں، کی مخالفت کی ہے۔

اس بارے میں امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَرَوَايَةُ الْجَمَاعَةِ أَوْلَى. ”امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کرنے والے

زیادہ شاگردوں کی روایت رائج ہے۔“ (السنن الكبرى للبيهقي: 204/7)

پھر اس روایت میں صرف متعہ سے ممانعت کا ذکر ہے، متعہ کی اجازت کا نہیں، لہذا اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے، تو اس کا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی ابدی حرمت کا اعلان توفیق مکہ والے سال ہی فرما دیا تھا، البتہ مزید تاکید کے لیے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے حجۃ الوداع کے موقع پر بھی اس کا اعلان فرما دیا۔

اسی بات کو بیان کرتے ہوئے شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فَلَعَلَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرَادَ إِعَادَةَ النَّهْيِ لِشَيْعٍ وَيَسْمَعَهُ مَنْ لَمْ يَسْمَعَهُ قَبْلَ ذَلِكَ. ”شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کا اعلان دوبارہ اس

لیے کر دیا ہو کہ یہ بات خوب نشر ہو جائے اور جو پہلے نہیں سن پایا تھا، اب سن لے۔“

(فتح الباري: 170/9)



سنن ابن ماجہ (1692) وغیرہ میں ربیع بن سبرہ سے بیان کرتے ہوئے عبد العزیز بن عمر راوی نے بھی حجۃ الوداع کے ”شاذ“ الفاظ بیان کیے ہیں، جیسا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَكَذَلِكَ رَوَاهُ جَمَاعَةٌ مِّنَ الْأَكَابِرِ؛ ابْنُ جُرَيْجٍ وَالثَّوْرِيُّ وَغَيْرُهُمَا، عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ عُمَرَ، وَهُوَ وَهُمْ، فِرَوَايَةُ الْجُمْهُورِ عَنِ الرَّبِيعِ بْنِ سَبْرَةَ أَنَّ ذَلِكَ كَانَ زَمَنَ الْفَتْحِ.

”اسی طرح اکابر محدثین کی ایک جماعت، مثلاً ابن جریج اور سفیان ثوری وغیرہ نے عبد العزیز بن عمر سے حجۃ الوداع کے الفاظ نقل کیے ہیں، لیکن یہ (عبد العزیز بن عمر کا) وہم ہے۔ زیادہ راویوں نے ربیع بن سبرہ سے یہی بیان کیا ہے کہ متعہ کی حرمت فتح مکہ کے موقع پر ہوئی تھی۔“ (السنن الکبریٰ للبیہقی: 207/7)

ثابت ہوا کہ صحیح الفاظ وہی ہیں، جو صحیح مسلم وغیرہ میں مروی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے متعہ سے فتح مکہ والے سال منع فرمایا تھا۔

اسی بارے میں شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَأَمَّا حَجَّةُ الْوَدَاعِ؛ فَهُوَ اخْتِلَافٌ عَلَى الرَّبِيعِ بْنِ سَبْرَةَ، وَالرِّوَايَةُ عَنْهُ بِأَنَّهَا فِي الْفَتْحِ أَصَحُّ وَأَشْهَرُ.

”رہا (متعہ کی حرمت کے سلسلے میں) حجۃ الوداع (کا ذکر)، تو اس بارے میں ربیع بن سبرہ سے بیان کرنے میں کسی سے اختلاف ہوا ہے۔ ان سے صحیح ترین اور مشہور ترین روایت یہی ہے کہ متعہ کی حرمت فتح مکہ کے موقع پر ہوئی۔“ (فتح الباری: 170/9)

یاد رہے کہ طیوریات (2/740) والی روایت امام زہری رحمہ اللہ کی ”تدلیس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔

## متعہ کی حرمت اور غزوہ تبوک!

❀ فقیہ امت، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، فَزَلْنَا ثِيَّةَ الْوَدَاعِ، فَرَأَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَصَابِيحَ، وَرَأَى نِسَاءً يَبْكِينَ، فَقَالَ: «مَا هَذَا؟»، فَقِيلَ: نِسَاءٌ تُمْتَعُ مِنْهُنَّ بَيْكِينَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «حَرَمَ [أَوْ قَالَ: هَدَمَ] الْمُتَعَةَ النَّكَاحُ، وَالطَّلَاقُ، وَالْعِدَّةُ، وَالْمِيرَاثُ».

”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں غزوہ تبوک کے لیے نکلے۔ دورانِ سفر ہم ثیۃ الوداع کے مقام پر ٹھہرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چراغوں کو جلتے اور عورتوں کو روتے دیکھا، تو فرمایا: یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا: یہ وہ عورتیں ہیں جن سے متعہ کیا گیا تھا، وہ رو رہی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح، طلاق، عدت اور وراثت نے متعہ کو حرام کر دیا ہے۔“

(مسند أبي يعلى : 6625، سنن الدارقطني : 259/3، شرح معاني الآثار للطحاوي : 26/3، وسنده حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ (4149) نے ”صحیح“ کہا ہے، جبکہ حافظ ابن قطان فاسی (بیان الوهم والإيهام الواقعين في كتاب الأحكام : 84/5) اور حافظ ابن حجر (التلخيص الحبير : 154/3، ح : 1500) رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو ”حسن“ قرار دیا ہے۔

اس کا راوی مؤمل بن اسماعیل جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ثقة، حسن الحدیث“ ہے۔ اس حدیث سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ غزوہ تبوک کے موقع پر متعہ کی حرمت ہوئی، بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے متعہ کی حرمت نازل ہو چکی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس





موقع پر اس کو دوبارہ بیان فرمادیا۔

شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

وَأَمَّا قِصَّةُ تَبُوكَ؛ فَلَيْسَ فِي حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ التَّصْرِيحُ بِأَنَّهُمْ اسْتَمْتَعُوا مِنْهُنَّ فِي تِلْكَ الْحَالَةِ، فَيَحْتَمِلُ أَنْ يَكُونَ ذَلِكَ وَقَعَ قَدِيمًا، ثُمَّ وَقَعَ التَّوْدِيعُ مِنْهُنَّ حِينَئِذٍ وَالنَّهْيُ، أَوْ كَانَ النَّهْيُ وَقَعَ قَدِيمًا، فَلَمْ يَبْلُغْ بَعْضُهُمْ فَاسْتَمَرَ عَلَى الرُّخْصَةِ.

”غزوہ تبوک کے سلسلے میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ تصریح نہیں کہ صحابہ کرام نے اس موقع پر عورتوں سے متعہ کیا۔ ممکن ہے کہ متعہ تو پہلے ہی ہوا ہو، لیکن عورتوں سے جدائی اس وقت ہوئی ہو اور اسی وقت یہ ممانعت بھی بیان ہو گئی ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ممانعت پہلے سے ہو گئی ہو، لیکن بعض صحابہ کرام کو اس کا علم نہ ہوا ہو اور وہ اس رخصت پر عمل کرتے رہے ہوں۔“ (فتح الباری: 170/9)

✽ سیدنا جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى غَزْوَةِ تَبُوكَ، حَتَّى إِذَا كُنَّا عِنْدَ الْعُقَبَةِ مِمَّا يَلِي الشَّامَ، جَاءَتْ نِسْوَةٌ، فَذَكَّرْنَا تَمْتَعَنَا، وَهُنَّ يَجُلْنَ فِي رِحَالِنَا، أَوْ قَالَ: يَطْفُنَّ فِي رِحَالِنَا، فَجَاءَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَنَظَرَ إِلَيْهِنَّ، فَقَالَ: «مَنْ هَؤُلَاءِ النِّسْوَةُ؟»، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! نِسْوَةٌ تَمْتَعْنَا مِنْهُنَّ، فَغَضِبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، حَتَّى احْمَرَّتْ وَجَنَّتَاهُ، وَتَمَعَّرَ لَوْنُهُ، وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ، فَقَامَ فِينَا، فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْنَى

عَلَيْهِ، ثُمَّ نَهَى عَنِ الْمُتْعَةِ، فَتَوَادَعْنَا يَوْمَئِذٍ الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ، وَلَمْ نَعُدْ، وَلَا نَعُودُ لَهَا أَبَدًا، فَبِهَا سُمِّيَتْ يَوْمَئِذٍ ثَنِيَّةُ الْوَدَاعِ.

”ہم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں غزوہ تبوک کے لیے نکلے۔ جب ہم شام کی طرف عقبہ کے قریب پہنچے، تو کچھ عورتیں آئیں۔ ہم نے ان سے متعہ کا معاہدہ کر لیا، وہ ہمارے خیموں میں گھوم پھر رہی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ عورتوں کو دیکھ کر آپ ﷺ نے استفسار فرمایا کہ یہ کون ہیں؟ ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ وہ عورتیں ہیں، جن سے ہم نے متعہ کیا ہے۔ آپ ﷺ غصے میں آ گئے، حتیٰ کہ رخسار مبارک سرخ ہو گئے اور چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آپ ﷺ خطبے کے لیے کھڑے ہوئے، اللہ کی حمد و ثنا کی، پھر ہمیں متعہ سے منع فرما دیا۔ ہم مردوں اور عورتوں نے اسی وقت جدائی اختیار کر لی۔ دوبارہ کبھی ایسا نہیں کیا، نہ اب کبھی کریں گے۔ اسی بنا پر اس جگہ کا نام ثنیۃ الوداع (جدائی کی گھاٹی) پڑ گیا۔“

(الاعتبار فی النسخ والمنسوخ من الآثار، ص: 178، نصب الراية للزيلعي: 179/3)

لیکن یہ روایت باطل (جھوٹی) ہے، کیونکہ:

① اس کا راوی عباد بن کثیر ”متروک“ ہے۔

② عبد اللہ بن محمد بن عقیل راوی جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“

ہے۔ اس کے بارے میں حافظ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ضَعِيفٌ عِنْدَ الْأَكْثَرِينَ. ”اکثر محدثین کرام نے اسے ضعیف کہا ہے۔“

(المجموع شرح المہذب: 155/1)

علامہ مناوی رحمہ اللہ حافظ ابوالفتح یعمری سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ضَعَّفَهُ الْأَكْثَرُ لِسُوءِ حِفْظِهِ. ”جمہور محدثین کرام نے اس کے



حافظ کی خرابی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔“ (فیض القدیر: 527/5)

## متعہ اور عمرہ القضاء!

امام معمر اور امام حسن بصری رحمہما اللہ کی طرف منسوب ہے کہ:

مَا حَلَّتِ الْمُتَعَةُ قَطُّ، إِلَّا ثَلَاثًا فِي عُمْرَةِ الْقَضَاءِ، مَا حَلَّتْ قَبْلَهَا وَلَا بَعْدَهَا. ”متعہ صرف عمرہ القضاء کے دوران تین دن حلال ہوا تھا، اس سے

پہلے یا بعد کبھی حلال نہیں ہوا۔“ (مصنّف عبد الرزّاق: 503/7، 504، ح: 14040)

یہ قول امام عبد الرزّاق رحمہ اللہ کی ”تدلیس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔

کیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے متعہ کو حرام کیا تھا؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں متعہ حلال ہی تھا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس کو حرام قرار دیا تھا۔ آئیے ان کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

✽ صحابی رسول، سیدنا جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

كُنَّا نَسْتَمْتِعُ بِالْقَبْضَةِ مِنَ التَّمْرِ وَالْدَّقِيقِ، الْيَّامَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبِي بَكْرٍ، حَتَّى نَهَى عَنْهُ عُمَرُ، فِي شَأْنِ عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ.

”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کھجوروں اور آٹے کی ایک مٹھی کے عوض متعہ کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن حرث کے معاملے میں ہمیں اس سے منع فرما دیا۔“ (صحیح مسلم: 16/1405)

اس حدیث سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں متعہ سے روکا، یہ نہیں کہ انہوں نے خود اسے حرام کیا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعہ کی حرمت معلوم نہیں ہو سکتی تھی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بتانے پر معلوم ہو گئی۔ سیدنا

عمرؓ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں متعہ سے روکا، تو یہی بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے حرام کر دیا تھا، جیسا کہ سیدنا عبد اللہ بن عمرؓ بتایا کرتے ہیں:

لَمَّا وَلِيَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ خَطَبَ النَّاسَ، فَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَذِنَ لَنَا فِي الْمُتْعَةِ ثَلَاثًا، ثُمَّ حَرَّمَهَا، وَاللَّهِ! لَا أَعْلَمُ أَحَدًا يَتَمَتَّعُ وَهُوَ مُحَصَّنٌ، إِلَّا رَجَمْتُهُ بِالْحِجَارَةِ، إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنِي بِأَرْبَعَةٍ يَشْهَدُونَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ أَحْلَاهَا بَعْدَ إِذْ حَرَّمَهَا.

”جب سیدنا عمر بن خطابؓ خلیفہ بنے، تو انہوں نے لوگوں سے یوں خطاب فرمایا: بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں (فتح مکہ کے موقع پر) تین دن متعہ کی اجازت دی، پھر اسے حرام کر دیا۔ اللہ کی قسم! میں اگر کسی بھی شادی شدہ کو متعہ کرتا پاؤں گا، تو اسے پتھروں سے رجم کر دوں گا، سوائے اس صورت کے کہ وہ چار ایسے گواہ لائے، جو گواہی دیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے متعہ کو حرام کرنے کے بعد پھر حلال کر دیا تھا۔“ (سنن ابن ماجہ: 1963، وسندہ حسن)

اسی لیے شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجرؒ اللہ لکھتے ہیں:

ثَبَّتَ نَهْيُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهَا فِي حَدِيثِ الرَّبِيعِ ابْنِ سَبْرَةَ بْنِ مَعْبُدٍ عَنْ أَبِيهِ، بَعْدَ الْإِذْنِ فِيهِ، وَلَمْ نَجِدْ عَنْهُ الْإِذْنَ فِيهِ بَعْدَ النَّهْيِ عَنْهُ، فَنَهْيُ عُمَرَ مُوَافِقٌ لِنَهْيِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قُلْتُ: وَتَمَامُهُ أَنْ يُقَالَ لَعَلَّ جَابِرًا وَمَنْ نُقِلَ عَنْهُ اسْتِمْرَارُهُمْ عَلَى ذَلِكَ بَعْدَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى أَنْ نَهَى عَنْهَا عُمَرُ لَمْ يَبْلُغْهُمْ النَّهْيُ، وَمِمَّا يُسْتَفَادُ أَيْضًا أَنَّ عُمَرَ لَمْ يَنْهَ عَنْهَا اجْتِهَادًا، وَإِنَّمَا نَهَى عَنْهَا مُسْتَنِدًّا إِلَى نَهْيِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَقَدْ وَقَعَ التَّصْرِيحُ عَنْهُ بِذَلِكَ فِيمَا أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهٍ مِنْ طَرِيقِ أَبِي بَكْرٍ بْنِ حَفْصٍ، عَنْ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: لَمَّا وَلِيَ عُمَرُ خَطْبًا، فَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَذِنَ لَنَا فِي الْمُتَعَةِ ثَلَاثًا، ثُمَّ حَرَّمَهَا.

”رسول اللہ ﷺ کا متعہ کی اجازت دینے کے بعد اس سے منع کرنا سبرہ بن معبد رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث میں ثابت ہے، جبکہ ممانعت کے بعد اس کی اجازت ثابت نہیں۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا متعہ سے منع کرنا رسول اللہ ﷺ کی ممانعت کی موافقت میں تھا۔ یہ بات تب سمجھ میں آتی ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ اور ان لوگوں کو، جو رسول اللہ ﷺ کے بعد متعہ کرتے رہے اور ان کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے روکا، ان لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے کا علم نہیں ہوا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے متعہ سے روکنے کا عمل اپنے اجتہاد سے نہیں کیا تھا، بلکہ اس ممانعت کی دلیل انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے ہی کو بنایا تھا۔ اس بات کی تصریح سنن ابن ماجہ کی اس روایت میں موجود ہے، جو سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی بیان کردہ ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں (فتح مکہ کے موقع پر) تین دن متعہ کی اجازت دی تھی، پھر اس سے (ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) منع فرما دیا۔“ (فتح الباری: 9/172)

نیز یہ حدیث تو اس بات کی دلیل ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی متعہ شریعتِ اسلامیہ میں منسوخ اور حرام تھا، اسی لیے تو وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بتانے پر اس کے قائل ہو گئے، ورنہ جس چیز کی رخصت رسول اللہ ﷺ نے دی ہو، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس کو کیسے حرام کر سکتے ہیں اور ان کے کہنے پر دوسرے صحابہ کرام کیونکر اس سے رُک سکتے ہیں؟

جیسا کہ امام طحاوی حنفی رحمہ اللہ (238-321ھ) فرماتے ہیں:

وَأَمَّا قَوْلُ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: كُنَّا نَتَمَتَّعُ حَتَّى نَهَانَا عَنْهَا عُمَرُ، فَقَدْ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ لَمْ يَعْلَمْ بِتَحْرِيمِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِيَّاهَا، حَتَّى عَلِمَهُ مِنْ قَوْلِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، وَفِي تَرْكِهِ مَا قَدْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبَاحَهُ لَهُمْ، دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ الْحُجَّةَ قَدْ قَامَتْ عِنْدَهُ عَلَى نَسْخِ ذَلِكَ وَتَحْرِيمِهِ.

”رہا سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ ہم متعہ کرتے رہے، حتیٰ کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیں اس سے روک دیا، تو ہو سکتا ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کا متعہ سے روکنا معلوم نہ ہوا ہو اور اس ممانعت کا علم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے روکنے سے ہی ہوا ہو۔ پھر سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کی جائز کی ہوئی رخصت سے رُک جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک اس کا منسوخ اور حرام ہونا (رسول اللہ ﷺ سے) ثابت ہو چکا تھا۔“ (شرح معانی الآثار: 26/3)

## متعہ اور علمائے امت

### صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فتویٰ:

صحابی رسول، سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يَنْكِحَ امْرَأَةً إِلَّا نِكَاحَ الْإِسْلَامِ، يُمَهِّرُهَا، وَيَرِثُهَا وَتَرِثُهُ، وَلَا يُقَاضِيهَا عَلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ، إِنَّهَا امْرَأَتُهُ، فَإِنْ مَاتَ أَحَدُهُمَا لَمْ يَتَوَارَثَا.

”کسی مرد کے لیے جائز نہیں کہ کسی عورت سے اسلام کے نکاح کے علاوہ کوئی اور نکاح کرے۔ مرد عورت کو حق مہر دے گا اور بیوی (کے فوت ہونے پر اس) کا وارث بنے گا، (اور اس کے فوت ہونے پر) بیوی اس کی وارث بنے گی۔ کوئی مرد عورت سے معین



مدت تک نکاح نہ کرے کہ وہ اس کی بیوی تو ہو، لیکن اگر وہ فوت ہو جائے، تو وہ اس کی وارث نہ بن سکے۔“ (السنن الكبرى للبيهقي: 207/7، وسنده صحيح)

✽ امام عروہ بن زبیر تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ الزُّبَيْرِ قَامَ بِمَكَّةَ، فَقَالَ: إِنَّ نَاسًا أَعْمَى اللَّهُ قُلُوبَهُمْ، كَمَا أَعْمَى أَبْصَارَهُمْ، يُفْتَنُونَ بِالْمُتْعَةِ، يُعْرِضُونَ بِرَجُلٍ، فَنَادَاهُ، فَقَالَ: إِنَّكَ لَجِلْفٌ جَافٍ، فَلَعَمْرِي، لَقَدْ كَانَتِ الْمُتْعَةُ تُفْعَلُ عَلَى عَهْدِ إِمَامِ الْمُتَّقِينَ، يُرِيدُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ لَهُ ابْنُ الزُّبَيْرِ: فَجَرَّبَ بِنَفْسِكَ، فَوَاللَّهِ، لَئِنْ فَعَلْتَهَا لَأَرْجُمَنَّكَ بِأَحْبَارِكَ.

”سیدنا عبد اللہ بن زبیر رحمہ اللہ مکہ میں کھڑے ہوئے اور ایک شخص کی طرف تعریض کرتے ہوئے فرمایا: کچھ لوگوں کی جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنکھیں اندھی کی ہیں، ان کے دل بھی اندھے کر دیئے ہیں اور وہ متعہ کے جواز کا فتویٰ دے رہے ہیں۔ پھر انہوں نے اس آدمی کو بلایا، تو وہ کہنے لگا: تم بڑے سخت طبع آدمی ہو، قسم سے متعہ تو امام المتقین، یعنی رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ہوتا رہا ہے۔ اس پر سیدنا عبد اللہ بن زبیر رحمہ اللہ فرمانے لگے: اپنی ذات پر ذرا تجربہ تو کرو۔ اللہ کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا، تو میں ضرور تمہیں تیرے پھروں کے ساتھ رجم کر دوں گا۔“ (صحیح مسلم: 27/1406)

**سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا رجوع:**

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نکاحِ متعہ کو جائز سمجھتے تھے، لیکن جب انہیں متعہ کی حرمت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان معلوم ہوا، تو انہوں نے اپنے موقف سے رجوع فرما لیا تھا، جیسا کہ:

ابوجرہ، نصر بن عمران تابعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

سَأَلْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ، فَقَالَ مَوْلَى لَهُ: إِنَّمَا كَانَ ذَلِكَ فِي الْغَزْوِ، وَالنِّسَاءُ قَلِيلٌ، فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا: صَدَقْتَ.

”میں نے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عورتوں کے متعہ کے بارے میں سوال کیا، تو ان کے غلام نے کہا: یہ تو اس وقت غزوات میں جائز ہوتا تھا، جب عورتیں کم تھیں۔ اس پر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تُو نے سچ کہا ہے۔“

(شرح معانی الآثار للطحاوی: 26/3، وسندہ حسن)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد امام طحاوی حنفی لکھتے ہیں:

هَذَا ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا يَقُولُ: إِنَّمَا أُبِيحَتْ وَالنِّسَاءُ قَلِيلٌ، أَيْ فَلَمَّا كَثُرَ ارْتَفَعَ الْمَعْنَى الَّذِي مِنْ أَجْلِهِ أُبِيحَتْ.

”یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، جو فرما رہے ہیں کہ متعہ اس وقت جائز قرار دیا گیا تھا، جب عورتیں کم تھیں۔ یعنی جب عورتیں زیادہ ہو گئیں، تو وہ سب ختم ہو گیا، جس کی بنا پر اسے جائز قرار دیا گیا تھا (لہذا اسے حرام کر دیا گیا)۔“ (شرح معانی الآثار: 26/3)

مشہور لغوی، ابن منظور، افریقی (282-370ھ) لکھتے ہیں:

فَالثَّابِتُ عِنْدَنَا أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ كَانَ يَرَاهَا حَلَالًا، ثُمَّ لَمَّا وَقَفَ عَلَى نَهْيِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهَا رَجَعَ عَنْ إِحْلَالِهَا.

”ہمارے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما متعہ کو حلال سمجھتے تھے، پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا تھا، تو انہوں نے اس کو حلال قرار دینے سے رجوع فرما لیا تھا۔“ (لسان العرب: 330/8)



امام ابو عبیدہ، قاسم بن سلام رحمہ اللہ (150-224 ھ) فرماتے ہیں:

وَلَا نَعْلَمُ أَحَدًا مِّنَ الصَّحَابَةِ كَانَ يَتَرَخَّصُ فِيهَا، إِلَّا مَا كَانَ مِنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، فَإِنَّهُ كَانَ ذَلِكَ مَعْرُوفًا مِّنْ رَّأْيِهِ، ثُمَّ بَلَّغْنَا أَنَّهُ رَجَعَ عَنْهُ.

”ہمارے علم میں کوئی بھی صحابی ایسا نہیں تھا، جو متعہ کی اجازت دیتا ہو، سوائے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کہ ان کا فتویٰ اس بارے میں مشہور تھا، لیکن پھر ہمیں یہ روایت بھی پہنچ گئی کہ انہوں نے اس فتوے سے رجوع فرمالیا تھا۔“ (الناسخ والمنسوخ، ص: 80)

### تابعین اور نکاح متعہ:

امام سعید بن مسیب تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

نَسَخَ الْمُتَّعَةَ الْمِيرَاثُ. ”متعہ کو وراثت نے منسوخ کر دیا ہے۔“

(مصنف ابن أبي شيبة: 551/3، ح: 17070، وسنده صحيح)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد رشید، امام عروہ بن زبیر تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أَلَا وَإِنَّ الْمُتَّعَةَ هِيَ الزَّيْنَا. ”خبردار! نکاح متعہ زنا ہی ہے۔“

(الناسخ والمنسوخ للقياسم بن سلام: 130، مصنف ابن أبي شيبة: 552/3، وسنده حسن)

### امام مالک رحمہ اللہ اور متعہ:

صاحب ہدایہ، علامہ مرغینانی حنفی (م: 593 ھ) نے لکھا ہے:

وَقَالَ مَالِكٌ: هُوَ جَائِزٌ. ”امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ متعہ جائز ہے۔“

(الهداية شرح بداية المبتدي: 333/2)

لیکن امام مالک رحمہ اللہ کی طرف اس قول کی نسبت غلط ہے، اس پر کئی دلائل ہیں:

① امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”موطا“ میں متعہ کی حرمت پر حدیث ذکر کی

ہے۔ شارحِ ہدایہ، علامہ عینی حنفی (762-855ھ) اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

عَادَةُ مَالِكٍ أَنْ لَا يَرْوِيَ حَدِيثًا فِي مُوَطِّئِهِ إِلَّا وَهُوَ يَذْهَبُ وَيَعْمَلُ بِهِ،  
وَلَوْ ذَكَرَ عَنْهُ مَا ذَكَرَهُ الْكَامِلُ لَذَكَرَهُ أَصْحَابُهُ، وَلَمْ يُنْقَلْ عَنْهُ شَيْءٌ مِّنْ ذَلِكَ.

”امام مالک رحمہ اللہ کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی کتابِ موطا میں جو بھی حدیث ذکر کرتے ہیں، اس کے مطابق اپنا مذہب بھی بناتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اگر بات ایسے ہی ہوتی، جیسے اکمل نے ذکر کی ہے (کہ امام مالک رحمہ اللہ متعہ کو جائز سمجھتے تھے)، تو امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد ان سے یہ بات ذکر کرتے، لیکن ان سے ایسی کوئی بات نقل نہیں کی گئی۔“ (البنایۃ شرح الہدایۃ: 63/5)

② علمائے حق میں سے کسی نے اس قول کو امام مالک رحمہ اللہ کی طرف منسوب نہیں کیا۔

③ صاحبِ ہدایہ کے رد میں کاکی حنفی لکھتے ہیں:

هَذَا سَهْوٌ، فَإِنَّ الْمَذْكُورَ فِي كُتُبِ مَالِكٍ حُرْمَةُ نِكَاحِ الْمُتَعَةِ.  
”یہ صاحبِ ہدایہ کی غلطی ہے، کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ کی کتب میں نکاحِ متعہ کی حرمت ذکر کی گئی ہے۔“ (البنایۃ شرح الہدایۃ للعینی الحنفی: 63/5)

④ مالکیوں کی کتابوں میں متعہ کو بالاجماع حرام لکھا گیا ہے۔

⑤ شارحِ ہدایہ، علامہ ابن ہمام حنفی (790-861ھ) لکھتے ہیں:

نَسَبَتْهُ إِلَى مَالِكٍ غَلَطٌ. ”امام مالک کی طرف اس قول کی نسبت غلط ہے۔“

(فتح القدیر: 247/3)

⑥ اس بارے میں ابن نجیم حنفی (م: 790ھ) لکھتے ہیں:

وَمَا فِي الْهَدَايَةِ، مِنْ نَسَبَتِهِ إِلَى مَالِكٍ، فَعَلَطُ، كَمَا ذَكَرَهُ الشَّارِحُونَ.



”ہدایہ میں امام مالک رحمہ اللہ کی طرف جو متعہ کے جواز کی نسبت کی گئی ہے، وہ غلط ہے، جیسا کہ شارحین نے ذکر کیا ہے۔“ (البحر الرائق شرح كنز الدقائق: 115/3)

معلوم ہوا کہ امام مالک رحمہ اللہ کا متعہ کو جائز کہنا قطعاً ثابت نہیں۔

## اہل حجاز اور متعہ:

❁ امام اوزاعی رحمہ اللہ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ:

يُجْتَنَّبُ أَوْ يُتْرَكُ مِنْ قَوْلِ أَهْلِ الْعِرَاقِ خَمْسٌ، وَمِنْ قَوْلِ أَهْلِ الْحِجَازِ خَمْسٌ، وَمِنْ قَوْلِ أَهْلِ الْعِرَاقِ: شُرْبُ الْمُسْكِرِ، وَالْأَكْلُ عِنْدَ الْفَجْرِ فِي رَمَضَانَ، وَلَا جُمُعَةٍ إِلَّا فِي سَبْعَةِ أَمْصَارٍ، وَتَأْخِيرُ صَلَاةِ الْعَصْرِ حَتَّى يَكُونَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ أَرْبَعَةَ أَمْثَالِهِ، وَالْفِرَارُ يَوْمَ الزَّحْفِ، وَمِنْ قَوْلِ أَهْلِ الْحِجَازِ: اسْتِمَاعُ الْمَلَاهِي، وَالْجَمْعُ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ مِنْ غَيْرِ عَذْرِ، وَالْمُتَعَةُ بِالنِّسَاءِ، وَالذَّرْهَمُ بِالذَّرْهَمَيْنِ، وَالذِّينَارُ بِالذِّينَارَيْنِ يَدًا بِيَدٍ، وَإِيتَانُ النِّسَاءِ فِي أَذْبَارِهِنَّ.

”پانچ اقوال اہل عراق کے اور پانچ اقوال اہل حجاز کے چھوڑ دیئے جائیں؛ اہل عراق کے یہ پانچ قول ترک کیے جائیں: ① نشہ آور چیز پینا۔ ② رمضان میں فجر کے نزدیک کھانا۔ ③ سات شہروں کے علاوہ کہیں بھی جمعہ نہ ہونا۔ ④ چار گنا سایہ ہونے تک عصر کی نماز کو لیٹ کرنا۔ ⑤ کفار سے لڑائی کے دوران بھاگ جانا۔ اور اہل حجاز کے یہ پانچ اقوال قابل ترک ہیں: ① موسیقی سننا۔ ② دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کرنا۔ ③ عورتوں سے متعہ کرنا۔ ④ نقد کی صورت میں ایک درہم کے بدلے دو درہم اور ایک دینار کے بدلے دو دینار کا لین دین کرنا۔ ⑤ عورتوں سے غیر فطری مباشرت۔“

(معرفة علوم الحديث للحاكم: 65، تاريخ دمشق لابن عساكر: 59، 58/54)

لیکن اس کی سند سخت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ امام اوزاعی رحمہ اللہ کے شاگرد ابو عبد اللہ بن بحر کی توثیق نہیں مل سکی۔ غیر معتبر اور نامعلوم لوگوں کی بیان کردہ بات قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

✽ امام اوزاعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ایک قول میں متعہ کے جواز کی نسبت

اہل مکہ کی طرف کی گئی ہے۔ (تاریخ دمشق لابن عساکر 1/362)

اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس کا راوی محمد بن ادریس بن حجاج المعروف بہ ابن

ابو حمادہ ”مجہول“ ہے۔ متقدمین ائمہ محدثین میں سے کسی نے اس کی توثیق نہیں کی۔ اس میں

ایک اور علت بھی ہے۔

### متعہ اور حج تمتع؟

بعض احادیث میں حج تمتع کو بھی متعہ کہا گیا ہے۔ اس سے بھی بعض لوگ دھوکا کھا

جاتے ہیں اور ان احادیث کو نکاحِ متعہ پر دلیل بنا لیتے ہیں، جیسا کہ:

✽ مسلم القری، تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

دَخَلْنَا عَلَى أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ، فَسَأَلْنَاهَا عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ، فَقَالَتْ:

فَعَلْنَاهَا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

”ہم سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور ان سے عورتوں کے متعہ (حج) کے

بارے میں سوال کیا، تو انہوں نے فرمایا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایسا کیا

ہوا ہے۔“ (السنن الکبریٰ للنسائی: 5515، مسند أبي داود الطيالسي: 1742، وسنده حسن)

مجم کبیر طبرانی (103/24) میں صرف ”متعہ“ کے الفاظ ہیں۔

اس سے مراد حج تمتع ہے، کیونکہ اسے بھی مجازاً متعہ حج کہا جاتا ہے۔ اصل عبارت یوں

ہے: فَسَأَلْنَاهَا عَنْ مُتْعَةِ الْحَجِّ لِلنِّسَاءِ.

”ہم نے سیدہ اسماء سے عورتوں کے لیے حج تمتع کرنے کے بارے میں پوچھا۔“  
اسی پر انہوں نے بتایا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں حج تمتع کیا ہوا ہے۔  
اس بات کی وضاحت صحیح مسلم کی اس روایت سے ہوتی ہے:

❁ مسلم القری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: سَأَلْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ  
اللَّهُ عَنْهُمَا عَنْ مُتْعَةِ الْحَجِّ، فَرَخَّصَ فِيهَا، وَكَانَ ابْنُ الزُّبَيْرِ يَنْهَى عَنْهَا،  
فَقَالَ: هَذِهِ أُمُّ ابْنِ الزُّبَيْرِ تَحَدِّثُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
رَخَّصَ فِيهَا، فَادْخُلُوا عَلَيْهَا، فَاسْأَلُوهَا، قَالَ: فَدَخَلْنَا عَلَيْهَا، فَإِذَا امْرَأَةٌ  
صَخْمَةٌ عَمِيَاءُ، فَقَالَتْ: قَدْ رَخَّصَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيهَا.

”میں نے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حج تمتع کے بارے میں سوال کیا، تو انہوں  
نے اس کی رخصت دی، جبکہ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس سے منع فرماتے تھے۔ سیدنا ابن  
عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ ہی بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس  
میں رخصت دی تھی، ان کے پاس جاؤ اور پوچھ لو۔ ہم سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا کے پاس  
حاضر ہوئے، وہ نابینا اور بھاری بھر کم عورت تھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ  
نے حج تمتع کی اجازت دی تھی۔“ (صحیح مسلم: 1238)

اس کی مزید تائید صحیح بخاری (1796) اور صحیح مسلم (1237) کی ایک دوسری حدیث  
سے بھی ہوتی ہے۔ ثابت ہوا کہ حدیث میں متعہ سے مراد متعۃ الحج ہے، نہ کہ نکاحِ متعہ۔

**الحاصل:** قرآن و سنت اور اجماع امت کی رو سے نکاحِ متعہ قیامت

تک حرام کر دیا گیا ہے۔ اسلام میں اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔



## قدم بوسی کی شرعی حیثیت !

ابو عبد اللہ صارم

تعظیم کی نیت سے کسی کے پاؤں چومنا ناجائز اور غیر مشروع عمل ہے۔ بعض لوگ کچھ روایات پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ صحابہ کرام نبی اکرم ﷺ کے پاؤں مبارک چومتے تھے، لیکن ان میں سے کوئی روایت بھی پایہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ اس پر سہاگہ یہ کہ صحابہ کرام، تابعین عظام اور تبع تابعین کے تین بہترین ادوار میں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اس سلسلے میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں، ان کا مختصر تحقیقی تجزیہ پیش خدمت ہے :

**روایت نمبر ① :** سیدنا صفوان بن عسال مرادی رضی اللہ عنہ سے مروی

ہے کہ دو یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر نو آیات مینات کے متعلق سوال کیے۔ آپ ﷺ نے ان کے جوابات دے دیے، تو :

فَقَبَلَا يَدَيْهِ وَرَجَلَيْهِ . ”انہوں نے آپ ﷺ کے دونوں ہاتھوں اور

دونوں پاؤں مبارک کو بوسہ دیا۔“ (مسند الإمام أحمد : 239/4، 240، سنن الترمذی : 2733،

السنن الكبرى للنسائي : 3527، سنن ابن ماجہ : 3705، مختصراً)

اس حدیث کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں :

هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ . ”یہ حدیث صحیح ہے۔“

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ، لَا نَعْرِفُ لَهُ عِلَّةَ بَوَاجِهِ مِّنَ الْوُجُوهِ . ”یہ حدیث صحیح ہے۔ ہمیں اس میں کسی بھی قسم کی کوئی علت

معلوم نہیں ہوئی۔“ (المستدرک علی الصحیحین: 15/1)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اس بارے میں ان کی موافقت کی ہے۔

## تجزیہ :

یہ حدیث ”منکر“ ہے۔ اس کا راوی عبد اللہ بن سلمہ اگرچہ ”حسن

الحدیث“ ہے، لیکن آخری عمر میں اس کے حافظے میں خرابی پیدا ہو گئی تھی، جیسا کہ اس کے

شاگرد عمرو بن مرہ فرماتے ہیں: كَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ سَلَمَةَ قَدْ كَبِرَ، وَكَانَ

يُحَدِّثُنَا، فَنَعْرِفُ وَنُنْكِرُ. ”عبد اللہ بن سلمہ بوڑھے ہو گئے تھے۔ وہ ہمیں

حدیث بیان کرتے تو ہمیں ان سے کچھ معروف اور کچھ منکر حدیثیں ملتی۔“

(مسند علی بن الجعد: 66، العلل ومعرفة الرجال للإمام أحمد برواية عبد الله: 1824،

الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع للخطيب البغدادي: 1920، واللفظ له)

امام ابو حاتم رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تَعْرِفُ وَتُنْكِرُ.

”یہ معروف اور منکر دونوں قسم کی روایات بیان کرتا ہے۔“

(الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: 74/5)

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَلَا يَتَّبَعُ فِي حَدِيثِهِ.

”ثقہ راوی اس کی روایات کی متابعت نہیں کرتے۔“ (التاريخ الكبير: 99/5)

امام نسائی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ”منکر“ کہا ہے۔ (السنن الكبرى: 3527)

سنی مفسر، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (701-774ھ) فرماتے ہیں:

وَهُوَ حَدِيثٌ مُشْكَلٌ، وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ سَلَمَةَ فِي حِفْظِهِ شَيْءٌ، وَقَدْ

تَكَلَّمُوا فِيهِ، وَلَعَلَّهُ اشْتَبَهَ عَلَيْهِ التَّسْعُ الْآيَاتُ بِالْعَشْرِ الْكَلِمَاتِ، فَإِنَّهَا

وَصَايَا فِي التَّوْرَةِ، لَا تَعْلُقُ لَهَا بِقِيَامِ الْحُجَّةِ عَلَى فِرْعَوْنَ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ!

”اس حدیث میں اشکال ہے۔ عبد اللہ بن سلمہ کے حافظے میں کچھ خرابی تھی، محدثین کرام نے اس پر جرح بھی کی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کو نو آیات اور دس کلمات میں اشتباہ ہو گیا ہو، کیونکہ دس کلمات تو تورات میں وصیت کی صورت میں ہیں، ان کا فرعون کے خلاف دلیل بننے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔“ (تفسیر ابن کثیر: 124/5)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ عبد اللہ بن سلمہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

صَدُوْقٌ، تَغَيَّرَ حِفْظُهُ. ”یہ سچا راوی تھا، لیکن اس کے حافظے میں خرابی

واقع ہو گئی تھی۔“ (تقریب التہذیب: 3364)

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ مُحَمَّدَ بْنَ يَعْقُوبَ الْحَافِظَ، وَيَسْأَلُهُ مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدِ اللَّهِ، فَقَالَ: لِمَ تَرَكََا حَدِيثَ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ أَصْلًا، فَقَالَ: لِفَسَادِ الطَّرِيقِ إِلَيْهِ.

”میں نے امام ابو عبد اللہ محمد بن یعقوب الحافظ کو سنا، ان سے محمد بن عبید اللہ یہ سوال کر رہے تھے کہ امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے سیدنا صفوان بن عسال رحمہما اللہ کی بیان کردہ حدیث کو بالکل ہی کیوں چھوڑ دیا تھا؟ اس پر انہوں نے فرمایا: کیونکہ اس کی سند خراب تھی۔“

(المستدرک علی الصحیحین للحاکم: 15/1)

اس کے بارے میں امام حاکم رحمہ اللہ کی توجیہ صحیح نہیں۔

مذکورہ بحث کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ عبد اللہ بن سلمہ کی جس حدیث کو محدثین کرام ”منکر“ قرار دیں گے، وہ ”ضعیف“ ہوگی اور باقی ”حسن“ ہوں گی۔

**روایت نمبر ②:** صحابی رسول، زارع بن عامر رحمہ اللہ، جو وفد

عبد القیس میں شامل تھے، ان کی طرف منسوب ہے کہ:



لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ، فَجَعَلْنَا تَبَادُرُ مَنْ رَوَّاحِلِنَا، فَتَقَبَّلَ يَدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَلَهُ . ”جب ہم مدینہ منورہ پہنچے، تو ہم جلدی کرتے

ہوئے اپنے کجاووں سے نکلے اور نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں مبارک کو چومنے لگے۔“

(سنن أبی داؤد : 5225، القبل والمعانقة والمصافحة لابن الأعرابي : 41، الأدب المفرد

للبخاري : 975)

**تجزیہ :** اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس کو بیان کرنے والی راویہ ام

ابان بنت وازع کی کسی محدث نے توثیق نہیں کی، لہذا حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ کا اس کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ:

رَوَتْ --- حَدِيثًا حَسَنًا، سَأَقْتُهُ بِتَمَامِهِ وَطُولِهِ سِيَاقَةً حَسَنَةً .

”ام ابان نے --- ایک حسن حدیث روایت کی ہے۔ اس نے اس حدیث کو مکمل اور

طول کے ساتھ اچھا بیان کیا ہے۔“ (الاستيعاب في معرفة الأصحاب : 80/4)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ام ابان کو ”مجهولات“ میں شمار کیا ہے۔ (میزان الاعتدال : 611/4)

**روایت نمبر ۳ :** سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک

دیہاتی نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر کہنے لگا: اللہ کے رسول! میں یقیناً

مسلمان ہوں۔ مجھے کوئی ایسی چیز دکھائیں، جس سے میرا ایمان بڑھ جائے۔ آپ ﷺ نے

فرمایا: کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: آپ اس درخت کو بلائیں، وہ آپ ﷺ کے پاس آئے۔

آپ ﷺ نے درخت کو بلایا اور وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور سلام کہا۔ آپ ﷺ نے اسے

واپس اپنی جگہ جانے کا کہا، تو وہ چلا گیا، تب اس دیہاتی نے کہا:

إِنِّدُنْ لِي أَنْ أَقْبَلَ رَأْسَكَ وَرَجْلَيْكَ .

”مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے سر اور دونوں پاؤں مبارک کو چوموں۔“

آپ ﷺ نے اسے اجازت دی، تو اس نے ایسا کر لیا۔

(مسند الدارمی: 1472، القبل لابن الأعرابي: 42، تقبیل الید لأبی بکر بن المقری: 5،

المستدرک علی الصحیحین للحاکم: 4/172، دلائل النبوة لأبی نعیم الأصبهانی: 291)

## تجزیہ:

یہ روایت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس کا راوی صالح بن حیان

قرشی جمہور محدثین کرام کے نزدیک ”ضعیف“ ہے۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ”صحیح الاسناد“ کہا، تو اس کے رد میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ

نے فرمایا: بَلْ وَاهٍ، وَفِي إِسْنَادِهِ صَالِحُ بْنُ حَيَّانٍ مَتْرُوكٌ.

”یہ ضعیف روایت ہے، اس کی سند میں صالح بن حیان راوی متروک ہے۔“

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس راوی کو ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (تقریب التہذیب: 2851)

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے بھی ”ضعیف“ ہی کہا ہے۔

(تاریخ ابن معین بروایۃ الدارمی: ص: 134، ت: 434)

امام نسائی رحمہ اللہ اسے غیر ثقہ کہتے ہیں۔ (الضعفاء والمتروکون: 295)

امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عَامَّةٌ مَا يَرْوِيهِ غَيْرُ مَحْفُوظٍ.

”اس کی بیان کردہ اکثر روایات غیر محفوظ ہیں۔“ (الکامل فی ضعفاء الرجال: 4/55)

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں ”فیہ نظر“ فرمایا ہے۔ (التاریخ الکبیر: 4/275)

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ”لیس بالقوی“ کہا ہے۔ (الضعفاء والمتروکون: 289)

امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے بھی یہی فرمایا ہے۔ (الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: 4/398)

امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: يَرْوِي عَنِ الثَّقَاتِ أَشْيَاءَ لَا تُشَبِّهُ

حَدِيثَ الْأَنْبَاءِ، لَا يُعْجِبُنِي الْإِحْتِجَاجُ بِهِ إِذَا انْفَرَدَ.

”یہ ثقہ راویوں سے منسوب کر کے ایسی روایات نقل کرتا ہے، جو ثقہ راویوں کی احادیث سے میل نہیں کھاتیں۔ مجھے اس حدیث سے استدلال کرنا پسند نہیں، جس کے بیان کرنے میں یہ منفرد ہو۔“ (المجروحین: 369/1)

امام حربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لَهُ أَحَادِيثُ مُنْكَرَةٌ.

”اس نے منکر احادیث بیان کی ہیں۔“ (تہذیب التہذیب لابن حجر: 387/4)

امام عجل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جَائِزُ الْحَدِيثِ، يُكْتَبُ الْحَدِيثُ،

وَلَيْسَ بِالْقَوِيِّ، وَهُوَ فِي إِعْدَادِ الشُّيُوخِ.

”یہ جائز الحدیث ہے، اس کی حدیث لکھ لی جائے گی، مگر یہ قوی نہیں۔ اس کا شمار

شیوخ میں ہوتا ہے۔“ (تاریخ العجلی: 225)

حافظ بیہقی فرماتے ہیں: وَهُوَ ضَعِيفٌ، وَلَمْ يُوثِّقْ أَحَدٌ.

”یہ ضعیف راوی ہے، اسے کسی محدث نے ثقہ نہیں کہا۔“ (مجمع الزوائد: 105/1)

**روایت نمبر ۴:** سیدنا عامر بن طفیل رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے

واقعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ: أَتَى، فَقَبِلَ قَدَمَيْهِ.

”وہ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں قدموں کو چوم لیا۔“

(الرخصة في تقبيل اليد لابن المقرئ: 14، المعجم لأبي يعلى الموصلي: 89)

**تجزیہ:** اس کی سند سخت ترین ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

① ام بیثم بنت عبد الرحمن بن فضالہ، سعدیہ کے حالات زندگی نہیں مل سکے۔

②، ③ اسی طرح ابو عبد الرحمن بن فضالہ اور ابو فضالہ بن عبد اللہ وغیرہ کی بھی توثیق

درکار ہے۔



## روایت نمبر ⑤ :

ابو برہ، یسار، مولیٰ عبد اللہ بن سائب مخزومی سے مروی ہے :  
دَخَلْتُ مَعَ مَوْلَايَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ السَّائِبِ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُمْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَبَّلْتُ رَأْسَهُ وَيَدَهُ وَرِجْلَهُ.

”میں اپنے مولیٰ عبد اللہ بن سائب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں آپ ﷺ کی طرف گیا اور آپ ﷺ کا سر، ہاتھ اور پاؤں مبارک چوم لیا۔“  
(الرخصة في تقبيل اليد لابن المقري: 24)

## تجزیہ :

اس کی سند سخت ترین ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

① ابو الحسن احمد بن محمد بن عبد اللہ بن قاسم ”ضعیف“ ہے۔

اس کی بیان کردہ ایک حدیث کو ”منکر“ قرار دیتے ہوئے امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:  
ضَعِيفُ الْحَدِيثِ، وَلَكَسْتُ أَحَدْتُ عَنْهُ.

”اس کی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔ میں اس سے حدیث روایت نہیں کرتا۔“

(الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: 71/2)

امام عقیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مُنْكَرُ الْحَدِيثِ، يُوَصِّلُ الْأَحَادِيثَ.

”اس کی احادیث منکر ہیں۔ یہ احادیث میں وصل کرتا تھا۔“ (الضعفاء الكبير: 71/2)  
حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی ایک حدیث کے بارے میں لکھا ہے:

مَا هَذَا الْحَدِيثُ بِبَعِيدٍ مِنَ الْوَضْعِ.

”کوئی بعید نہیں کہ یہ حدیث گھڑنت ہی ہو۔“ (تاریخ الإسلام: 5/1096، طبعة بشار)

② احمد کے باپ محمد بن عبد اللہ بن قاسم کے حالات نہیں مل سکے۔

۳) احمد کے دادا عبداللہ بن قاسم کی توثیق نہیں ملی۔

**روایت نمبر ۶ :** مشہور مفسر، امام، اسماعیل بن عبدالرحمن بن

ابو کریم، سدی، تابعی رحمہ اللہ (م: 127ھ) سورہ مائدہ کی آیت 111 کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: میرا باپ کون ہے؟ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: فلاں۔ اس پر سیدنا عمر بن خطاب رحمہ اللہ آپ ﷺ کی طرف بڑھے اور آپ کا پاؤں مبارک چوم لیا۔ (تفسیر الطبری: 17/9، طبعة ہجر، 102/11، ح: 12801، طبعة شاکر)

**تجزیہ :** امام سدی رحمہ اللہ تابعی ہیں اور بلا واسطہ نبی اکرم ﷺ سے بیان کر رہے ہیں، لہذا یہ روایت ”مرسل“ ہے، جو کہ ”ضعیف“ حدیث کی ایک قسم ہے۔

**روایت نمبر ۷ :** صہیب مولیٰ عباس کا بیان ہے:

رَأَيْتُ عَلِيًّا يَقْبَلُ يَدَ الْعَبَّاسِ وَرِجْلَيْهِ، وَيَقُولُ: يَا عَمَّ! اَرْضَ عَنِّي .  
”میں نے دیکھا کہ سیدنا علی رحمہ اللہ سیدنا عباس رحمہ اللہ کے ہاتھ اور دونوں پاؤں کو چومتے ہوئے کہہ رہے تھے: چچا جان! مجھ سے راضی ہو جائیے۔“

(الأدب المفرد للبخاري: 976، الرخصة في تقبيل اليد لابن القري: 15، تاريخ دمشق لابن عساکر: 372/26)

**تجزیہ :** اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ صہیب مولیٰ عباس کی سوائے

ابن حبان رحمہ اللہ (الثقات: 381/4) کے کسی نے توثیق نہیں کی، لہذا یہ ”مجهول الحال“ ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَصَّيْبٌ لَا أَعْرِفُهُ .

”صہیب کو میں نہیں جانتا۔“ (سير أعلام النبلاء: 94/2)

لہذا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (تقريب التهذيب: 2955) کا اسے ”صدوق“ کہنا صحیح نہ ہوا۔



**روایت نمبر ۸ :** بیان کیا جاتا ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے امام

بخاری رحمہ اللہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا: دَعْنِي حَتَّى أَقْبَلَ رَجُلِيكَ .

”مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے دونوں پاؤں کو چوم لوں۔“

(تاریخ دمشق لابن عساکر: 68/52، التقیید لمعرفة رواة السنن والمسانید لابن نقطة: 331)

**تجزیہ :** اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ ابونصر احمد بن حسن بن احمد بن

حمویہ، وراق کے حالات زندگی نہیں مل سکے۔

اس کی ایک دوسری سند تاریخ بغداد (3/102، 103) اور تاریخ دمشق (68/52) میں آتی ہے۔ وہ بھی ”ضعیف“ ہے۔ اس کے راوی ابونصر احمد بن محمد، وراق کی توثیق نہیں مل سکی۔

### اصولِ محدثین اور بریلوی مذہب

قدم بوسی کے متعلق روایات کا محدثین کرام کے اصولوں کے مطابق جائزہ لینے کے بعد معلوم ہو گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کچھ ثابت نہیں۔ سلف صالحین سے بھی باسندِ صحیح اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ لہذا اولیاء و صالحین کے پاؤں چومنا جائز نہیں۔ اس کے باوجود بریلوی مفتی، احمد یار خان، نعیمی، گجراتی (1324-1391ھ) لکھتے ہیں:

”اولیاء اللہ کے ہاتھ پاؤں چومنا اور اس طرح ان کے بعد ان کے تبرکات بال و لباس وغیرہ کو بوسہ دینا، ان کی تعظیم کرنا مستحب ہے۔ احادیث اور عمل صحابہ کرام سے ثابت ہے، لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں۔“ (”جاء الحق“: 1/368)

اولیاء اللہ کے ہاتھ چومنا جائز ہے اور اسے بھی عبادت نہیں بنانا چاہیے۔ رہا پاؤں چومنا، تو اس کے بارے میں کچھ ثابت نہیں ہو سکا، چہ جائیکہ مستحب ہو! باقی جہاں تک تبرکات کی بات ہے، تو وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خاص ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے



راشدین جیسے کبار صحابہ کرام کی چھوڑی ہوئی چیزوں کو کسی صحابی یا تابعی نے تبرک نہیں بنایا۔ بعد کے بزرگوں کے خود ساختہ تبرکات کو چومنا کیسے جائز ہوا؟

جناب احمد یار خان، بریلوی مزید لکھتے ہیں:

”ان احادیث و محدثین و علماء کی عبارات سے ثابت ہوا کہ بزرگان کے ہاتھ پاؤں اور ان کے لباس، نعلین، بال غرضیکہ سارے تبرکات، اسی طرح کعبہ معظمہ، قرآن مجید، کتب احادیث کے اوراق کا چومنا جائز اور باعث برکت ہے، بلکہ بزرگان دین کے بال و لباس و جمع تبرکات کی تعظیم کرنا۔“ (”جاء الحق“: 399/1)

یہ سراسر غلو ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے آثار مبارکہ کے علاوہ کسی بھی ولی و صالح شخص کے آثار سے تبرک حاصل کرنا جائز نہیں، تو بوسہ دینا کیسے جائز ہوا؟ کعبہ معظمہ، قرآن مجید اور کتب احادیث کے اوراق کو چومنے پر کوئی دلیل شرعی نہیں۔ یہ غیر مشروع عمل ہے۔ اگر یہ کوئی نیک کام ہوتا، تو صحابہ و تابعین جیسے اسلاف امت اس سے کیونکر غافل رہتے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو بوسہ دیا، تو فرمایا:

وَلَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْبَلُكَ، مَا قَبَّلْتُكَ .

”اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا، تو میں تجھے بھی

بوسہ نہ دیتا۔“ (صحیح البخاری: 1597، صحیح مسلم: 1270)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کا بوسہ شریعت اسلامیہ سے ثابت نہ ہو، اس کو بوسہ دینا ناجائز اور غیر مشروع ہے۔

اسی حدیث کی شرح میں شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قَالَ شَيْخُنَا فِي شَرْحِ التِّرْمِذِيِّ: فِيهِ كَرَاهِيَةٌ تَقْبِيلِ مَا لَمْ يَرَهُ الشَّرْعُ

بِتَقْبِيلِهِ . ”ہمارے شیخ (حافظ عراقی رحمہ اللہ) جامع ترمذی کی شرح میں فرماتے

ہیں: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو بوسہ دینے کی تعلیم شریعت نے نہ دی ہو، اس کو بوسہ دینا مکروہ ہے۔“ (فتح الباری: 463/3)

جناب احمد یار خان، نعیمی مزید لکھتے ہیں: ”تمکات کا چومنا جائز ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةً﴾ یعنی اے بنی اسرائیل! تم بیت المقدس کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور کہو: ہمارے گناہ معاف ہوں۔ اس آیت سے پتہ لگا کہ بیت المقدس، جو انبیائے کرام کی آرامگاہ ہے، اس کی تعظیم اس طرح کرائی گئی کہ وہاں بنی اسرائیل کو سجدہ کرتے ہوئے جانے کا حکم دیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ متبرک مقامات پر توبہ جلد قبول ہوتی ہے۔“ (”جاء الحق“: 368/1)

یہ قرآن کریم کی معنوی تحریف اور قبروں کے بارے میں غلو پر مبنی تحریر ہے۔ یہ قبہ اور آستانے ان لوگوں کی شکم پروری کا ذریعہ ہیں، اس لیے ان پر بہت زور دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں شریعت کی حدود سے تجاوز کیا جاتا ہے۔

اس بات پر کوئی دلیل نہیں کہ جس جگہ سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہاں انبیائے کرام کی قبریں ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ تم اس شہر میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔ کسی مسلمان مفسر نے قرآن کریم کی تفسیر میں ایسی کوئی بات ذکر نہیں کی۔ اس کے برعکس مفسرین کرام نے اس سجدہ کو سجدہ شکر قرار دیا ہے۔

مشہور سنی مفسر، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (701-774ھ) فرماتے ہیں:

أَيُّ شُكْرًا لِلَّهِ تَعَالَى عَلَى مَا أَنْعَمَ بِهِ عَلَيْهِمْ مِنَ الْفَتْحِ وَالنَّصْرِ، وَرَدَّ بَلَدَهُمْ إِلَيْهِمْ، وَانْقَادَهُمْ مِنَ النَّيِّهِ وَالضَّلَالِ.

”یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا کہ اللہ نے ان کو فتح و نصرت عطا فرمائی، ان کو ان کا علاقہ واپس دے دیا اور ان کو پستی و گمراہی سے نجات دی۔“

(تفسیر ابن کثیر: 247/1، طبعہ المہدی)



اہل علم نے نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کو بوسہ دینا اور اسے مس کرنا مکروہ اور بدعت خیال کیا ہے۔ جب سے تقلید آئی ہے، بدعات کی بھرمار ہو گئی ہے۔ مقلدین کو کوئی روک ٹوک نہیں، جسے چاہیں جواز کا درجہ دے دیں اور جسے چاہیں حرام قرار دے ڈالیں، کیونکہ انہیں دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔

**زمین بوسی :** علما وعظما کے سامنے زمین کو بوسہ دینا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں لکھا ہے:

وَكَذَا مَا يَفْعَلُونَهُ مِنْ تَقْيِيلِ الْأَرْضِ بَيْنَ يَدَيِ الْعُلَمَاءِ وَالْعُظَمَاءِ فَحَرَامٌ، وَالْفَاعِلُ وَالرَّاضِي بِهِ آثِمَانِ، لِأَنَّهُ يُشَبِّهُ عِبَادَةَ الْوَتَنِ، وَهَلْ يُكْفَرَانِ؟ عَلَى وَجْهِ الْعِبَادَةِ وَالتَّعْظِيمِ كُفْرٌ، وَإِنْ عَلَى وَجْهِ التَّحِيَّةِ لَا، وَصَارَ آثِمًا مَرْتَكِبًا لِلْكَبِيرَةِ.

”اسی طرح جو علما وعظما کے سامنے زمین بوسی کا عمل کیا جاتا ہے، یہ بھی حرام ہے۔ اس کو کرنے والا اور اس پر راضی ہونے والا، دونوں گناہ گار ہیں، کیونکہ یہ بت پرستی کے مشابہ عمل ہے۔ کیا ایسا کرنے والے کو کافر کہا جائے گا؟ [اس میں تفصیل ہے]۔ اگر وہ عبادت اور تعظیم کی بنا پر ایسا کر رہا ہے، تو یہ عمل کفر ہے اور اگر بطور تحیہ ہے تو حرام نہیں، لیکن ایسا کرنے والا گناہ گار، بلکہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔“ (رد المحتار علی الدر المختار لابن عابدین: 383/6، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق للزیلعی: 25/6، مجمع الأنهر فی شرح ملتقى الأبحر لشیخی زادہ: 542/2، البناية شرح الهداية للعيني الحنفی: 198/12)

**الحاصل :** نبی اکرم ﷺ کی قدم بوسی کے بارے میں کوئی روایت ثابت

نہیں۔ صحابہ کرام، تابعین عظام اور تبع تابعین کے دور میں قدم بوسی کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ یوں قدم بوسی اور زمین بوسی ناجائز اعمال و افعال ہیں۔